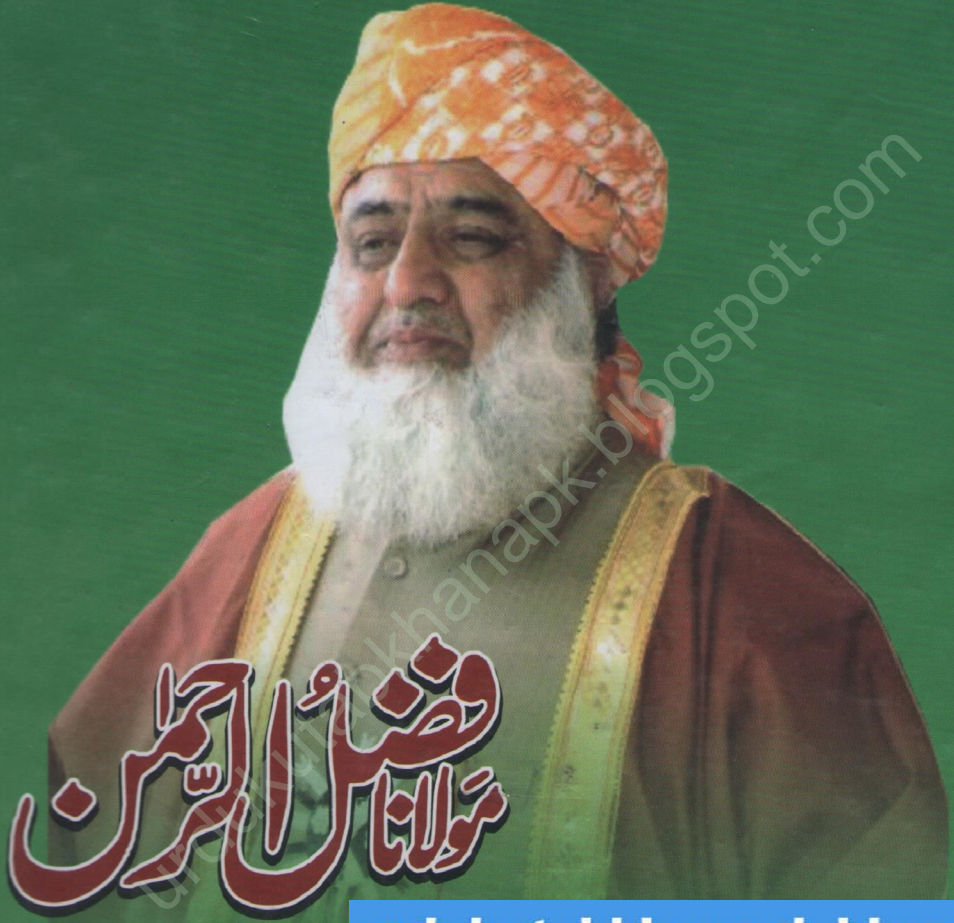


حلقہ سہریوہی کوٹس ہے تو پھر یوہی ہی  
ان کو پتھر دے، مجھے طرفِ پذیرائی دے



فضل الرحمن  
مولانا

urdukutabkhanapk.blogspot

شخصیت و سیاست

سلیم حبیب





نام کتاب: مولانا فضل الرحمن: شخصیت و سیاست

نام مصنف: انجینئر سلیم جاوید (جدہ)

تعداد صفحات: 192

قیمت: 200 روپے

ڈیزائننگ: راحت صفدر (عبداللہ گرافکس، راولپنڈی)

پرنٹر: محمود برادرز پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی

ناشر: **فاطمیہ پبلشرز**

نزد فاطمیہ گزٹرس کول اینڈ کالج، دین پور روڈ ٹانک، ڈیرہ اسماعیل خان

رابطہ نمبر: 0346-9729141 / 0966-850508

طے کا پتہ: قیصر فاروق، الجمعۃ میڈیا فاؤنڈیشن، لیاقت روڈ راولپنڈی

رابطہ نمبر: 051-5550686 / 0336-5550686



## فہرست مضامین

6

ابتدائیہ

پہلا حصہ: مولانا فضل الرحمن کی شخصیت

**باب اول:**

میڈیا اور مولانا فضل الرحمن

11

میڈیا اور سیاست دان

14

پاکستانی میڈیا کو مولانا فضل الرحمن سے خاص بغض کیوں ہے؟

15

میڈیا، ملٹری اور مولانا فضل الرحمن

18

مولانا فضل الرحمن اور صالح صحافی

19

پاکستان کا "ایکسٹو" کون ہے؟

22

**باب دوم:**

مولانا ایک لیڈر ہے

27

مولانا فضل الرحمن کی دس منفرد صفات

28

مولانا فضل الرحمن کی ذات پر اعتراضات

36

ظلمت کو ضیاء، صرصر کو صبا کیوں بولوں؟

37

ایمان والو! ایک تراژور کھا کر دو

41

چھٹتا نہیں ہے منہ پر یہ "ملا" لگا ہوا

42

کی میرے قتل کے بعد، اس نے جفا سے "سوری"

46

سیاسی حلقوں کے الزامات

46

وکی لیکس اور ہاتھ غیبی

50

بڑے لیڈروں کے چھوٹے شہر

53

مولانا نے اسلام کیلئے کیا کیا ہے؟

55

مولانا کے ناقدین کا اصل مسئلہ

58



- 60 مولانا ہارے، مخلصین کے اشکالات
- 62 مولانا فضل الرحمن، شرایوں کا حامی ہے
- 63 ریڈی میڈ مفتی.....!!!
- 64 مولانا کو کل تہمت سے بچنا چاہئے
- 65 مولانا فضل الرحمن کا کمشنر بھائی اور کارکنان جمعیت
- باب سوم: عمران خان کی شخصیت
- 67 عمران خان کا کردار
- 68 بات کو دیکھو، بات کرنے والے کو نہ دیکھو
- 69 عمران خان، ایک کٹھنور دل اور بے اصول آدمی ہے
- 70 عمران خان، دانستہ جھوٹ بولتا ہے
- 72 جامع مسجد شوکت خان مرحوم
- 73 عمران خان، منفرد سیاستدان
- 75 عمران خان اور سوشل میڈیا
- باب چہارم:
- 80 مولانا فضل الرحمن سے میرا ذاتی اختلاف
- 81 مولانا فضل الرحمن سے پہلا علانیہ اختلاف
- 84 مولانا فضل الرحمن سے دوسرا علانیہ اختلاف

### دوسرا حصہ: جمعیت علماء اسلام کی سیاست

- 88 باب اول: پارلیمانی جمہوریت کا دینی زائے سے تجزیہ
- 88 خلافت و جمہوریت
- 92 پارلیمانی نظام کے بارے میں چار غلط فہمیاں
- باب دوم: سیکولرزم کیا ہے؟
- 96 فرہنگ ”سیلیسی“
- 99 سیکولرزم بھوکریسی کی ضد ہے



## باب سوم:

- 101 دینی سیاسی جماعت کا مطلب کیا ہے؟  
 104 ایک سیکولر کم علم ہو سکتا ہے پر منافق نہیں  
 110 جمعیۃ علماء اسلام ایک سیکولر دینی جمہوری جماعت ہے  
 112 کیا آپ نظریاتی جمہوری جماعتوں کی جدوجہد سمجھتے ہیں؟

## باب چہارم:

- 115 جمعیۃ علماء اسلام کی سیاست  
 118 جمعیۃ علماء اسلام کی سیاسی پالیسیاں  
 119 اداکارہ ایان علی اور فقہ اسلامی  
 124 مولویوں کا ڈالری جہاد  
 123 طالبان کی حمایت  
 128 سانحہ لال مسجد  
 129 پانامہ لیکس پر نواز شریف کا ساتھ دینا  
 130 رقم بڑھاؤ نواز شریف، ہم تمہارے ساتھ ہیں  
 134 کیا اب لیکس کی بنیاد پر حکومتیں گرائی جائیں گی؟  
 140 جماعت اسلامی اور پانامہ لیکس اتحاد  
 142 گھریلو تشدد بل کی مخالفت کیوں؟  
 143 کشمیر کمیٹی کی ناقص کارکردگی  
 148 لیپیا حکومت سے تعلقات  
 153 اہل تشیع کا ساتھ دینا  
 155 تیسرا حصہ: وراثتی قیادت، دھاندلی اور احتساب  
 164 احتساب نہیں، سد باب کیجئے، حضور!  
 171 چوتھا حصہ: ذاتی تاثرات  
 186 دیکھا جو تیر کھا کے کیس گاہ کی طرف



## ابتدائیہ

محترم قارئین - السلام علیکم وبعد دعائے صحت و عافیت  
 کہا جاتا ہے کہ کسی زندہ شخصیت بارے کتاب نہیں لکھنا چاہیے کیونکہ آدمی کے بدلنے نہ بدلنے کی کوئی  
 گارنٹی نہیں ہوا کرتی (نہ مصنف کی اور نہ اس کے مدوح کی) تاہم کچھ وجوہات ہیں، جن کا احساس آپ کو  
 یہ کتاب پڑھ کر ہوگا، راقم نے مولانا فضل الرحمن کی شخصیت کو موضوع بنایا ہے، جسے آج کی تاریخ تک کا  
 احساس سمجھ لیجئے اس لئے کہ "نہ بدلنے والا کلام" صرف خدا کی ذات کا ہے۔  
 کچھ اپنے بارے میں:

میرا خیال ہے، کسی کتاب کو پڑھنے سے قبل، اس کے مصنف کے مزاج اور عقیدہ سے آشنائی بے حد  
 ضروری ہوتی ہے۔

یہ کتاب پڑھتے ہوئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ:

مصنف، علما کا قدردان ضرور ہے مگر اس کا مدارس اسلامیہ یا علماء سے کوئی خاندانی یا نسبی تعلق نہیں  
 ہے۔ اس لئے مصنف کا فہم دین، بعض علماء کی صحبت یا ذاتی مطالعہ کی بناء پر ہے۔ اپنے فہم دین کے درست  
 ہونے پر ہرگز اصرار نہیں ہے۔

مصنف خود کو تاریخ و سیاست کا سنجیدہ طالب علم سمجھتا ہے اور اپنے اس مطالعہ کی بنیاد پر، پاکستان کی سیاسی  
 تاریخ میں جمیعت علماء اسلام کا ایک بڑا ہی فیصلہ کن اور مثبت کردار محسوس کرتا ہے۔ اپنی اس علمی نتیجہ خیزی اور  
 سیاسی تاثر پر ہرگز اصرار نہیں ہے۔

مصنف کو مولانا فضل الرحمن کی شخصیت و سیاست سے عرصہ 35 سال سے مستقل ربط ہے مگر مولانا  
 سے کوئی ذاتی یا جماعتی تعلق نہیں ہے، اس لئے مولانا کی اندرون خانہ سیاسی پالیسی سے واقف نہیں  
 ہے۔ زیر نظر تجزیہ، ایک عام پاکستانی کا ایسا بے لاگ تجزیہ ہے جس کی بنیاد کسی دانستہ غلط بیانی پہ ہرگز نہیں  
 ہے، اپنے تجزیے کے درست ہونے پر ہرگز اصرار نہیں ہے۔

مصنف کی عملی دینی سرگرمیاں صرف تبلیغی محنت تک محدود ہیں، مگر مصنف بنیادی طور پر سیکولر نظریات کا  
 حامی ہے اور سیکولرزم کو دین کا لازمی حصہ سمجھتا ہے اور اپنے اس موقف کو دلیل سے واضح کرنے کی کوشش کی  
 ہے، تاہم اپنی دلیل کے درست ہونے پر ہرگز اصرار نہیں ہے۔

مصنف، علمائے دیوبند کی سیاسی سٹرٹیجی کا پر زور حامی ہے۔ اس لئے کہ اس کو جمہوری اور سیکولر اصولوں



کے مطابق سمجھتا ہے۔

مصنف نے جمعیت علماء کو سیکولرزم کے آئینے میں دیکھا ہے تو اس کی حمایت کا فیصلہ کیا ہے۔ اپنے اس زاویہ نظر کے درست ہونے پر ہرگز اصرار نہیں۔ مگر اس خاص پہلو کے علاوہ، جمعیت علمائے اسلام سے کوئی دوسری وجہ محبت نہیں ہے۔

اس کتاب کی وجہ تصنیف:

مصنف سمجھتا ہے کہ مکتب دیوبند کی سیاسی جدوجہد کی اساس، اس مجبور انسانیت کو پر امن طور پر معاش افزو دگی عطا کرنا ہے جو جاہر بالا دست طبقات کے ہاتھوں پسپی ہوئی ہے اور اسی کا زکی خاطر، وہ ہر زمانے کے سامراج سے ٹکرائے ہیں (بلکہ صرف وہی ٹکرائے ہیں) بالا دست طبقات کے زیر اثر میڈیا، نہ صرف علمائے دیوبند کی خدمات کو سامنے نہیں آنے دیا کرتا بلکہ ان کی کردار کشی میں ہر اول دستے کا کردار ادا کرتا رہتا ہے۔

علمائے دیوبند کی اسی کردار کشی کو ہدف بنا کر، جمعیت علماء اسلام کے موجودہ امیر مولانا فضل الرحمن کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے۔

چاہیے تھا کہ قوم میں شخصیات کی بجائے نظریات پہ بحث ہوا کرتی، سیاسی منشور و اہداف پہ بات ہوا کرتی چونکہ ابھی پاکستانی جمہوریت پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہی ہے اور سیاسی جماعتیں، اپنے لیڈروں کے شخص کردار سے مستغنی نہیں ہو سکتیں، پس فی الوقت، جمعیت علماء اسلام بھی گویا مولانا فضل الرحمن کا نام ہے۔ مولانا کی کردار کشی، جمعیت علماء کی کردار کشی ہے اور مولانا کا دفاع، جمعیت علماء کا دفاع ہے۔

مصنف سمجھتا ہے کہ جمعیت علماء اسلام مولانا فضل الرحمن کی ذاتی سیاسی جماعت نہیں ہے بلکہ علمائے دیوبند کا صد سالہ سیاسی ورثہ ہے جس سے جمیع علمائے دیوبند کی عزت وابستہ ہے۔ پس مولانا کی کردار کشی مہم کی آخری منزل، جمیع علمائے دیوبند کو کرپٹ ثابت کرنا اور پھر اس کی آڑ میں، دین اسلام کی اصل پہ حملہ کرنا ہے۔

بایں وجہ مصنف مولانا فضل الرحمن کا دفاع کرنا، ان کی شخصیت کے واسطے نہیں بلکہ جمیع علمائے دیوبند کی عزت کے واسطے ضروری سمجھتا ہے۔

علاوہ ازیں، مصنف سمجھتا ہے کہ پاکستان جیسے ملک کیلئے سیکولرزم، یعنی ”جیو اور جینے دو“ کی پالیسی ہی بہترین ہے۔ جمعیت علمائے اسلام وہ سیاسی پارٹی ہے جو اپنا موقف، پارلیمنٹ کے سامنے رکھ کر دیمل سے بات منوانا چاہتی ہے اور بزور طاقت اپنی بات نہیں منوانا چاہتی۔ پس ایک مانیڈیٹ (مزاج) مولانا فضل



الرحمن کا ہے اور دوسرا، ملا فضل اللہ کا۔

اس کتاب کے لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ مولانا فضل الرحمن کوڑی گریڈ (تحقیر) کر کے، ان کو دیوار سے لگانے کا بالواسطہ مطلب، پاکستان کو شدت پسند ذہنیت کے ہاتھوں پر غلام بنانا ہے۔ شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

اس کتاب پہ تنقید کرنے کا حق سب کو حاصل ہے:

یہ کتاب میں نے مولانا کی تائید میں اس لئے نہیں لکھی کہ لوگ مولانا کی جماعت میں شامل ہو جائیں یا مولانا کے ہاتھ پہ بیعت کر لیں بلکہ صرف اہتمام حجت کیلئے لکھی ہے۔ یہ تو خدا کی منشا ہی نہیں کہ ساری دنیا، ایک مزاج پہ آجائے۔ ورنہ سلیم جاوید کے دلائل کی کیا وقعت؟ جب خود خدا کے دلائل، اس کے پاک نبی ﷺ کی زبان سے سن کر بھی بعض لوگوں کے دل نہیں بد لے۔

اس کتاب میں مولانا فضل الرحمن کے ساتھ جا بجا، عمران خان کا تذکرہ ملے گا کیونکہ مولانا پر الزامات کی بارش، ان ہی کی جماعت کی طرف سے ہوتی ہے۔ عمران خان اپنے متعلق اکثر کہتے ہیں کہ اگر میں غلط ہوں تو حکومت نواز شریف کی ہے، اس کا فرض ہے مجھے گرفتار کرے۔ یہی بات ان کو کہی جاسکتی ہے کہ پختونخواہ میں حکومت آپ کی ہے، آپ مولانا کو غلط سمجھتے ہو، تو پکڑو۔ مگر عمران، نواز نور اگشتی کو ایک طرف رکھ کر، ہم دلائل پہ بات کریں گے۔

میری پوری کوشش ہوگی کہ مولانا کو بالکل معصوم اور عمران خان کو کامل برائی ثابت کروں۔ خدا نہ کرے کہ عمران خان برا آدمی ہو، نہ یہ میری چاہت ہے اور نہ ہی اس میں میرا کوئی مفاد ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ مولانا صاحب، معصوم عن الخطا ہو مگر چونکہ کتاب کا مقدمہ، اس کا تقاضا کرتا ہے تو دلائل و منطق سے اپنا موقف پیش کروں گا، آپ ضرور داد دیں گے کہ مصنف نے اپنے تجزیے میں دانستہ کسی جھوٹ کا سہارا نہیں لیا۔

تجزیہ کیا ہوتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے تجزیہ، فرضی تخیلات پہ نہیں بلکہ اصل واقعات پہ مبنی ہوا کرتا ہے۔

دلائل ہمیشہ واقعات سے اخذ کئے جاتے ہیں، واقعہ ایک ہی ہوتا ہے، البتہ اسے تخریق و تاثر (جسے تجزیہ کہتے ہیں) وہ ہر شخص کے اپنے مزاج اور عقیدہ کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً ’واقعہ یہ ہے کہ عمران خان سے دو بیویاں طلاق لے چکی ہیں۔ اس واقعہ سے اخذ کردہ، ایک تجزیہ یہ ہے کہ یہ آدمی گھر چلانے کے قابل بھی نہیں ہے، لیکن دوسرا تجزیہ یہ ہے کہ عمران خان ایک سٹریٹ فارورڈ آدمی ہے، یہ دونوں تجزیے ایک دوسرے کی ضد سہی مگر اصل واقعہ اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔



میں نے مولانا فضل الرحمن کے حق میں جتنے دلائل دیئے ہیں، وہ تخیلات سے نہیں بلکہ واقعات سے اخذ کئے ہیں۔ اس کتاب کے ناقدین، دلائل کو غلط ثابت کرنے سے پہلے یہ ثابت کریں کہ کیا درج کردہ واقعہ غلط ہے؟ اگر واقعہ غلط نہیں، تو پھر اسی واقعہ کی بناء پر ہر کسی کو اپنا اپنا تجزیہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ تاہم تنقید کرتے ہوئے ایسا رویہ کہ موضوع کچھ اور چل رہا ہو اور اس پہ تبصرہ، کسی اور موضوع کو لے کر کیا جا رہا ہو تو ایسے رویے کو تو عمران خان جیسا آدمی بھی برداشت نہیں کرتا۔ یادش بخیر! پشاور میں عمران خان کی پریس کانفرنس میں کسی صحافی نے ریحام خان کی طلاق بارے پوچھا، تو عمران خان کس قدر آپے سے باہر ہو گیا تھا؟ صحافی کا سوال غلط نہیں تھا مگر اس پریس کانفرنس کے موضوع سے باہر تھا۔

### اس کتاب کا اسلوب:

پاکستان کے ایک معروف سیکورٹکھاری ہیں، جن کی زیر ادارت ایک آن لائن اخبار شائع ہوتا ہے۔ مصنف بھی اس سائٹ کے مستقل لکھاریوں میں شامل ہے اور دیگر موضوعات کے علاوہ جمعیت علماء اسلام اور مولانا فضل الرحمن بارے گاہے بگاہے لکھتا رہا ہے۔ مختلف مواقع پر پبلش ہوئے، ایسے مضامین کو معمولی نظر ثانی کے بعد بعینہ شامل کر دیا گیا ہے تاکہ مضمون کی وہ کیفیت برقرار رہے۔ یوں کتاب گویا، الگ الگ عنوانات کے تحت کئی مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔

اس کتاب میں آپ کو عمران خان کا تذکرہ کثرت سے ملے گا۔ مصنف کو یقین ہے کہ اصغر خان کی طرح چند سال بعد سیاست میں عمران خان ایک قصہ پارینہ بن جائے گا اور اس وقت یہ کتاب پڑھنے والے اس پہ حیرت کا اظہار کریں گے کہ اس آدمی کا تذکرہ کیوں ضروری تھا؟ تاہم فی الوقت پاکستانی میڈیا، عمران خان اور ان کے سپانسرز کے کنٹرول میں ہے اور عمران خان ہی، مولانا کی کردار کشی کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہے تو اس آدمی کا تذکرہ بھی بوجہ ضروری ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں آپ کو تبلیغی جماعت کا تذکرہ بھی ملے گا اگرچہ وہ سرے سے غیر سیاسی جماعت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جمعیت علماء اسلام، بہر حال ایک دینی جماعت ہے اور اگرچہ اس کا میدان تعلیم، تبلیغ، تزکیہ، جہاد یا مناظرہ سے مختلف ہے (اہل علم اس نکتہ کو خوب سمجھتے ہیں) تاہم عوام الناس کا دین سے رابطہ زیادہ تر تبلیغی جماعت کی وجہ سے ہوا ہے اور عوام دیگر دینی جماعتوں کو تبلیغی جماعت کے تناظر میں ہی دیکھتے ہیں۔ پس کتاب میں تبلیغی جماعت کا حوالہ بھی، بوجہ آپ کو ملے گا۔

راقم نے کوشش کی ہے کہ فردی خبریں جن کا کوئی معروف گواہ نہیں ہوتا، ان کے بیان سے گریز کروں،



تاہم چند ایک فردی واقعات ضرور ذکر کئے ہیں۔ آپ میرے ذاتی بیان کردہ واقعات کو غلط قرار دے دیں تو بھی کتاب کے نفس مضمون اور مصنف کی صحت پر اثر نہیں پڑے گا۔ ذاتی واردات کا بیان میرا حق ہے اور اس کا ثبوت بھی ذاتی حیثیت میں دینے کا پابند ہوں۔

اس کتاب سے چونکہ مولانا فضل الرحمن کی وکالت مراد ہے تو عام اسلوب میں اسے متوازن تجزیہ نہیں کہا جاسکتا۔ صاف ظاہر ہے کہ مصنف نے اپنے موکل کا ہر صورت دفاع کرنا ہوگا، تاہم اگر ایک منصف مزاج قاری، بغیر تعصب کے اس کتاب کو پڑھے گا تو اس کا ضمیر یہ شہادت ضرور دے گا کہ یہ کتاب کسی اندھے مقلد کی لکھی ہوئی بہر حال نہیں ہے۔

اب آپ اس دعا کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کریں کہ:

اے اللہ! ہم کو حق کا حق ہونا دکھا، حق پہ چلنے والا بنا اور باطل کا باطل ہونا دکھا اور اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرما۔ آمین یا رب العالمین۔



اردو کتب خانہ

URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

## پہلا حصہ: مولانا فضل الرحمن صاحب کی شخصیت

### باب اول: میڈیا اور مولانا فضل الرحمن

#### میڈیا کی حقیقت:

کمرشل میڈیا کا کاربار، انواہوں، بہتان تراشی، فحاشی اور فتنہ انگیزی سے وابستہ ہے جبکہ دینی جماعتیں چاہے ظاہر اسہی، مگر انہی چیزوں سے منع کرتی ہیں پس میڈیا اور دینی قوتیں دراصل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ علماء کے اثر و رسوخ کا مطلب، میڈیا کی موت ہے۔ اس لئے میڈیا علماء کو عوام میں بدنام کرنے بالخصوص علمائے دیوبند کی کردار کشی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ کیونکہ یہاں سامراج اور میڈیا دونوں کا مفاد ایک ہو جاتا ہے۔

تاریخ کا معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ آج ہمارے ملک کے نام نہاد معززین کے اسلاف جب انگریز سامراج کی چاکری کر رہے تھے تو اس وقت علمائے دیوبند نے تحریک ریشمی رومال برپا کر کے استعمار کے پاؤں اکھاڑ دئے تھے۔ مگر اپنے زمانے کی عظیم ترین بین الاقوامی تحریک کا میڈیا میں تو کچا، ہماری درسی کتب میں بھی تذکرہ نہیں ہے کہ مبادا عوام میں علماء کا احترام بڑھ جائے۔

میں واضح کرتا چلوں کہ اگرچہ جماعت اسلامی نے پاکستانی میڈیا میں کافی حد تک اپنے نظریاتی لوگ ذخیل کئے تھے مگر میڈیا کے خیر میں کوئی دینی جماعت فٹ نہیں بیٹھ سکتی (چاہے وہ جماعت اسلامی ہی کیوں نہ ہو) مزید یہ کہ میڈیا میں جماعت اسلامی کے رسوخ کا مطلب کیا ہے؟ یعنی علمائے دیوبند کی مزید کردار کشی (یہ ایک الگ موضوع ہے)

چونکہ میڈیا نے شروع دن سے علمائے دیوبند کو بالخصوص اپنا ہدف بنا رکھا ہے تو عوام کیلئے میڈیا کے اصل کردار کی جانکاری بہت ضروری ہے۔

قارئین کرام! یہ بات سنت الہی کے خلاف ہے کہ مختلف طبقات (اور ان میں موجود افراد) سب کے سب برے یا سب کے سب اچھے ہو جائیں۔ مثلاً یہ نہیں ہو سکتا کہ ساری سیاسی جماعتیں، فراڈ ہوں یا سب ہی عوام کی غنوار ہوں۔ اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی اچھے مجموعے میں شامل، سب افراد ہی ہر لحاظ سے اچھے ہوں یا کسی برے گروہ کے ارکان، سب کے سب برے ہوں۔



یہ نہیں ہو سکتا کہ سبھی سیاسی جماعتیں یا سیاسی لیڈر، شیطان ہوں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ مفتی محمود یا نوازہ نصر اللہ جیسے لوگ اب سیاست میں کہاں؟ تو اس کا مطلب ہے کہ سیاسی راہنماؤں میں بھی حق پرست لوگ ہوا کرتے ہیں اور ہر زمانے میں اچھا طبقہ ضرور رہے گا۔

میرے فہم کے مطابق، پاکستانی سیاست میں، جمعیت علماء اسلام ہی بہترین جماعت ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے خیال کوئی اور پارٹی بہترین ہو۔ میں اپنا مقدمہ، منطق اور دلیل کے سہارے پیش کرتا ہوں جسے بے تعصب ہو کر پرکھنا، قاری کے ضمیر پر منحصر ہے۔

سیاست اور دوسرے شعبوں کی طرح میڈیا کے بھی سبھی لوگ، بکاؤ اور بے شعور نہیں ہو سکتے اور نہ ہی سارے لوگ، بے لاگ اور دانشور ہو سکتے ہیں۔، استثناء کا قانون ہر جگہ رہے گا۔ مگر چونکہ میڈیا کا دھندہ، فی الاصل گندہ ہے (جیسے فلم انڈسٹری) تو یہاں بکاؤ مال کثرت سے دستیاب ہوتا ہے۔ ”مہذب“ سامراج اور ”جدید تعلیم یافتہ“ مافیائے یونہی تو اسے ریاست کا چوتھا ستون قرار نہیں دیا ہے۔

دکھ کی بات یہ کہ میڈیا کے نام نہاد دانشور، جن کو لفظوں سے کھینا آتا ہے، وہ معصوم ذہنوں کو خراب کرتے ہیں جو قتل سے زیادہ بڑا جرم ہے (قتل، قتل سے اشد چیز ہے) مگر ان کو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہے کہ اظہار رائے کی (مخصوص قسم کی) آزادی کو سول سوسائٹی میں تقدس حاصل ہے۔

میڈیا کے اکثر لکھاری، ذہین اور چالاک لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی شیطانی ذہانت، چند مادی فوائد کے عوض رہن رکھی ہوتی ہے، پس عام آدمی میڈیا کے باریک جال کو نہیں دیکھ سکتا۔

اس فکری دہشت گردی کا ایک نمونہ دکھانے، ڈاکٹر شاہد مسعود صاحب کے ایک کالم کا حوالہ دوں گا بظاہر ایک بے ضرر اور ہمدردانہ کالم جو دراصل مدارس اسلامیہ کی بیخ کنی کیلئے لکھا گیا ہے۔ اس پہ غور کیجئے گا، مجھے ڈاکٹر صاحب سے کوئی ذاتی پر خاش نہیں ہے لیکن یہ ثابت کرنے کیلئے کہ پاکستانی میڈیا، ایک دجالی فتنہ ہے، میں نے دیگ کا ایک دانہ چنا ہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب، پرویز مشرف دور میں ڈاکٹر شاہد مسعود، ٹی وی چینلز کا دولہا تھا، جس کی حق گوئی پہ خلقت فدا تھی۔ (بعد میں موصوف کو زرداری نے آٹھ لاکھ ماہانہ تنخواہ پر پی ٹی وی کا سربراہ بنا کر خود کو محفوظ کر لیا تھا۔)

## آدم برسر مطلب!

لال مسجد کا سانحہ ہو گیا اور میڈیا کوڑے کے ڈھیروں میں معصوم بچیوں کی کٹی انگلیوں کی خبریں دیکر



ہمارے زعموں پہ نمک چھڑک رہا تھا۔ اس دوران ڈاکٹر شاہد مسعود نے جولائی 2007ء کو ایک دردناک کالم لکھا بعنوان ”کون تھیں، کہاں چلی گئیں“۔ آج بھی اس کالم کو پڑھ کر آپ آنسو نہیں روک سکتے۔ لب لباب اس کالم کا یہ تھا کہ ایک بچی نے ان سے فون نمبر مانگا، جس کے بعد اس کی باجی (عائشہ) موصوف کو قرآن وحدیث کے میسج کرتی تھی، یہ چونکہ مصروف صحافی تھے، پس یہ میسج ڈیلیٹ کرتے جاتے حتیٰ کہ سانحہ لال مسجد کی رات بمباری ہوئی تو چھوٹی اسماء نے مرنے سے پہلے ان کو آخری فون کیا کہ باجی مر چکی ہیں اور مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، وغیرہ۔

یہ بہت ہی دلہوز کہانی ہے، جس کو پڑھ کر ہر صاحب ایمان کا خون کھولنے لگا تھا۔ وقت نے ثابت کیا کہ ساری کہانی محض افسانہ تھی، جس سے قوم کو بیجان میں مبتلا کیا گیا۔ مگر اس ساری لفاظی کے پیچھے دو بھیانک مقاصد کارفرما تھے، جیسا کہ بعض اندرون خانہ واقف کاروں سے پتہ چلا، سوائے غازی رشید صاحب کی والدہ کے، کوئی عورت یا بچی مقتولین میں شامل نہ تھی (اس وقت تک یہ بات نہ کھلی تھی) مگر پرویز مشرف کا اصل ایجنڈا یہی تھا کہ اس واقعے پر مدارس کے طلباء کو مشتعل کیا جائے تاکہ وہ سڑکوں پہ نکل آئیں، کچھ مارے جائیں، کچھ اندر ہو جائیں اور یوں مدارس کا کنٹرول ہاتھ میں لے لیا جائے۔ بعد میں چاہے عالمی عدالت سے تحقیقات کرائی جاتیں تو بچیوں کا قتل عام، نرا جھوٹ ثابت ہوتا اور یوں، الٹا مولویوں کو ہی شریک ثبوت کیا جاتا۔

چنانچہ پرویز مشرف کو خوب علم تھا کہ لال مسجد سانحہ میں بچیاں نہیں ماری گئیں مگر اسی شام ٹی وی پر آ کر اس نے المیہ اداکاری کرتے ہوئے اس سانحے پر افسوس کا اظہار کیا۔ بالفاظ دیگر وہ ان خبروں کو کنفرم کر رہا تھا جو اسی کی ڈائریکشن میں ”آزاد“ میڈیا چلا رہا تھا جس میں بچیوں کی جلی لاشوں سے نکٹن برآمد ہو رہے تھے، ڈاکٹر شاہد مسعود کا رلا دینے والا کالم، اسی مہم کا حصہ تھا۔

اس سے زیادہ خطرناک بات جو اس کالم میں بین السطور تصنیف فرمائی گئی، وہ بچی کی باجی کی کہانی تھی جو موصوف کو میسج کرتی رہتی تھی۔ یعنی اس کالم کو بعد میں عنوان بنا کر کسی ٹاک شو میں یہ تبصرہ کیا جاتا کہ اسلامی مدرسہ کی نوجوان بچیاں، غیر محرموں کو میسج کیوں کرتی رہتی تھیں؟ اور شاید ڈاکٹر موصوف، اس پہ معنی خیز مسکراہٹ لاتے ہوئے فرماتے کہ اچھا ہوا کہ میں نے میسج ڈیلیٹ کر دیے کیونکہ لڑکیاں بیوقوف ہوتی ہیں۔

اس ساری چال کو اکابر علمائے دیوبند نے خوب سمجھ لیا تھا اور باہمی مشورے سے ناکام بنا دیا۔ مگر عرض یہ ہے اس سانحے کو سات سال گزر گئے۔ واضح ہو گیا کہ دو ہزار بچیوں کے قتل عام کے نوے، فقط فرضی افسانے تھے۔ اب وہ ٹی وی اسکرین حضرات جو عوامی لیڈروں پر تھانیداروں کی طرح جرح کرتے



ہیں، کیا وہ اپنے ”پیشہ ور“ بھائی کو بلا کر پوچھیں گے کہ تم نے کس بنا پر یہ افسانہ گھڑ کر قوم کو بھجان میں مبتلا کیا؟ کبھی نہیں، کیونکہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں کہ دجال کی دو نشانیاں بتائی گئی ہیں، ایک یہ کہ وہ جنت کو دوزخ اور دوزخ کو جنت بنا کر پیش کرے گا۔ دوسرے وہ کاٹنا ہوگا یعنی ایک آنکھ والا۔ میڈیا کی چمکتی سکرین کو میں ایک آنکھ سے تشبیہ دیتا ہوں، باقی آپ خود سوچ لیں..... مضمون ختم ہوا۔

مذکورہ بالا مضمون اگر چہ لال مسجد سانحہ بارے ہے مگر آپ اس سے میڈیا کی دجالی چالوں کا اندازہ لگائیں

### میڈیا اور سیاستدان

خلاق فطرت نے دنیا کا نظام چلانے، انسانی عقل میں مختلف شعبہ جات کی سوچ بوجھ رکھ دی ہے، ان مختلف شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے مختلف طبائع کے افراد کو نظم اجتماعی میں چلانے والا طبقہ سیاستدان کہلاتا ہے۔ آج کل پاکستان میں سیاست اور سیاستدان بہت بدنام ہو چکے ہیں، جس کی ایک وجہ ان کے اپنے کروتات ہیں مگر زیادہ تر باروں کی مہربانی ہے۔ حالانکہ سیاست قوموں کی زندگی میں ایک بہت اہم شعبہ ہے۔ کسی ملک میں مقدس سمجھے جانے والے شعبہ جات بھی سیاسی استحکام کے بغیر نہیں پنپ سکتے چاہے تعلیم ہو، طب ہو، یا دین و مذہب کا شعبہ ہو، اسلئے کہ ہر شعبہ زندگی کا ایک ہدف ہوا کرتا ہے۔ سیاست کا ہدف معاشرے کو امن اور معیشت کو ترقی دینا ہے، جس کی غیر موجودگی میں کوئی قوم پھل پھول نہیں سکتی۔ اور یہ بھی جانا چاہئے کہ جس طرح بزنس مین، ٹیکنیکل لوگ اور ادیب و شاعر وغیرہ، زبردستی نہیں بنائے جاسکتے بلکہ پیدا انہی ہوا کرتے ہیں، ایسے ہی ایک سیاسی کارکن بھی پیدا انہی ہوا کرتا ہے۔ گاؤں گوشوں، محلے بستی اور ہمارے اپنے حلقہ احباب میں کوئی نہ کوئی ایسا آدمی ضرور ہوتا ہے جو ہر ایک کے کام آنے کو تیار ہوتا ہے، یہ اس کی فطرت میں ڈال دیا گیا ہوتا ہے کہ وہ سب کے لئے سوچتا ہے۔ اگر یہ جذبہ خالص دوسروں کی فلاح کے لئے ہو تو پیغمبرانہ سوچ ہے۔

پس میرے نزدیک، ایک سیاسی کارکن چاہے وہ کسی بھی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو، اس عابدو زاہد سے کہیں افضل ہے جو اپنی ذات کے دائرے سے باہر نہیں جھانکتا۔ رہی کسی کی نیت، تو اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ کہاں تک ایسی مثالیں دوں کہ مولانا کے اہم بیانات کو جگہ نہیں دی جاتی، یا بالکل توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے، صرف ایک حوالے پر اکتفا کرتا ہوں۔ الیکشن 2013ء کا زمانہ ہے، ان الیکشن کے ہنگام، دہشت گردی کے پیش نظر پیپلز پارٹی، نون لیگ، اے این پی وغیرہ جماعتوں کو اپنی الیکشن



مہم سے روک دیا گیا تھا۔ البتہ عمران خان کو ہر طرح آزادی میسر کی گئی تھی) (یہ ثابت کرنے کے وہی ایک نڈر لیڈر ہے)

جمعیت علماء اسلام ایجنسیوں کی ایسی وارننگ کا مقصد خوب سمجھتی ہے۔ پس مولانا پہ تین خود کش حملے ہونے کے باوجود، جمعیت اپنی شان سے انتخابی جلسے کرتی ہے اور عمران خان سے زیادہ بڑے جلسے ہوتے ہیں لیکن میڈیا صرف ایک پارٹی کے لئے وقف ہے۔ پرائم ٹائم ٹاک شوز اسی کے ہو رہے، اشتہارات اسی کے چل رہے۔

چلیں، اس رویے کو تو آپ میڈیا مالکان کی مرضی کہہ سکتے ہیں، مگر 12 مئی کو جب ایکشن کارزلٹ آتا ہے تو پورے پاکستان میں صرف دو لیڈر ایسے ہیں جو بیک وقت تین قومی اسمبلی کی سیٹوں سے جیتے ہیں، ایک عمران خان اور دوسرا مولانا فضل الرحمن۔

اب پروفیشنل ازم کا تقاضا تھا کہ دونوں لیڈروں کی برابر کی خبر لگتی یا انیس بیس کا فرق ہوتا۔ آپ 13 مئی کے سب اخبارات دیکھ لیں، شہہ سرخیوں میں خبر ہے کہ عمران خان تینوں سیٹوں سے جیت گئے لیکن مولانا کی ایک کالمی، دواغ کی خبر ایکسپریس اخبار میں لگی ہے۔

کیا یہ پروفیشنل اسلوب ہے؟ کیا اس سے میڈیا کا تعصب واضح نہیں ہوتا؟ کلاس کے دو طالب علموں میں سے ایک کو استاد ترجیح دیتا ہے تو اسے ذاتی پسند کہا جاسکتا ہے لیکن نتیجہ میں اگر دونوں برابر نمبر لیکر پہلی پوزیشن لیتے ہیں تو کم از کم گزٹ میں ان کے نام ساتھ ساتھ ہونے چاہئیں۔

### پاکستانی میڈیا کو مولانا فضل الرحمن سے خاص بغض کیوں ہے؟

اس کی وجہ اسٹبلشمنٹ ہے۔ ہر محکمے کی طرح، فوج میں بھی "دونمبر" لوگ ہوتے ہیں، مگر کرپٹ لوگوں سے زیادہ بڑی مصیبت، کم فہم لوگ ہوا کرتے ہیں۔ چاہے دیانتدار ہی کیوں نہ ہوں۔ محاورہ مشہور ہے کہ نادان دوست سے دانادشمن بہتر ہے، ہم انہی نادان دوستوں کو اسٹبلشمنٹ کہتے ہیں۔

اگرچہ جمعیت علماء اسلام اعتدال کی سیاست کرتی ہے لیکن چونکہ مولانا کی سیاست کی اساس جمہوریت ہے اور وہ ہر ادارے کو پارلیمنٹ کو جوابدہ دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی کی کوشش اور جدوجہد کرتے ہیں۔ دوسری طرف فوج کے بعض عناصر جن کو گھٹی میں "بلڈی سیولین" پڑھایا گیا، وہ ایک سول حکومت کو جوابدہی کرنا، اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں، لہذا مولانا فضل الرحمن ان کو فوج کا دشمن نظر آتا ہے۔

پھر یوں بھی ہے کہ گاہے بگاہے، مولانا سے اسٹبلشمنٹ کی شان میں گستاخی ہوتی رہتی ہے: مثلاً



زرداری دور میں قبائلی علاقوں پہ ڈرون حملے شروع ہوئے، کئی بیگانہ گھرانے بھیٹ چڑھ گئے تو ہمارے چیف آف انٹرفیس نے بیان دیا کہ اگر حکومت اجازت دے تو ہمارے پاس ڈرون گرانے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس بیان پر مولانا نے قہقہہ ہار بھرہ فرمایا کہ کسی نے چوروں سے بچنے، چوکیدار رکھا تھا، چور گھر لوٹ گئے اور چوکیدار کہہ رہا تھا کہ مالک اجازت دیتا تو میں ان کو پکڑ لیتا۔ بھی انہیں رکھا ہی کیوں تھا؟

اب ایسے بیانات کے بعد مولانا کی کردار کشی ضروری ہوتی ہے۔ برسیل تذکرہ، نیو سپلائی اور ڈرون حملوں کیخلاف صرف مولانا فضل الرحمن ہی نہیں بلکہ دودھیر سیاسی جماعتیں بھی احتجاج کیا کرتی تھیں۔ لیکن ایک باریوں ہوا کہ امریکی ڈرون حملے میں 24 پاکستانی فوجی مارے گئے، جس پر دونوں مذکورہ جماعتیں بہت سیخ پا ہوئیں۔ ایک نے ڈرون کیخلاف اسلام آباد تا وزیرستان لانگ مارچ کا اعلان کر دیا اور دوسری جماعت نے نیو سپلائی رکوانے، پشاور میں دھرنے کا اہتمام کر دیا۔ میڈیا نے اتنی بھر پور کوریج دی کہ اس شور و غوغا میں سنجیدہ پاکستانیوں کے سوالات دب کر رہ گئے، جو حیران تھے کہ ڈرون کیخلاف لانگ مارچ تو وزیرستان سے شروع ہو کر اسلام آباد امریکی سفارت خانے کو جانا چاہئے تھا، یہ الٹا کہاں جا رہا ہے؟ اور نیو سپلائی کے خلاف دھرتا تو کراچی میں ہونا چاہئے تھا، جہاں سے یہ شروع ہوتی ہے، اختتام سفر پہ کیسا دھرتا؟ اسٹبلشمنٹ میڈیا میں کسی کی کردار کشی کرنے کیلئے بڑا سادہ طریقہ کار استعمال کرتی ہے۔ پہلے سوسائٹی میں سادہ دل معروف لوگوں کو ٹارگٹ کیا جاتا ہے جن کی فردا فردا ذہن سازی کی جاتی ہے۔ جب معاشرے کے یہ نیک نام لوگ، ایسی باتوں پہ یقین کر کے اپنے حلقہ احباب میں پھیلا دیتے ہیں تو پھر انہی افواہوں کو سوشل میڈیا پہ ”لیکس“ کی صورت میں شہر کیا جاتا ہے۔ سوشل میڈیا کیلئے اسٹبلشمنٹ کے پاس افرادی قوت کثرت سے دستیاب ہے جو کہ کافی ”ویلے“ ہوتے ہیں۔ ضرب عضب وغیرہ مہمات میں تو ان میں سے چند فیصد ہی مصروف ہوتے ہیں۔ سیلاب، زلزلہ وغیرہ آفات میں بھی صوبیدار لیول تک کے لوگ زیادہ مشغول رہتے ہیں، باقی نوجوان افسران فیس بک کیلئے فارغ ہی فارغ ہیں۔ انہوں نے کوئی پبلک ڈیلنگ کرنا ہوتی ہے یا گھر کا سودا سودا لانا ہوتا ہے؟

میرے ایک دوست، جو آج کل کینیڈا شفٹ ہو گئے، اچھی پوسٹ پر فائز تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے اچھے نیک نام گھرانے سے ہیں۔ بتاتے ہیں: ”ایک بار مجھے ایجنسی کے افسر نے فون کیا (جو خود بھی ڈیرہ ہی سے تعلق رکھتا ہے) یہ معلوم کرنے کہ مولانا فضل الرحمن کا وہ بھائی جو کہ افغان کمشنریٹ میں افسر ہے، کیا وہ باضابطہ چھٹی لے کر گیا ہے یا نہیں؟ کیونکہ ایجنسیوں کو خبر ملی ہے کہ مولانا کے دونوں بھائی انڈیا میں ”گو“ کے ساحل پہ سیر کر رہے ہیں“



ہمارے سادہ لوح دوست، میجر صاحب کی بات پہ اعتماد کر کے میرے سامنے سرگوشیوں میں انکشاف کر رہے تھے (ظاہر ہے مولانا صاحبان سے بدظن ہو ہی چکے تھے) میں نے عرض کیا کہ جو انجینیئر انڈیا میں ان کی نقل و حرکت کی لمحہ بہ لمحہ خبر رکھتی ہے، اس کو یہاں چھٹی کی درخواست بارے معلوم کرنے کے لئے، آپ کی مدد کیوں درکار ہوگئی؟ جب کہ آپ کا اس سے کوئی علاقہ ہی نہیں؟ ٹھٹھک گئے، کہنے لگے ”پھر کیا مقصد ہوگا؟“ عرض کیا ”یہی مقصد ہے کہ آپ جیسے درجن بھر شریف لوگ جب اس بات کو پھیلائیں گے تو سال بھر میں ہزاروں لوگ قسم اٹھا کر مولانا کی بدکرداری کی گواہی دیں گے“

اسٹبلشمنٹ جب افواہ کو مستحکم کر دیتی ہے تو پھر سوشل میڈیا پہ چڑھا دیتی ہے، مثلاً ”سوس بنک کے ڈائریکٹر نے کہا کہ ہمارے بنک میں زرداری کے اتنے بلین ڈالر پڑے ہیں جو پاکستان کے تین سالہ بجٹ کے برابر ہیں۔ اب اس خبر کو شیئر کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ کوئی مقامی بینک بھی کبھی اپنے کلائنٹ کی تفصیل نہیں دیا کرتا تو سولیس بنک نے کیونکر دی؟ یا اسکے ڈائریکٹر کا نام کیا ہے؟ اور وہ اتنا فارغ کیسے ہے کہ پاکستان کے سالانہ بجٹ کے اعداد و شمار بھی اس کو اذہر ہیں؟

جب سوشل میڈیا میں بات جڑ پکڑ لے تو پھر اس کو مین میڈیا میں دیا جاتا ہے جس پر لوگ نورالیقین کر لیتے ہیں کیونکہ پہلے ہی ذہن سازی ہو چکی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک معروف ٹی وی انکر کی بیان کردہ کہانی کہ اس کو دہلی میں ایک یہودی جاسوس اتفاقاً مل گیا جس نے بتایا کہ وہ 17 سال تک ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک مسجد کا امام رہا ہے (شہر کے نام پہ بھی دھیان دیجئے) اس انکر سے پوچھنے والا کوئی نہیں کہ ہتھیلی بھر پھیلا ڈیرہ کا شہر ہے جس کے ائمہ مساجد کو لوگ نسلوں سے جانتے ہیں، پھر یہ کیسا پروفیشنل جاسوس تھا کہ پہلی اتفاقاً ملاقات میں ایک پاکستانی انجینیئر کے سامنے، اپنے خفیہ راز افشا کر رہا تھا؟

بہر حال، سیاستدانوں اور بالخصوص مولانا فضل الرحمن کی کردار کشی کے لئے اسٹبلشمنٹ نے میڈیا کو خوب استعمال کیا ہے۔ یہاں میں واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اسٹبلشمنٹ سے میری کیا مراد ہے؟ اسٹبلشمنٹ سے یوں تو خفیہ ایجنسیاں مراد لی جاتی ہیں جو اصل بادشاہ گر ہیں، مگر بات یوں ہے کہ ہماری ایجنسیوں میں نسیم حجازی سے متاثر ایک بزم خود اامت کا خیر خواہ عنصر موجود ہے۔ خوش گمانی کر لیتے ہیں کہ یہ طبقہ خلص ہے اور ذہین بھی ہے، مگر دنیا کی بدلتی صورتحال کو سمجھنا کسی ایک دماغ کے بس کی بات نہیں رہی۔ پس جب میں اسٹبلشمنٹ کا ذکر کروں گا تو اس سے ہماری خفیہ ایجنسی کا وہ طاقتور گروہ مراد ہوگا جو صرف خود کو بچی محبت وطن اور عقل کل سمجھتا ہے۔ یہ گروہ، پارلیمنٹ کو اپنا ج کر کے جمہوریت کی جڑیں کاٹنا چاہتا ہے۔ مثال میں جنرل حمید گل مرحوم کا نام لوں گا۔



خدا کا شکر ہے کہ جنرل راجیل شریف اور ان کی پرفیشنل اور صاحب بصیرت ٹیم کو اس بات کی بخوبی سمجھ ہے کہ ہر ادارہ آئین کے دائرے میں رہے تو ملک امن و ترقی کی راہ پہ بڑھ سکتا ہے۔ پس موجودہ فوجی قیادت سے خوش امیدی ہے کہ وہ فوج میں موجود غیر آئینی سوچ کو بتدریج اپنے قول و عمل سے ختم کر رہے ہیں اور اس کا اظہار یوں ہو رہا ہے کہ اب میڈیا میں مولانا کیلئے بھی کبھی کوئی کلمہ خیر سننے کو مل جاتا ہے۔ مگر اب تک کی صورتحال مولانا کے لئے کیسی رہی؟ اس کیلئے میرا ایک پرانا مضمون ملاحظہ کیجئے:

### میڈیا، ملٹری اور مولانا فضل الرحمن

میڈیا وہ دجالی منتر ہے جو کسی بھی ”کوڈو“ کو ”عالم چٹا“ بنا سکتا ہے، اس لئے صرف پاکستان ہی نہیں، دنیا بھر میں اس غفریت کو خفیہ ایجنسیاں ہی کنٹرول کرتی ہیں۔ میں آپ کے سامنے چند سوالات رکھتا ہوں جو ہر ذہن میں اٹھتے ہیں، مگر ”آزاد اور باشعور“ میڈیا اس طرف نہیں جاتا کیونکہ اس کو ”اجازت“ نہیں۔ اس ”برین سٹارمنگ“ کے لئے میں نے میڈیا، ملٹری اور مولانا کی مثلث پسند کی ہے، اس لئے کہ مولانا ہی سینئر ترین سیاستدان ہے۔

سوالات ملاحظہ کیجئے اور اندازہ لگائیے کہ پاکستانی میڈیا کونسی ذہن سازی پہ مامور ہے؟

میڈیا سے پہلا سوال:

پیپلز پارٹی کا راستہ روکنے جن جرنیلوں نے آئی جے آئی بنائی تھی، ان کا اعترافی بیان ریکارڈ پر ہے کہ اس کیلئے 1988ء میں بعض سیاستدانوں میں رقم بانٹی گئی۔ نواز شریف کو 35 لاکھ، جاوید ہاشمی کو 5 لاکھ، قاضی حسین احمد کو 5 لاکھ روپے وغیرہ، پوری لسٹ عدالت کو دی گئی تھی۔

ایجنسیوں سے پیسہ نہ لینے والے سیاستدانوں میں مولانا شاہ احمد نورانی، خان عبدالولی خان اور مولانا فضل الرحمن تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ آری نے قوم کا یہ پیسہ کس اختیار کے تحت سیاست میں لگایا؟ اس پہ کبھی کوئی ایسکر بولے گا.....؟

میڈیا سے دوسرا سوال:

جاوید چوہدری کا کالم ریکارڈ پر ہے کہ جنرل اسلم بیگ نے مولانا فضل الرحمن کو جی ایچ کیو میں بلا کر اپنے صدارتی امیدوار غلام اسحق خان کی حمایت کے لئے دھمکایا، مگر ایسے میں کہ جب بینظیر بھٹو سمیت سب جھک گئے تھے، مولانا نے اپنے امیدوار نواز اده نصر اللہ کو دستبردار کرنے سے انکار کر دیا۔

اسلم بیگ بھی زندہ ہے اور جاوید چوہدری بھی۔ کیا وہ اپنے پروگرام میں اسلم بیگ کو بلا کر پوچھے گا کہ



ایک سرونگ آرمی چیف کیوں ایسی کھلی سیاست کر رہا تھا؟

### میڈیا سے تیسرا سوال:

میڈیا میں ”کسی“ نے ایک مہم چلائی تھی کہ مولانا نے ڈیرہ میں 5 ہزار کنال، آرمی کی زمین اپنے نام کروالی۔ وہ مہم بالکل خاموش ہو گئی ہے، آرمی سے پوچھنا بنتا ہے کہ شہدائے کارگل کے لئے مختص زمین، کس قاعدے قانون کے تحت، یا کس کارنامے کے تحت آپ نے غیر متعلقہ لوگوں کو الاٹ کی؟ کیا کوئی دلیر اینکر، آرمی کے پراپرٹی کلرک کو بھی بلا کر کوئی وضاحتی ڈاکومنٹ دکھائے گا؟  
مضمون ختم ہوا۔

اگر میڈیا مذکورہ بالا سوالات نہیں اٹھاتا تو آپ اس کی یک رخنی یا بے بسی یا تالافتی یا اس کے خاص ایجنڈے کا خود ہی اندازہ لگالیں۔

### مولانا فضل الرحمن اور صالح صحافی:

دیکھئے! یوں تو مولانا سے ہر وہ صحافی اور ادارہ تالاں ہے، جس کو جمہوریت سے خدا واسطے کا میر ہے۔ مگر ایسے صحافی، جن کا خمیر جماعت اسلامی سے گوندھا گیا ہو، وہ تو مولانا کے گویا ذاتی دشمن ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ متقی اور صالح اخبار نویسوں کی فہرست بنائیں تو انصار عباسی اور ہارون رشید کا نام ضرور شامل کریں گے کہ ان کے کالموں میں قرآن وحدیث کے حوالے بہت ہوتے ہیں، مگر ان مومن صحافیوں کو مولانا فضل الرحمن سے خاص بغض ہے۔

جہاں تک ہارون الرشید صاحب کا تعلق ہے جو آج کل روزنامہ ”دنیا“ میں کالم لکھتے ہیں تو اگر وہ ایک ہفتہ تک مولانا کا نام لے کر تمہری نہ کریں تو شاید ان کو روٹی ہضم نہ ہو۔

دور کیوں جائیے! میں ہارون الرشید کے حالیہ دو کالم (جولائی 2016ء) آپ کے سامنے رکھتا ہوں جو صرف 3 دن کے وقفے سے لکھے گئے، اس میں صحافیانہ منافقت کا روپ دیکھئے:

24 جولائی 2016ء میں نوابزادہ نصر اللہ بارے کالم لکھا (مشرقی ہوشیار باش) جس میں سے چند جملے ملاحظہ کریں: ”جو بات سننے کہ نہ ہو، سنتے نہ تھے، کہنے کی نہیں تو کہتے نہیں تھے“ (میں تو اس جملے کا مصداق مولانا فضل الرحمن کو سمجھتا ہوں)

”ایک بزرگ مدیر نے زچ کیا اور عناد کے ساتھ کرتے رہے تو بس اتنا کہا اخبار نویس کے قلم اور حجام کے استرے میں فرق ہونا چاہئے“



(میں یہاں بزرگ مدیر کی جگہ ہارون الرشید اور نوابزادہ کی جگہ مولانا بھی لگا سکتا ہوں)۔  
 ”اخبار میں ان پر الزام لگاتھا کہ زمین ہتھیالی، اس پر مدیر کو فون کیا کہ زمین کی خرید و فروخت کا ریکارڈ ہوتا ہے، گواہ ہوتے ہیں، انکو ٹھے ثبت کئے جاتے ہیں، کوئی ثبوت تو پیش کیجئے“  
 (کیا یہ جملہ مولانا کے کیس پہ فٹ نہیں بیٹھتا؟)  
 ”بے نظیر بھٹو نے منت خوشامد کی تو حکومت کا حصہ بننے پر آمادہ ہوئے، کشمیر کمیٹی کے چیئرمین ہو گئے، برسوں ایک مقصد کیلئے دشنام سہی“

(اور یہ بات مولانا فضل الرحمن بارے کیوں نہیں کہی جاسکتی؟)  
 یہ جملے جو ہارون رشید صاحب نے نوابزادہ کی مدح میں اپنی خوش گمانی سے لکھے، ہو بہو مولانا فضل الرحمن کے بارے بھی لکھے جاسکتے ہیں، مگر مولانا فضل الرحمن کے بارے موصوف کا تجزیہ دیکھئے:  
 موصوف 27 جولائی 2016 کو بعنوان ”عجیب لوگ“ اپنے کالم میں لکھتے ہیں: مولانا فضل الرحمن حصول خلافت کیلئے امریکی سفیر کی خدمت میں حاضر ہوئے“  
 طنز و تعریف کو ایک طرف رکھئے، صحافیانہ اصول ہی پر اس جملے کی پرکھ کر کیجئے!

مولانا فضل الرحمن کا ظرف شاید نوابزادہ مرحوم سے زیادہ ہے، ورنہ نوابزادہ کی طرح فون کر کے آنجناب سے پوچھتا کہ 10 سال وہی کیس کو گذر گئے، امریکی سفیر ابھی زندہ ہے، اس کا کوئی انٹرویو، کوئی بیان کا اخباری تراشہ ہے آپ کے پاس؟ اور یہ کہ صحافی کے قلم اور حجام کے استرے میں فرق ہونا چاہئے۔  
 ہارون رشید صاحب بھی دیواروں سے برآمد آوازوں کی بنیاد پر تجزئے فرمایا کرتے ہیں اور کمال یہ کہ اس کے ساتھ قرآن وحدیث کے شذرے جوڑتے چلے جاتے ہیں۔

میں آپ کو بتاؤں آخر اس مومن صحافی کا ہر چوتھا کالم مولانا فضل الرحمن کے خلاف کیوں ہوتا ہے؟  
 اس کی وجہ اسی کے اپنے کالموں سے ہی معلوم ہو جاتی ہے، جس میں موصوف اشارہ فرما ہیں کہ عمران خان نامی پراڈکٹ، جنرل حمید گل نے اسی صحافی کے کہنے پہ لالچ کیا تھا اور چونکہ اس پراڈکٹ کو ٹھپ کرنے میں زیادہ حصہ مولانا کا ہے، لہذا موصوف کی مولانا سے ذاتی تنگی بہت حد تک قابل فہم ہے۔

اسی طرح دوسرے مومن صحافی اپنے انصار عباسی صاحب ہیں جو روزنامہ جنگ کے سینئر کالم نگار ہیں اور جیو انویسٹی گیشن یعنی تفتیش ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ہیں۔ انہوں نے مولانا کا ملٹری لینڈ سکینڈل طشت ازبام کیا تھا اور اس پہ بہت شور و غوغا بھی چایا مگر افسوس کہ موصوف کی یہ تفتیش غلط ثابت ہوئی۔  
 روزنامہ ”دنیا“ کے کلاسرا صاحب نے اربوں روپے کے مختلف کرپشن سکینڈل نہ صرف رپورٹ کئے



بلکہ عدالت میں بھی لے گئے مگر عباسی صاحب کی ساری پروفیشنل زندگی کا ایک ہی کارنامہ ہے یعنی یہ جھوٹی رپورٹ کہ مولانا فضل الرحمن کو ڈیرہ میں ہزاروں کنال ملٹری لینڈ الاٹ ہوئی۔ بعد میں ایک ٹی وی پروگرام میں موصوف نے مولانا کی بجائے چند دوسرے لوگوں کے نام گوائے کہ یہ مولانا کی پارٹی کے فلاں لیڈر کا کزن اور فلاں کا بھانجا ہے لہذا یہ بھی مولانا کے کھاتے میں ڈالو۔

اسی ٹی وی پروگرام میں، حامد میر اور انصار عباسی نے مولانا کا خوب میڈیا ٹرائیل کیا (یہ وہی حامد میر ہیں جنہوں نے 11 جون 2012 کے اپنے اخباری کالم میں ارسلان افتخار کی کرپشن پر چوہدری افتخار کو بری الذمہ قرار دیتے ہوئے مولانا مودودی اور ان کے بیٹے کی مثال دی تھی) اسی پروگرام میں عباسی صاحب نے اپنی اور اپنے مددوچ افتخار چوہدری کی جرات کا واقعہ بھی سنایا۔ میں بد نصیب اس پر بھی دونوں کو داؤ نہیں دے سکا تھا کہ مشرف دور کی چہرہ در چہرہ شجاعتوں کے لکھے ہوئے سکرپٹ ہمیں قابل اعتماد نہیں لگتے بہر حال ملٹری کی زمین کسی کی آبائی جاگیر نہیں ہوتی کہ بونہی اٹھا کر دے دی جائے بلکہ یہ لین دین، باقاعدہ کسی ”ڈاکومنٹ“ میں درج ہونی چاہیے۔ اب اگر میڈیا پر سرکاری زمین الاٹ کرنے کے وجہ نہ بتائی جائے تو پھر وصول کرنے والے سے زیادہ عطا کرنے والا مجرم ٹھہرتا ہے۔

عباسی صاحب پروگرام میں کہہ رہے تھے کہ مولانا، عدالت جائے۔ مولانا کیوں عدالت میں جاتے؟ جس عدالت کی بحالی کیلئے عاصمہ جہانگیر سے لیکر عمران خان تک مرے جا رہے تھے، مولانا نے اس وقت بھی اس منصف اعظم کی کریڈیٹبلٹی پر تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے اس احتجاجی تحریک سے اپنی جماعت کو لاتعلق رکھا تھا تو وہ کیوں ایسی عدالت میں جاتے؟ (ویسے پگڑی والے ملا کی سیاسی بصیرت کو سلام کہ جس بصیرت تک آکسفورڈ پلٹ لوگ پانچ سال بعد جا کر پہنچے)

دین کے ادنیٰ طالب علم کو بھی پتہ ہے کہ یہ ملزم نہیں، بلکہ الزام لگانے والے کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ قاضی کے سامنے ثبوت رکھے، ورنہ قذف کے کوڑے کھائے۔ پس یہ عباسی صاحب کی حب الوطنی اور دینداری کا تقاضہ ہے کہ وہ اس کیس کو عدالت لے جائیں۔

پھر عباسی صاحب نے اتنی بابا ہا کار چائی تھی گویا کہ یہ اربوں روپے کا سیکنڈل ہو۔ ڈیرہ میں راکھ رک کی وہ زمین، آج بھی ایک ہزار روپے کنال تک دستیاب ہے، بالفرض اگر 5 ہزار کنال بھی کسی نے لیا ہو تو یہ اتنی بڑی کرپشن نہ تھی جس پہ دو سینئر صحافی، کاغذات کا پلندہ لیکر، ایک کھنڈے کا سیشل ٹی وی پروگرام کرتے۔ چند سو کنال کی زمین پر ایک غلط واویلا مچا کر، موصوف نے اپنی سوچ ہی نہیں، اپنے پروفیشنل ازم کے بھی چھوٹا ہونے کا ثبوت دیا۔



یہ تو پرنٹ میڈیا یا ٹی وی چینلوں کی بات ہوئی۔

سوشل میڈیا پر مولانا کے متعلق جو کچھ کہا گیا، ایک سلیم الفطرت آدمی اس کو بیان کرنے سے بھی شرماتا ہے، حتیٰ کہ وہ کی پیڈیا جیسے سنجیدہ علمی ہیج پراگر آپ ایم آر ڈی کے لیڈران کے تعارف دیکھیں تو اس میں بھی مولانا کا نام ”مولانا ڈیزل“ لکھا گیا ہے۔ یعنی میڈیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں چھوڑی گئی جہاں مولانا کی بے عزتی کا سامان کرنے کی کوشش نہ کی گئی، لیکن بے شک عزت و ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

میڈیا اور اس کے پس پردہ آقاؤں نے مولانا کا جو برا بیج بنایا ہے، اس ضمن میں راقم نے ایک طنزیہ مضمون لکھا تھا جس سے نوجوانوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا، ملاحظہ کیجئے:

## پاکستان کا ”ایکسٹو“ کون ہے؟

ہمارے بچپن کی پسندیدہ کتب میں ابن صفی کی عمران سیریز بھی تھی، جس کا ہیرو علی عمران، بیک وقت دو روپ رکھتا تھا۔ ظاہری کردار میں اتنا سادہ لوح کہ باور پچی سے باہر ہو، مگر دوسرے روپ میں ایسا شاطر کہ نام بھی بے نام تھا یعنی ”بلیک مزو“۔ عہدے کے لحاظ سے علی عمران ہی اصل ”ایکسٹو“ تھا۔ بہت نور و رخس کے بعد میں اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ پاکستان کا ”ایکسٹو“ مولانا فضل الرحمن ہے۔

کہا جاتا ہے کسی کے کردار کی گواہی دینے کو تین شرائط ہونا ضروری ہیں، اس کیساتھ معاملہ پڑا ہو، اس کے ساتھ سفر کیا ہو یا وہ آپ کا پڑوسی ہو۔ مولانا کے ساتھ ہمارا معاملہ تو خیر کیا پڑنا کہ کوئی جماعتی یا ذاتی تعارف تک نہیں ہے، ایم آر ڈی کے دنوں میں مولانا کے ساتھ کچھ مٹر گشت ہوئے جنہیں ”سفر“ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ ڈیرہ میں مولانا کے پڑوسی ہونے کے ناطے جو گواہی دے سکتا ہوں اس کے مطابق مولانا ایک آدمی نہیں ہے۔ ایک وہ مولانا فضل الرحمن ہے جس کے گھرانے سے میں 30 سال سے واقف ہوں اور دوسرا پاکستانی میڈیا کے مطابق، وہ مولانا ہے جو چند نگوں کی خاطر بک جانے والا ایک بے اصول شخص ہے، اور پاکستانی میڈیا کو جھٹلانے کی بھلا کس میں جرات ہے؟

مولانا فضل الرحمن کی سیاست کی ابتدا ہوتی ہے 1981ء میں جب جنرل ضیاء کا مارشل لا نافذ ہے جنرل ضیاء نے علما میں تفرقہ ڈالنے کیلئے پرکشش معاوضوں کے ساتھ ایک مجلس شوریٰ بنائی ہے اور مدارس کو زکوٰۃ فنڈ کے نام سے بھاری رقم جاری کر دی ہیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ 28 سالہ نوجوان فضل الرحمن، یہ ساری ترغیبات مسترد کر کے جیل کا راستہ پسند کرتا ہے تو یہ اس کا ظاہری روپ تھا۔ لیکن درحقیقت ایک دوسرا فضل الرحمن بھی تھا جو ہر حکومت کا ساتھ دیا کرتا تھا۔ پس اس نے جنرل ضیاء کا ساتھ دیا، مال بنایا،



اور عیاشی کی۔ چونکہ وہ والا فضل الرحمن بلیک زیرو ہے، تو آپ کو اس بارے کیسے پتہ چل سکتا ہے؟ ہیں جی! پھر غیر جماعتی انتخابات ہوتے ہیں 1985ء میں۔ جماعت اسلامی سمیت موہمی سیاستدان ان میں حصہ لیتے ہیں، ایک وزارت کی خاطر بکنے والا فضل الرحمن یہ گولڈن چانس آخر کیسے چھوڑتا؟ یہ جو مولانا فضل الرحمن ہے، جس نے ان الیکشن کا بائیکاٹ کیا تھا، یہ اصلی والا نہیں ہے۔ اصل فضل الرحمن نے اس اسمبلی میں تین سال مزے کئے تھے، مگر آپ کی نظروں سے غائب رہ کر۔

فوجی ایجنسیاں، 1988ء کے جنرل الیکشن کے ہنگام، نواز شریف وغیرہ کو خفیہ فنڈ فراہم کرتی ہیں۔ 30 سال بعد جنرل اسد درانی سپریم کورٹ میں پیسے لینے والوں کی فہرست پیش کرتے ہیں جس میں مولانا کا نام نہیں۔ کیوں کہ ”ایکسٹو“ ہونے کے ناطے کوئی اس کا نام نہیں لے سکتا، ورنہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ پیسے پہ مرنے والا آدی ہے۔

الیکشن کے بعد بے نظیر گورنمنٹ بنتی ہے، مولانا اپنی مرضی کا عہدہ لے سکتا ہے مگر اسے اپوزیشن پسند آئی بلوچستان میں بکٹی کے ساتھ حکومت ملتی ہے، حکومت کو فضل الرحمن جیسا آدی کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ مگر ایک سال بعد ہی وہ بلوچستان حکومت کو ٹھوکر مار دیتا ہے اور بے نظیر کخلاف عدم اعتماد کا ووٹ دے کر اپنی روزی روٹی یہ لاتا رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا، ایک اور فضل الرحمن غائبانہ طور پر بدستور حکومت میں تھا، بس عوام کو پتہ نہیں چلا۔ پھر 1990ء کے الیکشن میں دو بڑے سیاسی اتحاد بن گئے ہیں۔ دونوں مولانا کو ساتھ ملانے کیلئے سرگرداں ہیں، اس بار وہ سولو فلٹ کرتا ہے، اپنا حلقہ ہار جاتا ہے۔ مگر اس کی پارٹی حکومت میں پہنچ جاتی ہے، اس کو فوراً حکومت میں شامل ہونا چاہئے تھا، ضرور ہوا ہوگا۔ بس ہم کو نظر نہیں آیا۔

اگلے الیکشن میں یعنی 1993ء میں پھر وہ جیت جاتا ہے، بے نظیر کی حکومت ہے، ظاہر ہے اس کو حکومت میں آنے کیلئے، کوئی خاص محنت کی ضرورت نہیں کہ پرانے جمہوری اتحادی ہیں۔ اگر اس حکومت میں ان کے پاس کوئی وزارت نہیں ہے، تو یہ آپ کی آنکھوں کا دھوکہ ہے ”ایکسٹو“ نظر تھوڑی آیا کرتے ہیں؟

تاریخ ساز دھاندلی والے 1997ء کے الیکشن میں نواز شریف دو تہائی اکثریت حاصل کر لیتا ہے مولانا کو ہر حکومت کے ساتھ ہونا ضروری ہے، مگر وہ حکومت میں نہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اصلی والا فضل الرحمن بھی حکومت میں نہیں تھا۔ وہ حکومت میں شامل تھا مگر وہ چونکہ ایکسٹو ہے تو قوم کو کیسے پتہ چلتا؟

پھر اپنا سید پرویز مشرف لاتا ہے، ریفرنڈم کراتا ہے۔ کئی ”پاک“ لوگ بس اصولوں کی خاطر، جنرل پرویز مشرف کی ہم چلا رہے ہیں۔ سامنے وزارتیں پڑی ہیں تو مولانا کیسے پیچھے رہتا؟ بس اس نے یہ گیم کھیلی کہ ایک مولانا جیل میں چلا گیا، جس کا ہم کو پتہ ہے، دوسرا ان دنوں مشرف کا وزیر بن گیا تھا۔



جو خطہ غیب میں پوشیدہ تھا۔

مولانا ایم ایم کے پلیٹ فارم پر پرویز مشرف کا اپوزیشن لیڈر منتخب ہوا۔ مشرف نے کئی ایسے ناگوار اقدامات کئے تھے جس کی بناء پر ایک غیر متند آدمی کو اسمبلی سے استعفیٰ دینا چاہیے تھا (جیسے آج کل لوگ غیرت کے مارے استعفیٰ دیدیا کرتے ہیں) مگر چونکہ مولانا بکا ہوا تھا، اس نے استعفیٰ نہیں دیا، حالانکہ ایم ایم اے میں اسکے باقی اتحادی یعنی جماعت اسلامی کے 25 ممبران اسمبلی، اور عمران خان تو پہلے دو سال میں ہی استعفیٰ دے چکے تھے۔ اگر آپ کو اس اسمبلی میں، عمران خان اور قاضی حسین احمد جیسے لوگ کامل مراعات سمیت، پانچ سال پورے کرتے نظر آتے ہیں تو یہ فقط میڈیا کا پراپیگنڈہ ہے ورنہ تو یہ سب مستعفی ہو گئے تھے اور اسمبلی میں صرف مولانا فضل الرحمن اور اس کے 35 ممبران اسمبلی ہی رہ گئے تھے۔

اس دوران، ایک ایسا موقع بھی آیا کہ اگر سرحد اسمبلی کو مولانا کا وزیر اعلیٰ توڑ دیتا تو پرویز مشرف کیلئے آئینی بحران ضرور پیدا ہو جاتا (یہ الگ بات ہے کہ چیف آف آرمی سٹاف کی چھڑی کسی بحران کو نہیں مانتی) چونکہ مولانا پرویز مشرف کے ہاتھ بکا ہوا تھا، اس لئے مشرف کو بچانے کیلئے اسمبلی نہیں توڑی، ورنہ دیکھ لیجئے، نواز شریف کو ہٹانے پختونخوا اسمبلی کو تو پچھلے سال ہی توڑ دیا گیا ہے۔

پہلے میں حیران ہوتا تھا کہ پاکستان میں کیوں لوگ نگران حکومت میں شامل ہونے کو مرتے ہیں جبکہ یہ صرف تین ماہ کیلئے ہوا کرتی ہے؟ یہ روز تو بعد میں اُکھلا کہ وزارت ایک دن کیلئے بھی مل جائے تو دارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے ایک نگران وزیر نے پہلے ہی دن، گورنمنٹ کی کمرشل زمین 90 سالہ لیز پر اپنے بیٹے کو الاٹ کروادی اور تین ماہ میں اس پہ کمیٹی سے سرکاری خرچ پر مارکیٹ بنوا کر گورنمنٹ کو ہی من مانے کرایہ پر چڑھا دی۔ پاکستان میں پانچ بار نگران حکومتیں آئیں اور منت ترلے کر کے تیسری صف کے سیاستدانوں کو بھی اس میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ مولانا جیسا پیسہ پرست آدمی بھلا کیوں پیچھے رہتا؟ پس اگر آپ کو مولانا ان پانچوں حکومتوں کا حصہ نظر نہیں آتا تو آپ کے پاس بصیرت کی نظر نہیں ہے۔

بہر حال، مولانا فضل الرحمن ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ ظاہری مولانا تو آپ کے سامنے ہے، جس کے بارے میں معلوم ہے کہ ڈیرہ اسماعیل خان میں اس کا آدھے کنال کا گھر ہے، اس کے بچے اور بچیاں دینی مدرسوں میں پڑھتے ہیں، اس کے دن رات، ملک یا بیرون ملک پارٹی یا مضمعی مصروفیت میں گذرتے ہیں۔ جن میں اس کا قیام ظاہر و باہر ہے۔ اس کی نجی چھٹیاں کوئی نہیں اور عید وغیرہ کے ایام ڈیرہ میں یا حرم مکہ میں گذرتے ہیں۔ مگر اصل مولانا فضل الرحمن کا صرف مجھے پتہ ہے۔

سوشل میڈیا کے ماہرین شاریات نے بتایا کہ ایک ممبر قومی اسمبلی ماہانہ ایک کروڑ ڈکار جاتا ہے۔ اس



لحاظ سے بطور ممبر قومی اسمبلی 18 سال میں 2 ارب روپے سے زیادہ کی تنخواہ و مراعات سے صرف آدھا کنال گھر.....؟ بھلا یہ کوئی ماننے کی بات ہے؟ پس حال ہی میں جس لیڈر کی خبریں لیک ہوئی ہیں کہ اپنے کارکنوں کو پاکستان کے غم میں مبتلا کر کے مال دیپ میں کسی کے ساتھ رنگ رلیاں منانے گیا تھا، وہ مولانا ہی ہوگا۔ عالمی میڈیا نے مولانا کے ڈر سے اس کا نام پانامہ لیکس یا آف شور کمپنی میں نہیں دیا ہے، لیکن یہ بات آپ لکھ لیں کہ مدرسے کے چندے سے اس نے ساؤتھ افریقہ میں جائیداد بھی خریدی ہے، جس سے اس کی بہن نے دبئی میں فلیٹس بھی لئے ہیں۔

ہمارے مولانا ”ایکسٹو“ کی اضافی خوبی یہ ہے کہ دینی و دنیاوی علوم کے ساتھ ساتھ ”الٹرا فزیکس“ کے علوم سے بھی واقف ہے۔ ٹیلی پیٹھی ایک علم ہے جس کے ذریعے کس شخص کے ذہن کو گرفت میں لے لیا جاتا ہے۔ دنیا میں فردی ٹیلی پیٹھی یعنی ایک آدمی کا ذہن کنٹرول کرنے کی مثالیں موجود ہیں، لیکن ابھی تک اجتماعی ٹیلی پیٹھی یعنی پورے ایک طبقے کا ذہن مفلوج کرنے کی مثال مجھے نہیں معلوم تھی۔ مگر اب پتہ چلا کہ مولانا تو اجتماعی ٹیلی پیٹھی کا بھی ماہر ہے۔

اختصار کے پیش نظر صرف دو مثالیں دوں گا:

مولانا فضل الرحمن نے اپنی صوبائی حکومت کے زمانے میں آرمی کے ذہن کو ایسا مفلوج کیا کہ بلاوجہ وہ قوم کی امانت یعنی سرکاری اراضی سے اس کو ہزاروں ایکڑ زمین دے بیٹھے۔ پھر اسی ٹیلی پیٹھی کو استعمال کرتے ہوئے اس نے ”انٹرویو جرنلزم“ کو بھی مفلوج کر دیا کہ صحافیوں کو کہیں کوئی رسید یا ڈاکومنٹ نہیں مل سکا پھر اسی علم کو استعمال کرتے ہوئے اے این پی حکومت کے ذہن کو مفلوج کیا کہ پانچ سال میں وہ اس زمین کا اتنے پتہ معلوم نہیں کر سکے۔ پھر اسی خاص علم کو استعمال کیا کہ تحریک انصاف کی حکومت کے سارے ادارے تین سال میں اس زمین سے واقف نہیں ہو سکے حالانکہ حکمہ مال کا وزیر بھی ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے۔ اور تو اور، پورے ڈیرہ کے باشندے، روزانہ اس زمین کے ساتھ گزرتے ہیں لیکن کسی کو اسکی لوکیشن یاد نہیں رہتی ہے۔

مولانا کے اس خاص علم کا دوسرا مظاہرہ یہ ہے کہ مولانا نے 1995 میں ہزاروں ٹینکر ڈیزل کے پرمٹ حاصل کئے، یوں تو شمع گھی کی ایجنسی کا پرمٹ بھی لیا جائے تو تین جگہ اس کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔ ایجنسی کے پاس رجسٹر میں ایجنسی ہولڈر کا نام ہوتا ہے، ڈپو کے سپلائی رجسٹر میں ریکارڈ ہوتا ہے اور ایک ریسوینگ رسید ٹرک ڈرائیور کو سائن کر کے دی جاتی ہے جو ایجنسی تک پہنچاتا ہے۔ یہاں چونکہ ڈیزل کی سپلائی کا معاملہ تھا، جس میں کسٹمز کے علاوہ اگر کا کام بھی ہوتا ہے، پس پانچ جگہ ریکارڈ موجود تھا۔ لیکن



مولانا نے ہماری صحافتی برادری کا ذہن اپنے علم سے یوں مفلوج کر رکھا ہے کہ 20 سال میں ایک بھی جگہ سے رسید نہ ل سکی۔ اگر یہ ہزاروں ٹیکر مولانا نے کسی دوسرے ملک بھیجے ہوتے تو بارڈر سیکورٹی کے پاس بھی ریکارڈ ہوتا جو کہ نظر نہیں آ رہا۔ یہ پرمٹ مولانا نے کسی اور آدمی کو نیچے ہوتے تو اب تک اس کا نام بھی معلوم ہو جاتا۔ پس ظاہر ہے کہ اس سارے ڈیزل سے مولانا نے ملک بھر میں اپنے ہزاروں پٹرول پمپ چلا رکھے ہیں، جو نظر نہیں آتے اور جنات کو ڈیزل سپلائی کرتے ہیں۔  
پس مولانا ایک ایسا ایکسٹو ہے کہ جنات بھی جس کے تابع ہیں۔  
بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ”ایکسٹو“ مولانا کے بچے، آپ کو مدر سے میں پڑھتے پڑھاتے نظر آتے ہیں جو کہ نظر کا دھوکہ ہے۔

ہو نولولو کے جزائر میں ایان علی کو لاکھوں پاؤنڈ کی شاہنگ کس نے کرائی تھی؟ وہ مولانا اسعد محمود تھا؟ جس نے افتخار چوہدری کے بیٹے کا میک اپ کیا ہوا تھا، جبکہ ارسلان افتخار تو اس کی جگہ خیر المدارس ملتان میں ترمذی شریف پڑھا رہا تھا۔ ہیں جی!  
ٹیکنالوجی کا دور ہے بھیا، کانوں کو ہاتھ لگاؤ۔

مضمون ختم ہوا۔ / Official Jamiat

الختصر، سنجیدہ دوستوں سے عرض ہے کہ مولانا فضل الرحمن کو میڈیا کی آنکھ سے نہیں، حقیقی جمہوری تاریخ کے آئینے میں دیکھا کریں۔



## باب دوم۔ مولانا فضل الرحمن کی شخصیت:

مولانا ایک لیڈر ہے:

کسی بھی شخص کو اس کے زمانے کے لحاظ اور اس کے ہم پیشہ افراد کے موازنے سے ہی جانچا جاسکتا ہے۔ نہ تو کسی کا ماضی کی شخصیات سے تقابل کرنا چاہئے، نہ ہی کسی دوسرے پیشہ کے لوگوں سے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ نواز شریف کا موازنہ ماضی کے مسٹر جناح سے کیا جائے یا حال کے ڈاکٹر قدیر سے کیا جائے۔ اس کا موازنہ اس کے زمانے کے لحاظ اور اس جیسے سیاسی قائدین کے کردار سے ہی کیا جائے گا۔ اسی طرح مولوی سے یہ پوچھیں کہ اسپرین ایجاد کیوں نہیں کی؟ یا لیڈر سے پوچھنا کہ کتنے کرکٹ میچ جیتے ہیں؟ ایک بیوقوفانہ موازنہ ہے۔

اب ہم کیسے ثابت کریں کہ آج پاکستانی سیاستدانوں میں سے لیڈر کون شخص کہلایا جاسکتا ہے؟ کسی مغربی مفکر نے لیڈر اور سیاستدان میں فرق بیان کیا تھا کہ: لیڈر اگلی نسلوں بارے سوچتا ہے اور سیاستدان اگلے الیکشن بارے سوچتا ہے۔ خیر سے پاکستان کا ہر سیاسی لیڈر، زمانے بھر کے بدنام ”اکلیبلو“ کو اپنی پارٹی میں اگلا الیکشن ہی جیتنے شامل کرتا ہے مگر اپنی اس پالیسی کو عوام کی نسلوں کے مستقبل کا مفاد قرار دیا کرتا ہے، لہذا اس مغربی قول کو مغرب والوں کیلئے ہی چھوڑ دیجئے! ہمارے یہاں اسکی تشریح ناممکن ہے۔ اپنے علامہ اقبال مرحوم نے لیڈر کی تعریف یوں کی:

”نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز.....“

مگر یہ تینوں اصطلاحات بھی ذرا مبہم ہی ہیں، کیونکہ ”نگہ بلند“ کی بات کریں تو ہر لیڈر کہتا ہے کہ اس کے اہداف بہت پاکیزہ اور بلند ہیں۔ ”سخن دل نواز“ بارے کسی سے پوچھیں کہ بغیر ثبوت کے لوگوں کی پگڑیاں اچھالنا اور چوک چوراہوں پر نام لیکر گالیاں دینا کیسا سخن ہے؟ تو جواب ملتا ہے کہ کیا چور کو چور کہنا گالی ہے؟ لیڈر کے ”جاں پر سوز“ ہونے کا مطلب تو ہم کو خود بھی سمجھ نہیں آتا۔ مثلاً پشاور کے سکول میں بچوں کے لاشے پڑے ہوں اور لیڈر، خفیہ شادی کی بینکس بڑھا رہا ہو۔ پاکستان میں عوام، فاقوں سے خود کشیاں کر رہے ہوں اور لیڈر لندن میں شاپنگ کر رہا ہو، تو کیا پھر بھی وہ ”جاں پر سوز“ کا مالک ہوا کرتا ہے؟ پس اقوال زریں اور شاعری سے ہٹ کر سیدھے سبھاؤ، لیڈر کی صفات کا تجزیہ کرتے ہیں اور اس ترواز میں مولانا کو توالتے ہیں:



مولانا فضل الرحمن اس وقت پاکستان کے سب سے سینئر سیاستدان ہیں۔ ان کی 35 سالہ سیاسی زندگی پہ کئی پہلوؤں سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔ میں اپنا ایک مفصل مضمون آپ کے سامنے رکھتا ہوں، جس میں مولانا کی منفرد قائدانہ صلاحیتوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

میرے خیال میں ایک اچھے سیاسی و جمہوری لیڈر میں دس اہم صفات کا ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ اس وقت پاکستان کی پارلیمنٹ میں جمیعت علماء اسلام ممبران کی تعداد کے لحاظ سے پانچویں نمبر پر ہے مگر اس سے پہلے والی چار بڑی پارٹیوں کے سربراہان یعنی آصف علی زرداری صاحب، میاں نواز شریف صاحب، عمران خان صاحب اور الطاف حسین صاحب کے کردار کو بھی انہی دس صفات کے آئینے میں دیکھا جائے تو میرے تجزیے کو سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

### مولانا فضل الرحمن کی دس منفرد صفات

وہ دس صفات کیا ہیں؟ یعنی لیڈر کی ذاتی قابلیت، کارکنان پہ کنٹرول، جمہوری اقدار کا تحفظ، زبان سے نہ پھرنا، اپنے موقف پہ استقامت، دیانت و امانت، ذاتی کردار کی پاکیزگی، بیباکی و ہوشمندی، مستقبل بینی و بصیرت اور سب کے لئے قابل بھروسہ ثابت ہونا جیسی صفات شامل ہیں۔

آئیے، اب شق وار مولانا کے کردار کا مختصر جائزہ لیتے ہیں (اور اسی ترتیب و اصول پر، باقی چار مذکورہ سیاسی قائدین کو آپ خود تولتے چلے جائیں)

#### اول: لیڈر کی ذاتی قابلیت:

مولانا فضل الرحمن کسی اور کے کندھے پر چڑھ کر لیڈر نہیں بنا بلکہ وہ واحد جینیون لیڈر ہے جس کا انتخاب مجلس عمومی کے اس کڑے ماحول میں ہوا جس میں بزرگ علماء بھی اس کی نامزدگی کے موضوع پر آپس میں تلخ ہو گئے تھے (اس تلخی سے ہی تو ثابت ہوا کہ جمیعت علماء کے عہدوں کی نامزدگی، نہ تو ڈرامہ ہوتا ہے اور نہ مک مکا اور نہ ہی کسی کے ٹھہرے لگانے سے ہوا کرتی ہے، جبکہ دیگر لیڈران میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کے انتخاب سے، اس کے مقابل پارٹی کے کسی دوسرے بندے کا نام تک لیا گیا ہو) مجھے بتایا جائے کہ جناب زرداری، نواز شریف، الطاف حسین اور عمران خان کیسے پارٹی سربراہ منتخب ہوئے تھے؟

مزید توجہ چاہتا ہوں:

سیاسی پارٹیوں کے بڑے لیڈر کبھی اپنے باہمی اختلاف کی بناء پر ہم خیال کارکنوں کو لے کر الگ دھڑے بنالیا کرتے ہیں، مگر سیاسی تاریخ کی شاید یہ واحد مثال ہے کہ کسی کارکن کی خاطر، کسی جماعت کے



دو ایسے بڑے لیڈروں نے دھڑا بنالیا ہو جو خود نیاوی زندگی سے مستغنی رہتے ہوں۔

جمعیت علماء کے سیکرٹری جنرل کیلئے کسی کارکن کی نامزدگی کرنا تھی، حضرت مولانا عبداللہ درخواسی صاحب جو جمعیت کے امیر تھے، وہ مولانا سمیع الحق کو یہ منصب دینا چاہتے تھے (اپنے بیٹے کو نہیں) جبکہ خواجہ خان محمد صاحب مولانا فضل الرحمن کے حق میں تھے (اپنے بیٹے کیلئے نہیں) تفصیل الگ مگر اس اختلاف پہ جمعیت کے دو دھڑے ہو گئے۔

پھر یہ اعزاز بھی مولانا کے حصے میں آیا کہ چند برس بعد جمعیت علماء کے پہلے امیر (درخواسی صاحب) نے بھی واپس مولانا کی سرپرستی کرنا قبول کر لی۔ یعنی مولانا فضل الرحمن اپنی بنیادی جماعت کے دونوں دھڑوں کے دونوں سربراہان کا متفقہ انتخاب ٹھہرا ہے۔

اس کے بالمقابل باقی چاروں لیڈرز کی پارٹی قیادت، کس کس کے مرہون منت ہے، یا کس طرح ان کو ملی ہے؟ وہ تاریخ ہے۔

دوم: لیڈر کا کارکنان پہ کنٹرول:

لیڈر کا بنیادی وصف ہے کہ وہ اپنے کارکنان کیلئے ماں جیسا شفیع اور باپ جیسا سخت گیر ہو، تلف ہے ایسے لیڈر پر جو مصیبت کی گھڑی میں کارکنان کیساتھ نہ کھڑا ہو سکتا ہو یا اپنے کارکنان سے ہی مرعوب ہو جائے۔

ہماری سیاسی لاٹ میں مولانا فضل الرحمن وہ واحد لیڈر ہیں جنہوں نے اپنے کارکنان سے وفاداری اور ان سے باز پرس کی زندہ مثالیں قائم کی ہیں۔

یہ ابھی مولانا کے سیاسی کیریئر کی ابتداء تھی کہ نواب اکبر بگٹی کی وزارت اعلیٰ کے اشتراک سے بلوچستان حکومت بنائی، مولانا عصمت اللہ صاحب وزیر خزانہ تھے (وہی مولانا عصمت اللہ صاحب جو بعد میں "نظریات" کی بنیاد پر مولانا کو چھوڑ گئے تھے اور اب واپس آئے ہیں) نواب بگٹی کی رعوت سے بلوچستان کا نپٹا تھا۔ کابینہ کی میٹنگ میں مولانا عصمت اللہ پر کچھ بات کی، مولانا کو پتہ چلا۔ اسی دن بلوچستان حکومت سے یہ بیان دے کر علیحدگی اختیار کر لی کہ "ہم نے تو بگٹی صاحب کو سیاستدان سمجھ کر ساتھ دیا تھا مگر وہ تو نرے نواب نکلے"

پھر 20 سال بعد مولانا کے ذاتی دوست آصف علی زرداری کے ساتھ اتحادی حکومت میں تین وفاقی وزارتیں جمعیت کے پاس ہیں۔ وزیر اعظم گیلانی نے جمعیت کے وزیر مسٹر اعظم سواتی کو برطرف کر دیا (وہی اعظم سواتی جو نئے پاکستان کی خاطر مولانا کو چھوڑ گیا تھا) اپنے وزیر کی اس بے قدری پر اسی شام



وزارتوں کو ٹھوکر مار کر حکومت سے الگ ہو گئے۔

یہ وفاداری اپنے عظیم باپ کا ورثاتی تسلسل تھا کہ جب مفتی محمود اور نیپ نے آپس میں اتحاد کر کے سرحد اور بلوچستان میں حکومتیں بنائیں۔ مگر جو نبی بھٹو نے بلوچستان میں نیپ کی حکومت کو برطرف کیا، اسی دن اپنے اتحادی کے ساتھ وفاداری نبھانے مفتی محمود نے بھی صوبہ سرحد وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دیدیا۔ پاکستان کی تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

مگر جب بات اصول کی ہو تو مولانا جیسا سخت گیر لیڈر بھی کوئی نہیں۔

ان نام نہاد قومی لیڈروں کی بات تو چھوڑیے جو اپنے چند عہدیداران کے مال پہ جیتے ہیں اور جن کا کھاتے ہیں، ان ہی کا گاتے ہیں۔ دیکر وہ قومی لیڈر بھی جو اپنی جیب سے اپنی جماعت کے عہدیداروں کے ناز اٹھایا کرتے ہیں، وہ بھی اپنے بڑے عہدے داروں کو سخت سست کہتے ڈرتے ہیں کہ کہیں مقابلے میں دھڑانہ بن جائے۔

Rights of e-Publications reserved  
by

سوئم۔ جمہوری اقدار کا تحفظ:

TOP OFFICIAL JAMIAI

مولانا کی تیسری منفرد صفت ان کی جمہوریت کے ساتھ عملی کمٹمنٹ ہے۔

جمہوریت کی تان سب اٹھاتے ہیں، لیکن ڈکٹیٹری آنکھ میں آنکھ ڈال کر مرد کا بچہ ہی کھڑا ہو سکتا ہے مولانا فضل الرحمن اس وقت واحد سیاسی لیڈر رہے جو دونوں جی ڈکٹیٹرز کی جیل کاٹ چکا ہے۔

جنرل ضیاء اور جنرل پرویز مشرف کے دوا دار کو سامنے رکھتے ہوئے باقی لیڈروں کے حالات زندگی جاننا دشوار نہیں۔ مولانا فضل الرحمن کو جنرل ضیاء نے جیل میں کلاس ”بی“ میں رکھا تھا حالانکہ ہر سیاسی لیڈر کو کلاس ”اے“ جیل دی جاتی ہے۔ جنرل پرویز مشرف نے مولانا فضل الرحمن اور قاضی حسین احمد، دونوں کو آرٹیکل چھ، یعنی بغاوت کی دفعہ (جس کی سزا موت ہے) کے تحت چھ ماہ کے لئے نظر بند کیا تھا۔ یہ تو نائن ایون نے حالات بدلے، ورنہ دونوں راہنماؤں کیلئے موت کا پھندا تیار تھا۔

کمال یہ ہے کہ مولانا کبھی ان قربانیوں کی بنا پر ڈھینگ نہیں مارتا۔ حالانکہ اس ملک میں ایسے چھپھورے لیڈر بھی ہیں جن کو چوہدری افتخار بھالی ہم کے دوران آدھے دن کیلئے ان کے گھر میں نظر بند کیا گیا تو کہتے پھرتے ہیں کہ ہم نے جمہوریت کیلئے جیلیں کاٹی ہیں۔

مولانا کی یہ اضافی خوبی ہے کہ اپنے کارکنان کو خواہ مخواہ کے مصائب اور امتحانات میں نہیں ڈالتا۔ بلکہ زیادہ تر اپنی جان پہ جھیلتا ہے۔ اس لئے کہ قائد وہ نہیں ہوتا کہ جس کے کارکن ہی مار کھاتے رہیں بلکہ



خود اس کا بھی خون پسینہ کھلتا چاہئے۔

مولانا فضل الرحمن ہماری قومی قیادت میں واحد لیڈر ہے جس نے اپنا خون پیش کیا اور وہ بھی حرمت رسول کی خاطر۔ اسلام آباد کے ہولی فیلٹی ہسپتال میں زیر علاج رہا۔

برسبیل تذکرہ عرض کروں گا کہ اپنی انکیشن مہم کی آخری رات، بڑے مناسب وقت پہ عمران خان صاحب لفظ سے گر کر ہسپتال پہنچ گئے تھے اور اس جذباتی فضاء میں ایک بیان بھی ریکارڈ کروایا، جس سے ایک دم انکے دوٹ بڑھ گئے۔

یہ ایک اتفاقی حادثہ تھا، نہ کہ پولیس ٹکراؤ تھا۔ مجھے بہر حال اس وقوعے پر کچھ اشکالات ہیں۔ عمران خان لاہور میں لفٹ سے گر کر زخمی ہوئے لیکن نہ تو جائے وقوعہ محفوظ کی گئی، نہ گرانے والوں کا نام معلوم ہے، نہ ہسپتال کی رپورٹیں موجود ہیں۔ بس انکیشن کی آخری رات کو گرے اور بجائے جناح ہسپتال کے سیدھا اپنے شوکت خانم ہسپتال کی تیسری منزل پہ منتقل کر دیا گیا۔ جس کے بعد ان کا گردن میں پلستر ڈالے ویڈیو بیان آیا کہ: ”نو جوانو! میں نے پاکستان پہ جان واردی ہے“ جس طرح نواز شریف کیلئے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے دل کے آپریشن کی پوری تفصیل قوم کے سامنے رکھیں، ویسے ہی عمران خان کے اس وقوعے کو بھی بے نظیر کے وقوعے کی طرح مکمل تعینش کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔

بہر حال، مولانا پر 1989ء میں شائع ہونے والی شہادتیں کیخلاف مولانا کے جلوس پر اسلام آباد پولیس نے ٹارگٹ فائرنگ کی، مولانا سب کے سامنے زخمی ہوئے اور سب کے سامنے ہی علاج ہوا۔

Official Jamiat

JUIAnswerBook

چہارم۔ قول کا پکا ہونا: مولانا کی چوتھی صفت، اپنی زبان کا پاس کرنا ہے۔

کسی قوم کا لیڈر جھوٹ نہیں بولتا اور مرد اپنی زبان سے نہیں پھرتا۔

مولانا فضل الرحمن نے 35 سالہ سیاسی کیرئیر میں نہ کبھی یوٹرن لیا اور نہ ہی کوئی ایسا بیان دیا جسے بعد میں جھوٹ قرار دیا گیا ہو۔ اس کے بالمقابل باقی لیڈران کے کس کس ”یوٹرن“ کو یاد کیا جائے؟

پنجم۔ اپنے موقف پہ استقامت:

مولانا سیاسی حلقوں میں سخت سوداگر کے نام سے جانا جاتا ہے جو اپنے موقف پہ کبھی نرمی نہیں دکھاتا۔ دراصل مولانا نے پاکستان کی مولا جٹ سیاست میں ایک ایسی نئی وضع کی بنیاد ڈالی ہے جس میں باہمی احترام، غیر سنجیدہ سیاست سے اجتناب اور امن و معیشت کیلئے ساتھ دینا شامل ہے۔



مولانا سے پہلے پاکستانی سیاست کا انداز یہ تھا کہ اپوزیشن کا کام صرف حکومت کو کسی نہ کسی طور گرانا تھا اور حکومتی ارکان کا کام ہر جائز و ناجائز میں اپنی حکومت کا دفاع تھا۔ مولانا نے اپوزیشن میں رہ کر ٹانگ کھینچنے اور وقتی مفاد کی خاطر ملکی ترقی کو داؤ پہ لگانے کی روایت کو توڑا۔ خیبر پختونخوا اسمبلی میں نہ تو حالیہ تحریک انصاف کی حکومت کو جمعیت کی اپوزیشن کی طرف سے بلاوجہ کے تنازعے کا خطرہ ہے اور نہ ان سے پہلے، اے این پی حکومت کی حکومت کو جمعیت کی اپوزیشن نے بلا سبب تنگ کیا تھا۔ اے این پی نے جمعیت کی اپوزیشن پالیسی پر احسان مندی ظاہر کی تھی۔

دوسری طرف، مولانا نے حکومت میں رہ کر حکومت کے ہر اس اقدام کی بھرپور مخالفت کی جو ان کے موقف سے لگاؤ نہیں کھاتا تھا، یہی میچور پالیٹکس کہلاتی ہے۔

### ششم۔ لیڈر کی مالی دیانت و امانت:

مولانا کی چھٹی صفت، ان کی مالی امور میں دیانتداری اور امانت ہے۔ کتنا کمال ہے اس شخص کا کہ دشمن اس کی دیانتداری کی گواہی دے اور کتنا برا ہے وہ شخص، جسکے اپنے ساتھی اس کی بددیانتی کے شاہد ہوں۔ مولانا فضل الرحمن سے بغاوت کرنے والا اور اس کے دشمن کی جماعت کا رہنما بننے والا شخص ٹی وی پر آ کر پوری قوم کے سامنے قرآن اٹھا کر اس کی دیانت کی گواہی دے چکا ہے۔

حالانکہ ایسے لیڈر بھی پائے جاتے ہیں کہ جن پر ان کے بنیادی ساتھیوں نے پارٹی چندے کی مد میں گڑبڑ کرنے کا باقاعدہ مقدمہ درج کرا رکھا ہے۔ عدالت تین سال سے ان کو بلا رہی ہے کہ اپنی اپوزیشن واضح کریں لیکن ان کے وکیل تاریخ یہ تاریخ لے رہے ہیں۔

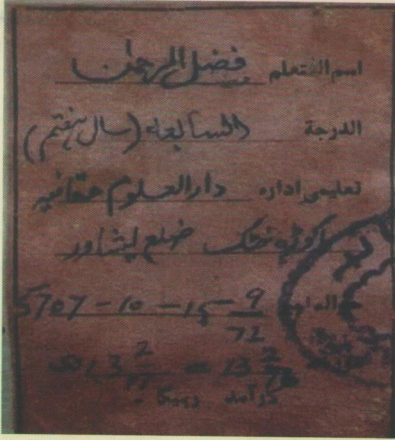
مولانا فضل الرحمن کا پارلیمانی ساتھی جناب اعظم سواتی، جسے اس کی خوبیوں کی بناء پر عمران خان نے اپنے ”اختیارات“ کے تحت صوبائی صدر بنا دیا، وہ جب سلیم صافی کے پروگرام ”جرگہ“ میں آتا ہے تو قرآن پہ ہاتھ رکھ کر مولانا فضل الرحمن کی مالی دیانت کی گواہی دیتا ہے۔ اسی طرح جسٹس افضل حیدر کی کتاب کے علاوہ جنرل اسد درانی کا سپریم کورٹ میں وہ بیان جو ”آئی جے آئی“ بنانے کے ضمن میں دیا گیا، مولانا کی امانت و دیانت پہ شاہد ہے۔

### ہفتم۔ ذاتی کردار کی پاکیزگی:

مولانا فضل الرحمن کی ساتویں صفت، ان کے کردار کی پاکیزگی ہے۔



مولانا فضل الرحمن: قرآن نہیں سے سیاست نہیں تک

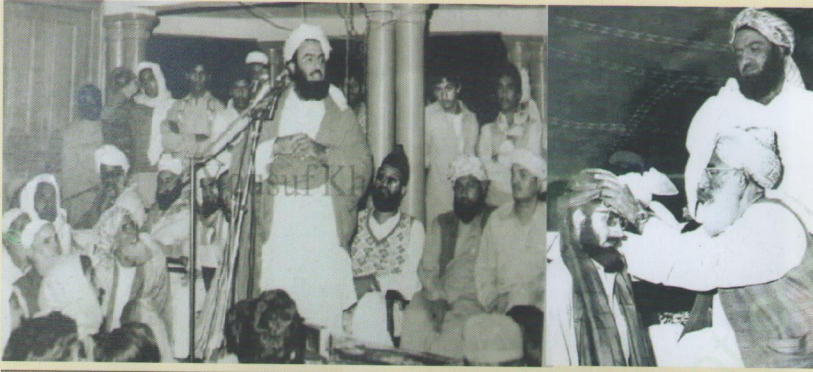


شیخ الازھر فہام شیخ عبدالمعین النہر مولانا مفتی محمود فضل دارالعلوم حقانیہ میں شیخ الحدیث  
مولانا عبدالحقؒ کے ہمراہ (قائد جمعیت) مولانا فضل الرحمن بھی نمایاں ہیں





جاتے ہوئے مفتی محمودؒ نے جمعیت آپ کو سونپی





یوں تو انسان خطا کار ہے، لیکن کسی لیڈر کی طرف منسوب جنسی بے راہ روی تو اہل مغرب کے ہاں بھی قبول نہیں۔ مولانا فضل الرحمن صاحب محض 28 سال کی عمر میں قیادت میں آئے اور آج ان کی عمر 60 سال سے زیادہ ہو چکی لیکن خدا کے فضل سے ان پہ جنسی بے راہ روی کا الزام نہیں لگا۔

اس کے بالمقابل ”پارلیمنٹ سے باز احسن تک“ کتاب اسی پاکستان میں 1997ء میں شائع ہوئی جس میں سب سیاسی لیڈروں کے کارنامے درج ہیں (اس کے علاوہ بھی کئی کہانیاں ملکی وغیر ملکی جرائد میں چھپی ہیں جن کا یہاں تذکرہ موزوں نہیں ہوگا)

انسان بہت کمزور ہے، علما بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔

کچھ دین دار لوگوں کا نام بھی کسی زمانے میں اسلام آباد والی میڈم طاہرہ کے ساتھ اخبارات میں آیا تھا لیکن خدا نے مفتی محمود صاحب کی لاج رکھنا تھی کہ ان کے بیٹے کا دامن ان خرافات سے بھی پاک ہے

ہشتم۔ بے باکی و ہوشمندی

مولانا کی آٹھویں صفت مدبرانہ بیباکی اور ہوشمندانہ جرات مندی ہے، اس کو ذرا توجہ سے سمجھئے گا۔ مولانا فضل الرحمن اس وقت پاکستان میں واحد لیڈر ہے جس نے کبھی سرعام پاک فوج کو ڈی گریڈ نہیں کیا لیکن کبھی چیف آف آرمی سٹاف کی چھڑی کو بھی خاطر میں نہیں لایا۔

دو سال پہلے آرمی پبلک سکول سانحہ کے بعد، کیا حکومت اور کیا دھرنے والے، سب دو گھنٹے کے نوٹس پر پشاور پہنچے، سوائے مولانا کے۔ اور اسی ہفتے قومی اسمبلی نے آئین میں اکیسویں ترمیم منظور کر لی جس میں فوجی عدالتوں کے قیام کی منظوری تھی۔

ہم جمہوری لوگ ہیں، اگر ہماری اسمبلی فوجی عدالتوں جیسے غیر جمہوری اقدام کو منظور کرتی ہے تو بھی ہمیں سر و چشم قبول ہے کیونکہ فوجی عدالتیں بنانا کفر نہیں ہے۔ مگر کیا اسمبلی نے یہ منظوری خود دی تھی یا فوج کے ڈنڈے کی بنا پر.....؟ آخر قرارداد پیش کرنے والا پیپلز پارٹی کا سینیٹر رضاربانی روکیوں رہا تھا کہ یہ میرے لئے شرمندگی کا دن ہے۔

اس بناء پر ہم اسے زبردستی کی ترمیم سمجھتے ہیں۔

اس قرارداد پر پاکستان کی ساری پارٹیوں نے دستخط کئے، مگر واحد مولانا فضل الرحمن ہے جس نے دستخط کرنے سے انکار کر رکھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نوٹ کریں کہ خلوت میں جرنیلوں سے ٹکرانے والا، جلسوں میں ان کو دھمکیاں نہیں دیا کرتا۔



لگے ہاتھوں، جاوید چوہدری کے کالم کا اقتباس بھی سن لیں:

”1988ء میں جب بے نظیر کی حکومت بنی تو اس نے ایم آر ڈی کے متفقہ موقف کے برعکس نوابزادہ نصر اللہ کی بجائے غلام اسحاق خان کو صدر نامزد کیا اور مولانا سے اپنی بے بسی کی معذرت کی“ جاوید چوہدری لکھتا ہے کہ: ”جی ایچ کیو میں جنرل اسلم بیگ نے دو جرنیلوں کے ہمراہ مولانا کو دھمکانے کی کوشش کی کہ اپنے امیدوار یعنی نوابزادہ کو دست بردار کرالیں لیکن مولانا دباؤ میں نہیں آئے“

نہم۔ مستقبل بنی و بصیرت:

مولانا فضل الرحمن کی نوین صفت یہ ہے کہ وہ عام لیڈران کے برعکس، صرف عوام کے ووٹ لینے کو پاپولر پالیٹکس نہیں کیا کرتے، بلکہ لانگ ٹرم بنیاد پر ایک نیا تھلا موقف اختیار کرتے ہیں، چاہے کسی کو وقتی طور پر پسند نہ بھی آئے۔ پاپولر پالیٹکس تو بلدیاتی کونسلر بھی کر سکتا ہے، قومی لیڈر کی بصیرت اتنی ہونا چاہیے کہ اٹھتی گھٹا سے پہلے، آنے والے زمانے کا اندازہ لگا سکے۔

مولانا فضل الرحمن شاید واحد لیڈر ہے، جس کی بصیرت پاکستان کی ساری قومی قیادت سے برتر ہے۔ یہ 2007ء کی ایک شام تھی، جب پانامہ لیکس کی طرح ملک میں بھونچال آیا تھا کہ تین باوردی جرنیلوں نے، ملک کے ایماندار ترین چیف جسٹس سے بزدراستی لینے کی کوشش کی، لیکن اس مرد آہن نے انکار کر دیا۔ اگلی صبح، پاپولر پالیٹکس کے دلدادہ عمران خان اور جماعت اسلامی چیف جسٹس کیلئے میدان میں آ چکے تھے مگر ایم ایم اے میں ہوتے ہوئے بھی مولانا فضل الرحمن نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن اسی شام جب ہماری پسندیدہ جمہوری سیکولر پارٹیاں یعنی اے این پی اور پیپلز پارٹی بھی میدان میں آ گئیں تو ہمیں مولانا کی بے حسی کھٹکنے لگی۔ بے نظیر بھٹو نے افتخار چوہدری کے گھر کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کی قیادت کرتے ہوئے انہیں اپنا وزیراعظم قرار دیا تو ہمیں بھی مولانا کی سیاسی بصیرت پہ شبہ ہونے لگا۔

بہر حال سوائے مولانا کے، پاکستان میں حزب اختلاف کی ساری سیاسی قیادت، وکلاء برادری اور رسول سوسائٹی چوہدری افتخار کی خاطر شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔

گویا پاکستان بھر کی ساری سیاسی دانش ایک طرف تھی اور مولانا کی بصیرت ایک طرف۔

پھر وہ دن آیا کہ چوہدری کے ہرجائے نے اسے مشکوک قرار دیا۔

صرف چوہدری افتخار کیس ہی نہیں بلکہ ہر سکیڈل میں وقت نے ثابت کیا کہ مولانا فضل الرحمن کا موقف ہی درست ہوا کرتا ہے۔



لگے ہاتھوں ایک اور چٹکلہ بھی سن لیں:

تحریک انصاف کا دعویٰ ہے کہ صرف ان کی پارٹی ہے کہ جس میں کارکنان اپنے ووٹ کے ذریعے لیڈر چنتے ہیں۔ اب ہوا یہ کہ مولانا کی پارٹی کو چھوڑ کر جانے والے اعظم سواتی کو تحریک انصاف کا صوبائی صدر بنایا دیا گیا۔ یعنی تحریک انصاف کے صوبہ بھر کے کارکنان کی جملہ سیاسی بصیرت بھی اسی اعظم سواتی تک پہنچ سکی، جس کو جمعیت نے کبھی جماعت کے ضلعی عہدے کے قابل بھی نہیں سمجھا۔

دہم۔ قومی لیڈر کو قابل بھروسہ ضرور ہونا چاہئے:

مولانا فضل الرحمن کی دسویں صفت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سخت لیکن مبنی برحق موقف کی بناء پر ملکی اور عالمی قوتوں کا اعتماد حاصل کر لیا ہے، یوں انہوں نے پاکستانی اسٹبلشمنٹ کیلئے خود کو ناگزیر ثابت کر دیا ہے۔ پاکستان سے کھیلنے والے تینوں مافیاز (جاگیردار، صنعتکار اور فوج) پاکستان کی تین سیاسی پارٹیوں کے پشت نواہ ہیں۔ مگر جس پارٹی کے پاس نہ میڈیا، نہ مافیا، نہ ڈنڈا، نہ گیسر اور پھر بھی اس کا لیڈر خود کو ناگزیر ثابت کر دے تو داد دینی ہے یا نہیں؟

مولانا فضل الرحمن اس وقت پاکستان میں واحد متفقہ لیڈر ہے، جس کا ساتھ دینے پر ہی کامیاب داخلی یا خارجی پالیسی بنائی جاسکتی ہے۔

پہلے خارجہ پالیسی کی بات کریں۔ چین کے سوا سب ہمسایہ ملک پاکستان کو نا قابل اعتبار سمجھتے ہیں، اگر ان ممالک کے ساتھ کوئی گفت و شنید یا جرگہ کرنا ہو تو کون سا لیڈر موزوں ہے؟

افغانستان کے ساتھ نسلی یا مذہبی مسئلہ ہے، تو مولانا پختون بھی ہے اور ان کا ہم عقیدہ بھی۔ ایران کے ساتھ مسلکی جنگ ہے تو واحد سنی عالم دین ہے جس کے ساتھ وہ افشت کر سکتے ہیں۔ انڈیا کے ساتھ کشمیر کا مسئلہ ہے تو واحد دینی جماعت ہے جس کیساتھ انڈیا میں ماضی کا سیاسی احترام موجود ہے، شاید آپ کو معلوم ہو کہ مولانا فضل الرحمن گذشتہ کئی سال سے چین کی کمیونسٹ پارٹی کے آفیشل گیسٹ سمجھے جاتے ہیں۔

داخلی محاذ پر متحارب پارٹیوں کو کون قبول ہے؟

مولانا پر نون لیگ، پیپلز پارٹی، ایم کیو ایم غرض سوائے تحریک انصاف کے ہر پارٹی اعتماد کرنے کو یکساں تیار ہے۔ یوں تو تحریک انصاف کے بقول انہوں نے مولانا کی پالیٹکس کو 2013ء کے الیکشن میں ہی ختم کر دیا تھا، تاہم صرف تین سال بعد ہی جب پختونخوا حکومت کو پاک چاناروٹ پہ اعتراض ہوا تو جناب پرویز خٹک، مولانا کے در پر ہی حاضر ہوئے (4 جنوری، 2016ء)

غرض مولانا جیسا ہمہ جہت لیڈر کوئی نہیں جس نے ہر پارٹی کیساتھ پنگا بھی لیا مگر سب کو قابل قبول بھی



ہے۔ مختصر یہ کہ اگر داخلی اور سرحد پار امن پاکستان کی مجبوری ہے، تو مولانا فضل الرحمن اس کیلئے ضروری ہے  
انصاف قاری کے ضمیر پہ چھوڑتا ہوں۔ و تلک عشرة کاملہ

### پس نوشت:

مجھے عمران خان کو لیڈر کہہ کر اس کا مولانا فضل الرحمن سے موازنہ پسند نہیں کہ میرے خیال میں عمران خان لیڈر بننے کے قابل ہی نہیں۔ مگر کیا کریں اس وقت وہ پارلیمنٹ میں تیسری بڑی قوت ہے اور نواز شریف کی اعانت سے ہی سہی (در اصل پیکیج میں) مگر اس کو ایک صوبہ میں مخلوط حکومت مل چکی ہے تو اب اسے قومی لیڈروں میں شمار کرنا ہی پڑے گا۔ اسی پیمانے پر اگر آپ عالمی لیڈران کی فہرست بنائیں گے تو خواہی نہ خواہی، اسرائیل کے نینن یا ہو کو بھی عالمی لیڈر قرار دینا پڑے گا۔

### مولانا فضل الرحمن کی ذات پہ اعتراضات

سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ مولانا کی ذات پہ اعتراضات کی نوعیت کیا ہے؟  
مولانا کی ذات پر زیادہ تر اعتراضات تحریک انصاف کی جانب سے ہوتے ہیں، جن میں تین بڑے  
اعتراضات ہیں: ایک یہ کہ مولانا مالی طور پر کرپٹ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ عمران خان کو یہودی ایجنٹ کہتا  
ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ ہر کرپٹ سیاسی لیڈر کا سا بھی یا محافظ ہے۔

لبرل حلقوں کی طرف سے مولانا پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ مولانا طالبان کی مذمت نہیں کرتا۔  
سیاسی حلقوں کی طرف سے مولانا پہ دو اعتراض ہیں: ایک یہ کہ 17 ویں ترمیم منظور کرائی۔ دوسرے  
امریکی سفیر سے وزیراعظم بنانے کی درخواست کی۔

مولانا کے اپنے شہر کے لوگوں کو دو اعتراض ہیں: ایک یہ کہ مولانا اتنے عرصے اقتدار میں رہا لیکن شہر  
کیلئے کچھ نہیں کیا۔ دوسرے مولانا صرف اپنے خاندان کو آگے لارہا ہے۔

دینی حلقوں کی طرف سے بھی مولانا پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ مولانا نے اب تک نفاذ دین کیلئے کیا کیا؟  
اب ہم نمبر وار ان سارے الزامات کا جائزہ لیں گے۔

### تحریک انصاف کے الزامات:

پہلا الزام۔ ”مولانا مالی طور پر کرپٹ آدمی ہے“

کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ واحد لیڈر ہے جو مالی طور پر کرپٹ نہیں۔ عمران خان کی آف شور کمپنیاں یا اس



کی بہن علیہ خان کے دینی فلیش کا انکشاف تو بعد میں ہوا، مگر رافم نے عرصہ پہلے ہی عمران خان کو مشکوک قرار دیا ہوا ہے۔ ایک پرانا مضمون پیش خدمت ہے، اس کے دلائل کو اپنے ضمیر کی ترازو میں تولیے:

### ظلمت کو ضیا، صرصر کو صبا کیوں بولوں؟

نقار خانے میں طوطی کی صدا کون سنتا ہے مگر میں بساط بھر پاکستانی میڈیا کے دجل و فریب کو عیاں کرتا رہوں گا، جو رات کو دن ثابت کر کے بڑی غلط تاریخ رقم کر رہا ہے۔

فانی آدم زادوں پر کیا تبصرہ، مگر مجھے اپنا موقف سمجھانے ”مجبوراً“ دو سیاسی لیڈروں کا کردار سنو لٹا پڑ رہا ہے۔ آج کل کے محبوب موضوع یعنی ”مالی کرپشن“ کے ذیل میں میڈیا نے کمال محنت سے عمران خان کو دیانتدار ترین جبکہ مولانا فضل الرحمن کو پاکستان کا کرپٹ ترین لیڈر ثابت کر رکھا ہے، جبکہ میرے نزدیک صورت حال برعکس ہے۔

معاف کیجئے! میں میڈیا کے باندھے گھنگھروں پہ ناچنے کو تیار نہیں، دلیل کو شعور کی پہچان گردانتے ہوئے ثابت کروں گا کہ بات اگر مالی کرپشن کی ہے تو عمران خان روایتی، اخلاقی، منطقی، قانونی اور شرعی لحاظ سے اس ملک کا کرپٹ ترین آدمی ہے۔ میری یہ بھی تمنا ہے کہ میرا تجزیہ غلط ثابت ہو، پس ہر اس دوست کے تبصرے سے بخوشی استفادہ کروں گا جس نے اپنی عقل پاکستانی میڈیا کو گروی نہیں رکھ دی ہے۔

روایتی پہلو کے لحاظ سے:

ہماری روایت یہی رہی ہے کہ کسی کا طرز زندگی، اس کی آمدن کے ذرائع سے لگاؤ نہیں کھاتا تو اس کی آمدنی مشکوک سمجھی جاتی ہے۔ عمران خان کا بظاہر کوئی ذریعہ آمدن نہیں۔ تو معلوم نہیں کس مد میں ”غریب عوام کی آخری امید“ کے پاس اسلام آباد میں 300 کنال پہ پھیلا گھر، مختلف شہروں میں پھیلی زرعی زمین ہے، اس کے علاوہ شاہانہ رہن بہن ہے جس میں لاکھوں کے کتے بھی شامل ہیں۔ پراپیگنڈہ یہ ہے کہ عمران خان کو کرکٹ سے جو کچھ ملا، اس نے ہسپتال پہ لگا دیا۔ اور خود دار وہ اتنا ہے کہ جمائما کے باپ سے ایک بیٹی نہیں لی، تو اس از کجاست؟

راندہ درگاہ طبقات کے کئی مسیحا، مہاتما بدھ سے لیکر کارل مارکس تک جدی پشتی جاگیر دار تھے جنہوں نے اپنا سب کچھ تنج دیا تھا۔ عمران خان وہ واحد غریب پرور لیڈر ہے جس کی ظاہر شدہ جائیداد میں تین گھر ہیں (میانوالی، زمان پارک اور بنی گالہ) جس میں وہ تنہا رہتا ہے۔ نظر بظاہر یہ سب کچھ اس مالی کرپشن کی طرف مشیر ہے جس کے بارے میں سابق کارکن پوچھتے رہتے ہیں، مگر وہ طرح دے جاتا ہے۔



دوسری طرف، سوشل میڈیا کے ایکسپٹ ہمیں باور کراتے ہیں کہ مولانا کی صرف بحیثیت پارلیمنٹ ممبر ایک کروڑ روپے ماہانہ مراعات ہیں۔ ایک کروڑ نہ سہی، ایک لاکھ بھی اوسط تنخواہ ہو تو اس کی 18 سالہ پارلیمانی زندگی کے لحاظ سے 2 کروڑ 16 لاکھ بنتی ہے، جس سے اس کا صرف آدھے کنال کا ایک گھر ڈیرہ میں ہے۔ اس کے علاوہ پورے پاکستان یا باہر، نہ اس کا کوئی رہائشی گھر ہے، نہ پلازہ، نہ کوئی اور جائیداد۔ یہ دعویٰ بھی ہے، چیلنج بھی ہے اور اس کی مالی دیانت کا ثبوت بھی ہے۔

اخلاقی پہلو کے لحاظ سے:

عوام اپنا پیٹ کاٹ کر ممبران پارلیمنٹ کو بھاری تنخواہ اور مراعات دیتے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے قانون سازی کا کام کریں (جو گویا ان کی مزدوری ہوئی) عمران خان نے نہ صرف خود بلکہ اپنے 35 ارکان کو 6 ماہ تک پارلیمنٹ کی مزدوری سے روک رکھا۔ مزید برآں باقی پارلیمنٹ کو بھی دیگر ایشوز سے ہٹا کر دھرنے کے فضول ٹاپک پہ مصروف کر دیا۔ اس کے باوجود اپنی غیر حاضری کے دنوں کی پوری تنخواہ و مراعات، غریب عوام کے ٹیکسوں سے وصول ہوتے ماتھے پہ پینت تک نہیں آیا۔ یہ بہر حال مالی کرپشن ہے عمران خان قانونی اور اخلاقی کا فرق بیان کرتا رہتا ہے تو یہ قانونی نہ سہی، مگر اخلاقی کرپشن ضرور ہے اور اس اعزاز میں یہ یکتا لیڈر ہے۔

دوسری طرف، مولانا 1988ء سے پارلیمنٹ کا ممبر ہے، قانون سازی کے نکات پر سب سے زیادہ تفصیلی تقاریر و تجاویز مولانا ہی کی طرف سے آئی ہیں اور پارلیمنٹ کا ریکارڈ گواہ ہے کہ مولانا نے سرکاری امور سے کبھی بلاوجہ غیر حاضری نہیں کی۔ پس اس نے کم از کم اپنی تنخواہ ضرور حلال کی ہے۔

منطقی پہلو کے لحاظ سے:

نمایاں لوگوں پہ لوگ بولتے ہی رہتے ہیں۔ ہر کس ونا کس سے بحث اچھی نہیں، لیکن کوئی آپ کو بلاوجہ رشوت خور کہے جا رہا ہو تو اسے عدالت کھینچ لے جائیں۔ اب یا تو وہ معافی مانگے گا یا پھر آپ پر جو الزام لگایا، اس کا ثبوت دیگا۔ فرض کریں، آپ نے کسی کو عدالت میں ثبوت پیش کرنے کی تزی لگائی، اس نے بخوشی یہ چیلنج قبول کر لیا مگر آپ خود ہی پیچھے ہٹ گئے تو منطقی لحاظ سے آپ نے خود چور ہونا تسلیم کر لیا۔

بعینہ یہی صورتحال ہوئی جب عمران خان کے خلاف خواجہ آصف اور چوہدری نثار نے بھری پریس کانفرنس میں فراڈ کے الزامات لگائے، جس پر عمران خان نے بھی بھری پریس کانفرنس میں ان کو عدالت میں گھینٹنے کا اعلان کیا اور انہوں نے قبول کر لیا۔ یہ عمران خان کو اپنی دیانت ثابت کرنے کا سنہری موقع تھا



مگر وہ خود ہی عدالت سے چھپ گیا۔ یوں منطقی طور پر عمران خان نے خود کو ہی کرپٹ ثابت کر دیا۔ یہ بالکل ایسا ہی سین ہے جیسے اسمبلی میں چوہدری اعتراف اور چوہدری ثار نے ایک دوسرے کی کرپشن کے ثبوت پیش کرنے کی تڑی لگائی اور دوسرے دن ایک دوسرے کو معاف کر دیا۔

دوسری طرف مولانا فضل الرحمن جو گذشتہ 35 سال سے سیاسی میدان میں ہے، اس پر پاکستان کی کسی چھوٹی بڑی عدالت میں کوئی مالی کرپشن کا کیس تک درج نہیں ہوا۔ نہ ریاست کی طرف سے، نہ کسی نجی ادارے یا فرد کی طرف سے۔ ویسے ایک وکیل صاحب نے لاہور ہائیکورٹ میں مولانا پر ایک کیس کر رکھا ہے جس کو مولانا نے کبھی لفٹ ہی نہیں کرائی۔ وہ کیس کیا ہے؟ مولانا نے کبھی کہا تھا کہ امریکہ اگر ایک کتے کو بھی مار دے تو اسے شہید کہوں گا۔ کیس یہ کیا گیا ہے کہ مولانا نے شہید کے رتبے کی توہین کی ہے۔

قانونی پہلو کے لحاظ سے:

دنیا بھر میں وسیعہ معاف گواہی کو قانونی حیثیت حاصل ہے۔ کسی مجرم کا کو لیگ یا پاننراس کے خلاف گواہی دیدے تو اسے قانونی ثبوت کا درجہ حاصل ہے۔ بھٹو کا عدالتی قتل، اس کے باعتماد ساتھی کی گواہی کی بناء کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عاصم چمارا اور پریشر اس لئے ہے کہ وہ زور واری کا کو لیگ ہونے کے ناطے، قانونی ثبوت بن سکتا ہے۔ الیکشن کمیشن کے ایک ممبر پیارے افضل خان کو عمران خان اپنے کنٹینر پر دھاندلی کے ضمن میں ایک ثبوت بنا کر پیش کرتے تھے۔ اب یوں ہے کہ عمران خان کے ایک سابق کو لیگ، تحریک انصاف فرانس کے سابق صدر اکبر ایس احمد نے عمران خان پر چندے میں گرڈ بڑ کا مقدمہ دائر کر رکھا ہے اور عمران خان تاریخ پہ تاریخ لیتے ہوئے اس کا سامنا کرنے سے کترار کیا ہے۔ کسی اور پاکستانی لیڈر کو یہ اعزاز حاصل نہیں کہ اس کے کسی قریبی ساتھی نے یوں برضا و رغبت اپنے لیڈر کی کرپشن کا بھانڈا پھوڑا ہو۔ میرے خیال میں تو عمران خان کی مالی کرپشن پر یہی قانونی ثبوت ہے۔

دوسری طرف مولانا فضل الرحمن کا سابقہ دست راست اعظم سواتی، جو مولانا کو چھوڑ کر عمران خان سے جا ملا اور "میرٹ" پر صوبائی صدر بھی بن گیا، اس نے مولانا کو ایک ذاتی خط میں لکھنے کے علاوہ، ٹی وی پر آکر (کبھی جبر کے پروگرام میں) گواہی دی ہے کہ مولانا مالی معاملات میں بالکل صاف ہے۔

شرعی پہلو کے لحاظ سے:

جوا، سٹہ، قمار بازی کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے مگر شریعت کو اس ملک میں کون پوچھتا ہے؟ میڈیا نے بتایا کہ وزیر اعظم گیلانی کی بیوی لندن میں جوا کھیلتی رہی مگر جناب شاہدین نہ ہوں اور ملزم خود اقراری نہ ہو



تو شریعت کسی کو کیوں مجرم قرار دے؟

سہ کیا ہے؟ فلاں کرکٹ ٹیم جیت گئی، تو آپ اتنے پیسے دو گے ورنہ میں دوں گا۔

اس جرم کا اقرار بزبان خود، عمران خان نے میڈیا پہ یہ کہہ کر کیا کہ یہ تو میرے تجربے کی رقم کمائی ہے۔ یوں شرعی قانون کے لحاظ سے پورے ملکی سیاسی لیڈروں میں سے ”اقراری مالی کرپٹ شخصیت“ کا اعزاز بھی عمران خان کو حاصل ہے۔ دوسری طرف مولانا فضل الرحمن کے متعلق ایسی بات تو عوامی سرگوشیوں میں بھی نہیں چر جائیکہ میڈیا میں یا عدالت میں ہو۔

عمران خان اور مولانا فضل الرحمن کا ایک اور موازنہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں، مگر ہمارے دانشور اینتکر ”بوجہ“ اس طرف نظر کرم نہیں کرتے۔

واقعہ یوں ہے کہ مولانا نے عمران خان کو اپنا لیڈر تو کیا کبھی برابر کا آدمی بھی نہیں مانا۔ جبکہ عمران خان نے سیاسی اتحاد تو کئی لیڈروں سے کئے، لیکن اپنا لیڈر صرف مولانا کو مانا ہے کہ جب 2002ء میں اس نے اپنا وزیراعظم مولانا فضل الرحمن کو قرار دیا تھا۔

اب مولانا، عمران خان پہ الزام لگاتا ہے کہ اسے یہودی لابی فنانس کرتی ہے، جبکہ عمران خان مولانا پر ڈیزل سسٹنگ کا الزام لگاتا ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ عمران خان نے مولانا کو وزیراعظم کے لئے اپنا ووٹ تب دیا تھا جب مولانا پر ڈیزل سسٹنگ کے الزامات کو 6 سال گزر چکے تھے لہذا عمران خان، اس الزام سے خود ہی مولانا کو بری کر چکا ہے۔

دوسری طرف، یہودی ایجنٹ کہنے پر عمران خان نے اگست 2013ء میں مولانا کو قانونی نوٹس بھجوایا کہ معافی مانگو، ورنہ عدالت میں سامنا کرو۔ مولانا نے بخوشی یہ چیلنج قبول کر لیا، مگر عمران خان ہی میدان سے بھاگ گیا، گویا مولانا کی صداقت خود ہی ثابت کر دی۔

گزارش یہ ہے کہ نہ عمران خان سے کوئی ذاتی معاملہ ہے نہ ہی مولانا میرا رشتہ دار ہے۔

قوم کا کوئی لیڈر بھی اگر بددیانت ثابت ہو تو کسی پاکستانی کے لئے اس میں خوشی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ مذکورہ بحث صرف یہ بتانے کیلئے کی گئی کہ میڈیا اپنی ذمہ داری میں ڈنڈی مارتا ہے، تھا تو کو بد لئے والا یہ تعصب اور جانبداری آنے والی نسلوں کا نظام سے اعتبار اٹھا دے گی اور پھر وہ کسی بھی طالع آزمایا کا شکار ہو جائیں گے۔ چاہے وہ کسی جرنیل کی شکل میں ہو یا بیت اللہ محسود کی شکل میں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ آدھا سچ، پورے جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ مضمون ختم ہوا۔

نوٹ: یہ مضمون اس دور کا ہے جب عمران خان کی آف شور کمپنی کا بھانڈا نہیں پھوٹا تھا۔



تحریک انصاف کا دوسرا الزام:

”مولانا فضل الرحمن عمران خان کو یہودی ایجنٹ کہتا ہے“

اس الزام پر میں تحریک انصاف کے ساتھ ہوں مگر اس کا تفصیلی تجزیہ، اسی باب کے آخر میں بعنوان ”مولانا سے میری پہلی اعلانیہ مخالفت“ درج ہے، وہاں پڑھ لیا جائے۔

تحریک انصاف کا تیسرا الزام: مولانا فضل الرحمن ہر کرپٹ لیڈر کا ساتھی ہے۔

تحریک انصاف کی طرف سے یوں تو اس الزام کی ہوا حقائق کی دنیا میں اسی وقت نکل گئی جب صوبہ خیبر پختونخوا میں سینیٹ کیلئے تحریک انصاف نے نون لیگ سے پس پردہ اتحاد کیا اور پانامہ لیکس پر پیپلز پارٹی سے اتحاد کیا۔ تحریک انصاف کی منافقت کے پیش نظر اس الزام پر تبصرہ زیب ہی نہیں دیتا۔ مگر منہ کا ذائقہ بدلنے، ذیل کے مکالمے کا لطف لیجئے:

ایمان والو، ایک ترازو رکھا کرو!

نئے پاکستان کے ایک بزرگ جمہور کی بات سنیں۔

کہنے لگا: تمہارا مولانا، زرداری، نواز شریف سمیت ہر کرپٹ حکمران کا ساتھ دیتا ہے، کیونکہ اس کو پیٹ کا مسئلہ ہے“

عرض کیا: ”ایسے لوگوں کا ساتھ اس لئے دینا پڑتا ہے تاکہ ایک بڑے مقصد کو حاصل کیا جاسکے“

”ہاہاہا! بڑا مقصد! ہاہاہا۔ اور وہ بڑا مقصد کیا ہے جناب؟“

”پاکستان میں امن، معاشی استحکام اور اسلامی قوانین کا اجراء“

”ہاہاہا۔ تو کیا یہ بڑا مقصد حاصل ہو گیا ہے؟“

”پورا تو نہیں حاصل ہو سکا کہ اب تک حکومتی استحکام ہی حاصل نہیں ہو سکا تو مزید پیش رفت کیا ہوگی؟“

لیکن یہ ہے کچھ قوانین جو اہل اسلام کے خلاف تھے ان کا راستہ روکا جا چکا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کو فعال بنا کر وہاں بالغ النظر علما پہنچا دیئے گئے، اور سفر جاری ہے“

”ہاہاہا۔ تم کتنا بھی باتیں بنا لو، مگر ہمیں پتہ ہے مولانا کو صرف اپنے پیٹ کا مسئلہ ہے“

عرض کیا ”آپ نے تین سوال کئے اور میں نے جواب دے دیئے۔ اب میں یہی تین سوال آپ سے کرتا ہوں اور یہ بھی وعدہ کرتا ہوں کہ تہقہہ نہیں لگاؤں گا: یہ بتا کہ تمہارا لیڈر علیم خان، پرویز خٹک، بیہ سٹر سلطان جیسے لوگوں کو ساتھ ملا کر کونسا انقلاب لانا چاہتا ہے؟ اس کو اپنی عیاشیوں کیلئے ڈنڈہ روکار ہیں اور بس“



"ارے نہیں، سلیم بھائی! ایک بڑے مقصد تک پہنچنے کیلئے ایسے اسلیمیلو کا ساتھ ہونا ضروری ہے"

"اور وہ بڑا مقصد کیا ہے؟"

"ایک کرپشن فری نیا پاکستان بنانا جو یورپ اور امریکہ کا مقابل ہو سکے"

"یورپ، امریکہ کی گپ چھوڑو۔ پشاور، لاہور سے پانچ گنا چھوٹا ہے، کیا وہ تین سال میں لاہور کا

مقابل ہو سکا ہے؟"

"کوشش تو جاری ہے نا۔ دیکھئے! گنجے ملک کو کھاکے....."

"چھوڑو یا ریہ بے سری راگنی۔ دراصل، اسکے یہ سارے ڈرامے، ڈھلتی عمر میں سلیم رٹی بننے اور عیاشی

کرنے کیلئے ہیں"

"استغفر اللہ، سلیم بھائی! آپ خود کو دینی آدمی بھی کہتے ہو۔ یوں کسی کی نیت پہ حملہ نہیں کرنا چاہئے"

لبرلز کا مولانا پر اعتراض:

"مولانا طالبان کی مذمت نہیں کرتا"

جمعیت علماء اسلام کی جمہوریت اور دلیل کے ساتھ ازلی کمینٹ کی بناء پر لبرل حلقے مولانا فضل الرحمن کو کوئی بڑا طعنہ دینے کی پوزیشن میں نہیں، تاہم ان کے اندر کی "مٹلا دشمنی" آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ پاکستان میں ابھی خود کش دھماکوں کے ابتدائی دن تھے کہ جامعہ اشرفیہ میں سرکردہ علمائے دیوبند نے دہشتگردی اور خود کش حملوں کو حرام قرار دیتے ہوئے منفقہ فتویٰ الیٹو کیا تھا۔ ہمارا میڈیا اگر پاکستان سے مخلص ہوتا تو اس اجلاس کی خبر اخبار کی ہیڈ لائن بننا چاہئے تھی مگر آپ جانتے ہی ہیں کہ میڈیا، علما کو پذیرائی دینے کو تحمل نہیں ہو سکتا۔ بہر حال، باچہ خان یونیورسٹی پر دہشت گردی ہوئی تو ایک بار پھر لبرل حلقوں نے علماء کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس پر راقم نے درج ذیل مضمون لکھا تھا، جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

چھٹتا نہیں ہے منہ پہ یہ "ملا" لگا ہوا:

بعض احباب اسلامک سیکولرزم کی اصطلاح استعمال فرماتے ہیں۔ خاکسار حیران ہے کہ کیا سیکولرزم اور اسلام الگ الگ چیزیں ہیں؟ سیکولرزم، سوشلزم اور جمہوریت پسندی، بنیادی انسانی صفات ہیں، جن کا درجہ کمال دین اسلام ہے۔

مگر دلیل کی بجائے، دھونس کا استعمال کرنے والے مذہبی طبقہ میں ہی نہیں، سیکولر احباب میں بھی موجود ہیں۔ میں ان کو لبرل فاشٹ کا نام دیتا ہوں۔ سچا سیکولر کسی کی مدح و ذم میں عدل کا دامن ہاتھ سے



نہیں چھوڑتا۔ اگر آپ دہشت گرد مذہبی جنونیوں کی مذمت کرتے وقت معتدل علماء کا فرق روا نہیں رکھتے تو آپ میں فاشزم کے جراثیم موجود ہیں۔

ایک طرف لبرل فاشسٹوں کا دعویٰ ہے کہ فی زمانہ مللا کے پاؤں تلے سے زمین نکل چکی ہے۔ دوسری طرف ہر انفرادی یا اجتماعی جرم کے بعد یہ دہائی دیتے ہیں کہ اس کا ذمہ دار مولوی ہے۔ بازار میں مہنگائی بڑھ جائے، کسی لڑکی کا ریپ ہو جائے، کوئی زمیندار مزارع پر کتے چھوڑ دے، غرض کچھ ہو جائے تو لبرل فاشسٹوں کا ٹیپ کا مصرعہ یہی ہوتا ہے کہ مللا اس کی مذمت کیوں نہیں کرتے؟ یعنی ایک طرف تو ملا کی کوئی حیثیت نہیں مانتے اور دوسری طرف بزبان حال یہ اقرار کہ اس ملک کی 26 خفیہ ایجنسیاں، لاکھوں سیکورٹی اہلکار اور جدید ایٹمی اسلحہ بشمول لبرل دانشوروں کے زیر کنٹرول نیشنل اور سوشل میڈیا، ملا کی مدد کے بغیر کسی کام کے نہیں ہیں۔

خیر! چار سہہ میں حالیہ دہشت گردی کو مثال بناتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ ایسے واقعات کے تناظر میں قوم اپنے سیاسی مذہبی رہنماؤں سے مندرجہ ذیل تین باتوں کی توقع رکھتی ہے (اگر کوئی چوتھی بات ہو تو خاکسار کے علم میں بھی اضافہ کیا جائے)

ایک یہ ہے کہ اس درندگی کی پرزور اور واضح الفاظ میں مذمت کی جائے۔

دوسرے، لگی لپٹی رکھے بغیر اس واقعہ کے ذمہ داران کا نام لیکر ان کی مذمت کی جائے۔

اور تیسرے، اس دہشت گردی کی وجوہات پر قوم کو گامیڈ کیا جائے۔

یہی تین مطالبے، علمائے کرام سے بھی ہیں (جن کا سیاسی چہرہ، مولانا فضل الرحمن ہے۔)

اب جہاں تک پہلی وجہ، یعنی اس وحشت کی "پر زور مذمت" کا تعلق ہے تو وہ، علماء نے بھی اسی طرح کی ہے، جس طرح سوسائٹی کے ہر طبقہ فکر نے کی۔ البتہ "پر زور" چونکہ صرف میڈیا کے زور پہ نظر آتا ہے تو لبرلز کا "پر زور" تو دکھائی دیتا ہے مگر علما کا "پر زور" نہیں دکھائی دیتا۔ ورنہ چار سہہ حادثے پر پہلے پہنچنے والوں میں نواز شریف، عمران یا اسفندیار نہیں، بلکہ مولانا فضل الرحمن اور خورشید شاہ تھے، اور ہاں ایم کیو ایم کا وفد بھی تھا۔

لیڈروں اور علما سے، عوام کی دوسری توقع ہے کہ قاتلوں کا نام لیکر مذمت کریں۔ لیڈر تو مذمت ہی کر سکتے ہیں، قاتلوں کو پکڑنا اور سزا دینا دوسروں کا کام ہے۔

اب صورتحال یہ ہے کہ اس حادثے (بلکہ کسی بھی ایسے حادثے کے) دو فریق ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ایک حملہ آور دہشگرد، اور دوسرے وہ ادارے جن کو عوامی بجٹ سے عوام کی سیکورٹی کیلئے تنخواہ ملا کرتی ہے۔



انصاف کا تقاضہ ہے کہ فریق اول کی نام لیکر مذمت اور فریق دوم کی گوشمالی کرنا چاہئے۔  
لبرل حضرات سے یہ توقع نہیں کہ فریق دوم کی شان میں بے ادبی کریں (یہ کام صرف فضل الرحمن کی جماعت کو کرنا پڑتا ہے)، البتہ لبرل حضرات، فریق اول یعنی پاکستانی طالبان، ملا فضل اللہ وغیرہ کو باقاعدہ نام لیکر گالی دیتے ہیں، چونکہ اس گالی دینے میں علماء ان کے ساتھ تان نہیں ملاتے، پس یہ ان کو بزدلی، یا ”اگر مگر“ پالیسی کا طعنہ دیتے ہیں۔

حضور! ہم ضرور نام لیکر گالی دیتے، اگر ہمیں معلوم ہو کہ فریق اول ہے کون؟ کیونکہ جو لوگ اس قتل و غارت کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں، وہ صرف جنرل صاحب کو فون کرتے ہیں (ویسے سنا ہے کہ جس موبائل سے فون کیا جائے، اس کی لوکیشن معلوم ہو جایا کرتی ہے) وہ اپنی ویڈیو وغیرہ بھی ان کو بھی بھیجتے ہیں۔

بہر حال، لبرل حضرات! جناب باجوہ پہ اعتبار کر کے ان کے بتائے ناموں کو گالیاں دیتے ہیں۔ اب چونکہ طالبان کے فون کو کسی غیر جانبدار گواہ نے سنا نہیں اور جناب باجوہ کی گواہی کو ہم قابل اعتبار نہیں مانتے (کیونکہ یہی لوگ پہلے مسٹر بش کے خیالی ٹیلیفون پر پورا ملک امریکہ کے حوالے کر بیٹھے تھے) تو پھر ہم ان لوگوں کے پڑھائے نام نہیں لے سکتے، چاہے آپ اسے ”اگر مگر کی پالیسی“ کہویا ”گلی لپٹی کہنا“ بولو۔  
عوام بجا طور پر اپنے رہنماؤں سے یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ آئے روز کی خونریزی کی وجوہات ان کو بتائی جائیں۔ منطقی بات ہے کہ اس موضوع پر ایک کھلا قومی مکالمہ ہونا چاہئے۔

یہ ہے وہ موقف جو لبرلز کو بہت تکلیف دیتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے خود ہی جج بن کر، دینی مدارس کو دہشت گردی کی وجہ قرار دے رکھا ہے۔ علماء جواب میں یہ نہیں کہتے کہ آپ غلط ہو یا صحیح۔ وہ کہتے ہیں، آنا کہیں مل بیٹھ کر، اس پر ایک سیمینار رکھ لیں، تاکہ دلیل پہ بات ہو جائے۔

مئی 2011 میں پارلیمنٹ کا ایک ”ان کیمرہ سیشن“ یاد کیجئے۔ ایبٹ آباد میں امریکی آکر ہماری منجی تھلے ڈانگ پھیر چکے تھے (اسلئے کہ دنیا کی نمبر ایک ایجنسی کو جنرل پاشا نے اپنے کام سے ہٹا کر، سیاسی جماعت بنانے پہ لگا رکھا تھا) بہر حال اس سیشن میں جنرل پاشا اور ممبر قومی اسمبلی مولانا عطاء الرحمن الجہ پڑے تھے، جب دوران میںنگ مولانا عطاء الرحمن نے مطالبہ کر دیا کہ لگے ہاتھوں آج اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ طالبان کس نے تیار کئے تھے؟

بس جناب! یہ مکالمہ لبرلز کرنے کو تیار نہیں، کیونکہ اس میں پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔  
خیر، چار سذہ جیسے واقعات تو کسی تکفیری گروہ کی بھی کارستانی نہیں لگتے، بلکہ اس ”پراکسی وار“ میں کچھ ”بڑے کھلاڑیوں“ کا ہاتھ ہو سکتا ہے لیکن میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ معلوم مذہبی شدت پسند اور اسلحہ



بردار گروہوں کو بہر حال، مدارس سے افرادی قوت میسر آئی مگر اس فرق کے ساتھ کہ مدارس، دہشت گردی کی نرسری نہیں ہیں، البتہ مارکیٹ ضرور ہیں۔ اس لئے کہ اس ملک میں عام آدمی کو اسلام کے نام پر ورغلا یا جاسکتا ہے۔ جس طرح "پاکستان کا مطلب کیا؟" "لا الہ الا اللہ" والا نعرہ لگا کر، 6 لاکھ ہندوستانی مہاجرین مروائے گئے (تو دینی مدارس، بہر حال زیادہ اسلام پسند ہوتے ہیں)

دہشت گردی کی نرسری کرنے والے ایسے ادارے ہوتے ہیں کہ پاکستانی میڈیا ان کی جیب میں ہوتا ہے۔ علمائے حق کی بات، نہ ماضی میں کوئی سنتا تھا، نہ اب سنتا ہے، نہ آئندہ کبھی سنے گا (اور اس لئے ہم آخرت کا یقین رکھتے ہیں کہ وہاں کھراکھوٹا الگ ہو جائے گا اور مومن، اپنی مساعی کا بدلہ پائے گا، ان شاء اللہ) بریگیٹیں تذکرہ عرض ہے کہ علمائے دیوبند کے اسلاف نے مدارس کو اسلحہ تو کجا، سیاست کا گڑھ بھی کبھی نہیں بنایا تھا۔ بعض بزرگوں کے ذاتی اختلافات سے قطع نظر، عرض کرتا ہوں کہ خود مدنی احباب کے مدارس کے طلباء بھی سیاسی تحریکوں کے دوران صرف پڑھائی پہ یکسو رہتے تھے (تھانوی تو گوشہ نشین تھے ہی) مرور زمانہ سے آج جبکہ سیاست ہر چھابڑی فروش کے خون میں بھی گھس گئی، تو طلباء بھی متاثر ہوئے اور ان کے سیاسی مہتمم صاحبان، بجائے ان کی حوصلہ شکنی کرنے کے، حوصلہ افزائی کرنے لگے۔

آپ مولانا فضل الرحمن کی کاوشوں اور بصیرت کی داد دیں گے کہ وہ مدارس جو مورچے بن چکے تھے، ان کو مولانا واپس اعتدال، دلیل اور کشادہ دلی کی طرف لا رہے ہیں، مگر اس ٹھنڈے موقف میں ان کو خود مدارس کے نوجوان طلباء کی پوری تائید نہیں مل رہی۔ جب لبرل صاحبان ہر وقت "ملا" کو خواہ خواہ نوک و دشنام پہ رکھیں گے تو اعتدال پسند علماء کا کام مشکل تر ہوتا جائے گا۔ نوجوان خون ہر وقت کے بلاقص طور طعن تو باپ کے بھی برداشت نہیں کرتا۔ شاید لبرل صاحبان اپنے رویے سے ملک میں قصد ایسی آگ لگانا چاہتے ہیں جس کی بناء پر وہ یورپ میں سیاسی پناہ کے ویزے لے سکیں۔

دیکھئے! صرف پنجاب میں رجسٹرڈ دیوبندی مدارس 13600 ہیں جن میں نوجوان طلباء کی کم از کم تعداد 3 لاکھ بنتی ہے۔ نوجوانوں کے اتنے بڑے طبقے کا خون کھولاتے رہنا شاید بہتر نتیجہ نہ دے سکے۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ مدارس بند کرنے سے یہ طبقہ ختم ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں شاید یہ نوجوان، الطاف بھیا کے ہاتھ چڑھ کر بوریاں بنانے لگیں۔ بس! کچھ نہ سمجھ خدا کرے کوئی۔

مضمون ختم ہوا۔



## سیاسی حلقوں کے الزامات:

پہلا الزام: ”مولانا فضل الرحمن نے 17 ویں ترمیم منظور کرائی“  
 اسمبلی برخاست کرنے کی آئینی ترمیم صدر ضیاء الحق نے آئین میں گھسیڑی تھی جس کی رو سے، صدر مملکت کو اسمبلی توڑنے کا اختیار حاصل تھا۔ صاف ظاہر کہ اگر عوام کے منتخب نمائندوں کی اسمبلی کو ایک فرد واحد اپنی مرضی سے گھر واپس بھیج سکتا ہے تو اس میں اور مارشل لا میں کیا فرق ہے؟ یہ ترمیم جمہوریت کی روح کیخلاف تھی۔ 1997ء میں جب نواز شریف دو تہائی اکثریت سے وزیراعظم بنے تو آٹھانا صدر لغاری کو سوچنے سمجھنے کا موقع دیئے بغیر اسے آئین سے ختم کر دیا، گویا آئین کی اصل روح بحال کر دی۔  
 پھر یوں ہوا کہ 2002ء کے الیکشن میں ایم ایم اے نامی 6 دینی جماعتوں کے اتحاد کو فیصلہ کن اکثریت مل گئی اور انہوں نے پرویز مشرف سے وردی اتارنے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ان کا خیال تھا اور درست خیال تھا کہ سویلین پرویز مشرف ترنوالہ ثابت ہوگا (جیسا کہ بعد میں ہوا) اس بات کا ادراک پرویز مشرف کو بھی تھا۔ پس قاف لیگ کے ذریعے پنجاب اسمبلی سے قرارداد منظور کروالی کہ یونیفارم میں صدر قبول ہے۔ جب اپوزیشن کا پریشر بڑھ گیا تو اس نے وردی اتارنے کو سترہویں ترمیم کی منظوری سے مشروط کر دیا۔ ایم ایم اے نے اس شرط پہ یہ ڈیل منظور کر لی کہ صدر ٹی وی پر آکر قوم کے سامنے یہ وعدہ کریں، جو اس نے قبول کر لی۔ مگر جنرل پرویز مشرف یہ اختیار حاصل ہونے کے بعد قوم سے کئے گئے اپنے وعدے سے پھر گیا۔

اس پر پیپلز پارٹی اور نون لیگ نے ایم ایم اے کو غیر جمہوری شق منظور کرانے پر مطعون کرنا شروع کیا۔ صاف ظاہر ہے کہ اس فیصلے کی ذمہ داری پوری ایم ایم اے پر آتی ہے، نہ کہ صرف مولانا فضل الرحمن پر۔ مگر قاضی حسین احمد نے اپنی غلطی کی معافی مانگ کر گویا سارا ملہ مولانا پہی ڈال دیا۔ اس معافی کے موضوع پر خاکسار نے ایک مضمون لکھا تھا۔ پہلے آپ وہ پڑھ لیں پھر اگلی بات عرض کروں گا۔

## کی میرے قتل کے بعد، اس نے جفا سے ”سوری“۔

انگریزوں کی دیگر دلچسپ ایجادات و اختراعات کی طرح یہ لفظ ”سوری“ بھی ہے۔ گاڑی کی ٹکر مار کر کسی کا کباڑہ کر دیا، پھر ذرا سا شیشہ نیچے کر کے ہلکی سی ”سوری“ اچھال دی۔ اور اگر مضروب غریب ابھی ابھی تک ٹکڑ ٹکڑ دیکھ رہا ہے تو تیوری چڑھا کر بولے ”سوری تو کہہ دیا ہے، اور کیا چاہتے ہو؟



فی الوقت خاکسار نے پاکستان کی کچھ مشہور سیاسی "سوریوں" کی خانہ بندی کی ہے، جو پیش خدمت ہیں

### "بتاہی" سوری.....!!!

تحریک استقلال کے سربراہ انیر مارشل اصغر خان اپنے زمانے میں بھٹو کے مقابل سب سے مقبول پڑھے لکھے لیڈر تھے۔ (ہائے، یہ پڑھا لکھا ہونا) موصوف نے باقاعدہ اخبارات میں اشتہار دے کر فوج کو مارشل لاء لگانے کی دعوت دی اور پھر اس ملک کو "جنرل ضیاء" لاحق ہو گیا۔ گیارہ سال بعد جب پاکستان کی ایک پوری نسل "زومی" بن چکی تھی تو جناب اصغر خان نے قوم سے مارشل لاء لگوانے پر "سوری" کیا۔ جنرل پرویز مشرف کے دس سالہ اقتدار میں پاکستانی یا تو مولیٰ گاجر کی طرح کاٹے گئے یا کباڑ کی مانند بیچے گئے۔ جنرل صاحب کے ریفرنڈم میں شانہ بشانہ شریک ان کی اسمبلی میں 5 سال کچھ کام کئے بغیر تنخواہ پانے والے تحریک انصاف کے سربراہ عمران خان نے بھی ڈکٹیٹر کا ساتھ دینے پر قوم کو "سوری" کیا۔ آج کل اصغر خان صاحب نے اپنی "تحریک استقلال" کو "تحریک انصاف" میں مدغم کر دیا ہوا ہے۔ "نشہ بڑھتا ہے، شرابیں جو شرابوں میں ملیں"۔ یادش بخیر! طاہر القادری کی پاکستان عوامی تحریک اور متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) بھی جنرل صاحب کی خوشہ چیں رہی تھیں۔

برسبیل تذکرہ، پاکستان میں درجنوں سیاسی اور مذہبی جماعتیں ہیں مگر ایک نشانی یاد رکھئے! ہر وہ سیاسی پارٹی جس کے نام میں "تحریک" کا لفظ ہو، وہ کسی "اور" کی تحریک پہ بنی ہوگی۔ اسی طرح، ہر وہ مذہبی جماعت جس کے نام میں لشکر وغیرہ ہو، وہ ضرور کوئی "لشکر زادی" بنی ہوگی۔ چاہے وہ لشکر طیبہ ہو یا لشکر

Rights of محمد ہوا یا اپنی نورس وغیرہ

by ٹیم آف ایڈیٹرز  
Team OFFICIAL

سوری کی یہ عجیب قسم، محترم الطاف بھائی کی ایجاد کردہ ہے۔ ویسے تو وہ اپنی "رات گئے" کی ہر تقریر کے بعد، اگلے دن معافی مانگا کرتے تھے۔ لیکن یہ ایڈوانس سوری والا بیان کچھ یوں تھا، فرمایا "میرے پاس ثبوت نہیں ہیں، لیکن کپی خبر ہے کہ اسفندیار ولی نے انڈیا سے 23 لاکھ ڈالر لئے ہیں۔ اگر اسفندیار ولی یہ مان لیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں معذرت کر لوں گا۔"

"گوگو" سوری

یہ معافی ایم ایم اے دور کی ہے، جس میں متحدہ مجلس عمل نے جنرل پرویز مشرف کو 17 ویں ترمیم کا اختیار دیا۔ 17 ویں ترمیم کے تحت، صدر کو اسمبلی برطرف کرنے کا اختیار تھا۔ اس زمانے میں اپوزیشن



پارٹیوں کا ایک ہی نعرہ تھا کہ صدر "وردی" اتارے (کیونکہ ان کے خیال میں سولین صدر کو قابو کرنا آسان تھا) پرویز مشرف بھی بچ نہیں تھا، اس لئے وردی کو اپنی کھال قرار دیتا تھا۔ مولویوں نے اپنے تئیں چال چلی کہ وردی اتار دو، بھلے اسمبلی توڑنے کا اختیار لے لو۔ اسی ڈیل کے تحت اس نے پہلے ٹی وی پر آ کر بیان دیا کہ 31 دسمبر کو وردی اتار دوں گا۔ ایم ایم نے جونہی 17 ویں ترمیم منظور کر لی، کمانڈو اپنے وعدے سے پھر گیا۔ خیر! اس پر ایم ایم اے نے "گوگو" والی سوری کی۔ یعنی ایک لیڈر قاضی حسین احمد نے 17 ویں ترمیم منظور کرانے پر قوم سے معافی مانگ لی جبکہ دوسرے لیڈر مولانا فضل الرحمن نے صاف انکار کر دیا۔ "کس چیز کی معافی.....؟ دھوکہ دینا جرم ہے، دھوکہ کھانا تو جرم نہیں۔ ایک آدمی 20 کروڑ عوام کے سامنے وعدہ کر کے پھر گیا تو وہ معافی مانگے، ہم کیوں معافی مانگیں؟

### "ڈھیٹ" سوری

یہ کریڈٹ عمران خان کو جاتا ہے کہ اس نے اپنی پارٹی میں الیکشن کرائے، جس میں دھاندلی ہوئی۔ خان نے اس پر جسٹس وجیہ الدین کی سربراہی میں کمیشن بنایا جس نے چند لوگوں کو نام لے کر ووٹ خریدنے اور دھاندلی کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ان میں علیم خان، جہانگیر ترین وغیرہ کے نام تھے۔ اس پر خان نے کارکنوں سے معافی مانگی اور وعدہ کیا آئندہ ایسے نہیں ہوگا۔ ساری منتخب کمیٹیاں ختم کر دیں اور پھر۔۔۔ ایک کور کمیٹی بنا کر۔۔۔ اس میں انہی نامزد مجرموں کو پارٹی کا کرتا دھرتا بنا کر خود جسٹس وجیہ صاحب کی ہی رکنیت معطل فرمادی۔ یہ شاید، "سوری" کرنے کی سب سے ڈھیٹ قسم ہے۔

### "قومی" سوری

ہمارے "بروفوجی دانشور" دور دور کی کوڑیاں لا کر ہمیں سمجھا رہے تھے کہ بنگلہ دیش تحریک کے دوران، پاک فوج سے منسوب مظالم "را" کی پھیلائی جھوٹی داستانیں ہیں۔ مگر ہوا یہ کہ صدر پرویز مشرف نے ڈھاکہ جاکر ان مظالم پر "قومی" معافی مانگ لی اور "جنگ آزادی کے شہداء" کی یادگار پر پھول بھی چڑھا آئے۔ بنگالیوں نے ہماری اس "قومی سوری" کو اقرار جرم کی دستاویز بنا کر جماعت اسلامی کے کئی لیڈروں کو پھانسی چڑھا دیا۔ اس طرح پرویز مشرف فخر سے یہ کریڈٹ لے سکتا ہے، وہ صرف نئے پاکستانیوں کے ہی نہیں، پرانے پاکستانیوں کے خون میں بھی شریک ہے۔

### "سوری" تیرے کتنے روپ:

عمران خان صاحب نے "سوری" کو کئی روپ عطا فرمائے، مثلاً عدالت نے لفظ "شرمناک" پر



معافی مانگنے کو کہا تو فرمایا "شرمناک کا معنی شرمندہ تھا۔" نجم سیٹھی کو سال بھر چور کہا، پھر سوری کرنے کی بجائے اسے "سیاسی بیان" قرار دیا۔ صحافی کو جھڑکنے پر معذرت کرتا پڑی تو اسے "ٹینشن" قرار دیا۔ میانوالی کے لوگوں کو زمین دینے کی دھمکی پر پچھتا تا پڑا تو فرمایا "یہ تو مذاق تھا" یہ لسٹ بڑی لمبی ہے لیکن جو شخص، انگلی اٹھنے کے بیان کی وضاحت میں، "اللہ" کو "ایمپائر" قرار دے سکتا ہو، اس کی سوری فوراً قبول کرنا چاہئے۔

### "فوجی" سوری

امریکیوں نے سلالہ چیک پوسٹ پر ڈرون حملہ کر کے، ہمارے درجنوں فوجی جوان مار دیے۔ اس پر آرمی چیف نے فوراً "نیٹو سپلائی بند کر دی اور امریکہ سے معافی مانگنے کا مطالبہ کیا (فوج کے ساتھ کوئی بھی ایسا حادثہ، جس کو "لائٹ" لینے پر، عام فوج میں تشویش پھیلے، اس پر جرنیل صاحبان فوراً ایکشن لیتے ہیں کیونکہ عام فوجی کو مطمئن رکھنا بہت ضروری ہے، باقی آپ سمجھدار ہیں۔

امریکیوں نے معافی تو نہ مانگی البتہ کچھ مہینے ڈراے کرنے کے اجازت دینے کے بعد، سختی سے سپلائی بحال کرنے کو کہا۔ اب جرنیل صاحبان نے پارلیمنٹ سے کہا کہ آپ سپلائی کھولنے کی اجازت دیں (تاکہ بے غیرتی کی یہ کالک سیاسی لیڈروں کے سر منڈھی جاسکے) مگر مولانا فضل الرحمن نے یہ کہہ کر رنگ میں بھنگ ڈال دیا کہ "جب پارلیمنٹ سے سپلائی روکتے وقت نہیں پوچھا گیا تو کھولنے وقت کیوں پوچھا جائے؟" یوں تو ان دنوں بھی مولانا پر خود کش حملہ ہوا لیکن پھر بھی یہ قرار داد ایجنڈے پر نہ آسکی۔

خیر! ایک دن میڈیا نے یہ خوشخبری سنائی کہ امریکہ نے "سوری" کہہ دیا ہے اور اسکے ساتھ ہی نیٹو سپلائی بحال ہوگئی۔ طرفہ تماشا یہ ہوا کہ ہفتے بعد، ہٹلری کنشن کا بیان آیا کہ ہم نے کوئی معافی نہیں مانگی، ہم نے صرف پاکستانی فوجیوں کی اموات پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ہور چو پو  
قارئین! "سوریاں" تو بہت ساری ہیں لیکن ایک صفحہ پر ساریاں سوریاں نہیں سمیٹی جاسکتیں لہذا "سوری" مضمون ختم ہوا۔

اب بات یہ ہے کہ پیپلز پارٹی اور نون لیگ، مشرف سے پہلے دو دو بار اقتدار میں آئے۔ اگر صدر کا اسمبلی توڑنے کا اختیار غیر جمہوری تھا (اور واقعی غیر جمہوری تھا) تو اس شق کو ان دونوں نے اپنے ادوار میں کیوں ختم نہ کرایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں بڑی جماعتیں اسی ترمیم کی آڑ میں صدر کے ساتھ ساز باز کر کے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا کرتی تھیں۔ یعنی ان کا درد دل، جمہوریت کیلئے ہرگز نہیں تھا۔



یہ کریڈٹ پیپلز پارٹی کو جاتا ہے کہ پہلی بار جب نواز شریف نے اس شق کو ختم کرنے کی سنجیدہ کوشش کی تو بے نظیر بھٹو نے اپوزیشن لیڈر ہونے کے باوجود اس کا ساتھ دیا اور دوسری بار، صدر زرداری کی عظمت ہے کہ از خود، آپ نے اس اختیار کو ختم کر دیا، ورنہ کسی نے مطالبہ تک نہیں کیا تھا۔ غور کیجئے، آج کے دور میں کون اپنے اختیارات سے دست بردار ہونا پسند کرتا ہے؟

دوسرا الزام: ”مولانا نے امریکی سفیر سے وزیراعظم بنانے کی درخواست کی“  
یہ الزام وکی لیکس میں آیا تھا اور ہم سرے سے ”لیکس“ کو مانتے ہی نہیں۔ دیکھئے، انگریزی کے دو لفظ ہیں۔ ایک ”لیکس“ اور دوسرا ”پرفس“۔ لیکس کہتے ہیں کہ بے سند خبر کو جو سرگوشیوں میں چلے مثلاً فلاں دفتر سے یہ خبر نکلی ہے۔ نہ تو اس خبر کا کوئی سورس ہوتا ہے، نہ اس کا ثبوت اور نہ بعد میں کوئی ذمہ داری لیتا ہے۔ جیسے عمران خان نے خبر ”لیک“ کی تھی کہ اس کے پاس نجم سیٹھی کی آڈیو ٹیپ موجود ہے۔ چار ماہ تک نوجوانوں کا خون کھولانے کے بعد جب جوڈیشل کمیشن نے ”پروف“ مانگا تو فرمایا کہ یہ تو میں نے نعیم الحق سے سنا تھا اور اس نے فلاں فلاں سے اور آخر میں یہ کہ فقط سیاسی بیان تھا۔

بہر حال وکی لیکس کی اس ”لیک“ کے بارے بھی ایک مضمون آپ کی نذر..... ملاحظہ فرمائیے!

### وکی لیکس اور ہاتف غیبی

ہمارے اہل تشیع دوستوں اور تبلیغی بھائیوں میں ایک چیز مشترک ہے، وہ ہے ہاتف غیبی۔  
ہمارے دوست جب میدانِ کربلا کا سماں باندھتے ہیں تو ہر مکالمہ ”آواز آئی“ سے شروع ہوتا ہے۔  
کس کی آواز؟ کوئی پتہ نہیں۔ اصحابِ تبلیغ کا بیان اکثر اس ترکیب کے گرد گھومتا ہے کہ ”فرمایا“ کس نے فرمایا؟ یہ مباح کے ذوق پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔  
امریکی دوستوں نے مسلم معاشروں کو متزلزل کرنے کیلئے اسی طرح ”وکی لیکس“ نام کا شوشہ چھوڑا تھا جو طلسمی آوازوں کا جنگل تھا۔ اگرچہ یہ نوٹنکی مارکیٹ نہ ہوسکی، مگر ہمارے ”ویسی بھائی“ بہر حال مغربی میڈیا کو کوئی کا درجہ دیتے ہیں۔

ہوایوں کہ پچھلے دنوں ہمارے ایک انقلابی دوست متمتاتے چہرے کے ساتھ وارد ہوئے کہ میں آپ کے لیڈر کے خلاف انٹرنیشنل حوالہ لایا ہوں۔ انہوں نے وکی لیکس کے حوالے سے ”انکشاف“ کیا کہ مولانا فضل الرحمن نے امریکی سفیر سے کہا تھا کہ انہیں وزیراعظم بنا دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی حسب فطرت گالی گلوچ کا تزکہ بھی لگایا۔ میں نے عرض کیا: بھائی! ان جناتی بے سروپا حوالوں کی بجائے کوئی ایسا



حوالہ دیا کرو جسے کسی معقول محفل میں کم از کم سنجیدہ تو لیا جاسکے۔

میں نے عرض کیا "بھائی! میں دیسی آدمی ہوں، میرے ساتھ دیسی مناظرہ کرو۔ مجھے انٹرنیشنل حوالوں، تمغوں اور مناصب سے مرعوب مت کرو، صدر ادا باما کا نوبل انعام اور شرمین عید آسکر ایوارڈ میری جوتی پر، میں یہاں گھر کی گواہی دوں گا، آپ بھی مجھے گھر کی گواہی لا دو۔ یہیں طرف پیمائی کا میدان سجالتے ہیں۔ میں نے عرض کیا "کوئی تحریری گواہی لاؤ، سوشل میڈیا کی جعلی رپورٹیں نہیں کہ یہ ہر لونڈا لپاڑہ بنا سکتا ہے۔ مجھے عالمی اداروں کی لیکس تو کیا خبروں کا رعب بھی مت دو کہ مجھے پتہ ہے انٹرنیشنل جرنلزم میں کس طرح پیپر ز شائع کروا کر، پی ایچ ڈی کی ڈگری لی جاتی ہے۔ مجھے تو پاکستان کے لوکل قلم کاروں کی تحریر دکھا، جن کو میں گردن سے پکڑ سکوں۔ مگر اخباری کالم یا ہفتہ واری جرائد نہیں کہ یہ وقتی چیزیں ہیں۔ مجھے کتاب کا حوالہ دو کہ کتاب کی گواہی زندہ رہتی ہے۔

میں نے کہا "کتاب لا، مگر بے نام و نسب مصنف کی نہ ہو یا کسی بوٹ پاشی افسانہ نگار کی فاتح جیسی نہ ہو۔ ایسی کتاب لاؤ جس کا مصنف خاندانی ہو، قلم کو "پیشہ" نہ بنایا ہو۔ جمہوری تحریکوں کا گواہ ہی نہیں بلکہ خود اس میں حصہ لے چکا ہو۔ حکومتی اعلیٰ مناصب پہ فائز رہ چکا ہو اور مولانا فضل الرحمن کی پارٹی سے کوئی تعلق نہ ہو کہ اسے غیر جانبدار گواہی کہیں گے"

میں نے مزید کہا "کتاب میں جس واقعہ کا حوالہ ہو، اس کے سارے کردار زندہ ہوں، جن سے توثیق کرائی جاسکتی ہو۔ میں آپ کو کوئی لیکس کا نہیں بلکہ ایک ایسی ہی کتاب کا حوالہ دیتا ہوں۔ ایسی کتاب جو پاکستان میں چھپی ہے، عام دستیاب ہے۔"

پھڑک گئے۔ "کوئی کتاب ہے؟ مصنف کون ہے؟"

میں نے ان کو کتاب پیش کی "تحریک بحالی جمہوریت" جس کے مصنف جسٹس سید افضل حیدر ہیں، جو وفاقی وزیر قانون رہے ہیں اور جمہوریت کی خاطر ان کی 50 سالہ جدوجہد ریکارڈ پر ہے۔ ان کے بیان کردہ واقعہ کا دوسرا کردار، پاکستان کی خفیہ ایجنسی کے مالی امور کا نگران جرنیل ہے اور کتاب پہ دیا چہ لکھ کر تصدیق کرنے والی محترمہ عاصمہ جہانگیر جیسی سیکولر مگر عالمی شہرت یافتہ ہیومنسٹ ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ کتاب بھی موجود اور تینوں کردار بھی زندہ ہیں۔

اس کو کہتے ہیں "ریفرنس" دینا

جسٹس سید افضل حیدر، کتاب کے صفحہ 77 پر لکھتے ہیں کہ: آئی ایس آئی کے مالی امور کے نگران، جنرل نصرت سے ایک بار میں نے پوچھا کہ پاکستان میں کوئی ایسا سیاستدان بھی ہے جس نے ایجنسیوں



سے رقم نہ لی ہو۔ جنرل صاحب نے کہا کہ صرف ایک، وہ ہے مولانا فضل الرحمن۔ میں نے کہا: میرے عزیز! اس کو کہتے ہیں ریفرنس دینا۔ حوالے کی لیکس کے نہیں چلتے۔ زندہ، سنجیدہ اور ذمہ دار گواہوں کے چلتے ہیں۔ اور یہ کتاب 2007ء میں لکھی گئی۔ اب اس وقت موجود سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کو جنرل صاحب سے پوچھنا چاہئے کہ صرف ایک کا نام کیوں لیا؟ کیا باقی بکاؤ مال تھے؟ موصوف تک تک دیکھنے لگے: ”کیا آپ کے خیال میں امریکی سفیر نے جھوٹ بولا ہے؟“ عرض کیا: ”میرے عزیز! پہلے تو یہ پتہ نہیں کہ اس نے بولا بھی ہے یا نہیں؟ کیوں کہ وہ ابھی زندہ ہے، اس سے تو کسی نے جا کر تصدیق کی نہیں۔ لیکن بھائی! امریکی انکشافات تو حکومتی سطح پہ ہوں، ہم تب بھی نہیں مانتے۔ چلو کی لیکس میں تو جھوٹی سچی کسی دستاویز کا عکس پیش ہوا ہوگا۔ مگر طرفہ تماشایہ ہے کہ اسامہ بن لادن کو پولیو کے قطروں سے ٹریس کرنے کا دعوے دار امریکہ، ہمیں بتاتا ہے کہ طالبان کے ”ترجمان“ نے، کسی ”گمنام مقام“ سے فون پر، خود کش دھماکہ کی ذمہ داری قبول کر لی ہے۔

کون طالبان؟ کون ترجمان؟ کہاں گئی موبائل سم کی لوکیشن ٹرینگ؟ بس وہی ”آواز آئی“ اور ”فرمایا“ والا ناک اور اس کے ساتھ ہی ہماری نام نہاد تعلیم یافتہ اشرافیہ کی لغویات شروع۔

میں نے مزید کہا: ”مولانا کی وزیراعظم والی بات کو آپ نے دل پہ لے لیا ورنہ یہ بات تو مولانا ذریہ کے بھرے جلے میں کہہ چکا ہے کہ مغرب علماء سے خواہ مخواہ خوفزدہ ہو کر، اپنے گماشتوں کے ذریعے ہمارا راستہ روکتا ہے۔ ہم امریکہ سے کہتے ہیں کہ ہمارا راستہ مت روکو، ایک بار ہم کو بھی آزما کر دیکھو، ہم دنیا کو زیادہ پر امن بنائیں گے“

اپنے شہر کے لوگوں کے اعتراضات:

پہلا الزام..... کہ مولانا نے شہر کیلئے کچھ نہیں کیا:

ذریہ اسماعیل خان کے لوگوں کو اس پہ اعتراض ہے کہ مولانا نے ذریہ شہر کے لئے کچھ کام نہیں کیا۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ آج کل کی پڑھی لکھی نسل کو پتہ ہی نہیں کہ ممبر قومی اسمبلی، قانون سازی یا میگا پراجیکٹس کے لئے صوبائی اسمبلی کا رکن صوبائی بجٹ میں اپنے حلقے کی ترقی (کالج، سکول، گراؤنڈ، واٹر سیکم) کے لئے اور بلدیاتی نمائندہ، شہر کی گلیوں، سڑکوں کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔



کم از کم ڈیرہ کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سرکلر روڈ پہ گردوغبار کا ذمہ دار بھی مولانا فضل الرحمن ہے۔ پرانے زمانے کے لوگ یہ خوب سمجھتے تھے کہ جہاں اپنے علاقے کے ترقی چاہنی ہے، وہاں قومی سطح پر نظریاتی جدوجہد میں بھی حصہ ڈالنا ہے۔ پس مفتی محمود صاحب کے دور میں یہ عام نعرہ تھا کہ ”بڑا ووٹ جمعیت دا، چھوٹا ووٹ طبیعت دا“، یعنی قومی اسمبلی کا ووٹ علماء کیلئے اور صوبائی کا ووٹ اپنی مرضی سے دینا ہے۔ میں اس معاملے میں بنوں کے لوگوں کو داد دوں گا کہ ہر دور اور ہر زمانے میں انہوں نے جمعیت علماء کو ہی ووٹ دیا۔ اس نظریاتی مستقل مزاجی میں اپنے شہر کی ترقی کو آڑے نہیں آنے دیا۔ چنانچہ جب جمعیت علماء کو حکومت کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے اہلیان بنوں کے سارے پرانے قرض اتار دیئے۔

واپس ڈیرہ کی طرف آتے ہیں۔ جب آپ رکن قومی اسمبلی کے دائرہ کار کو سمجھ لیں تو پھر جاننا چاہئے کہ مولانا فضل الرحمن کی سیاسی زندگی کا پہلا الیکشن 1985 میں ہوا تھا جس کا ایم آر ڈی کے فیصلے کے تحت بایکٹ کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ڈیرہ اسماعیل خان سے پیر صابر شاہ ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوا تھا جو تین سال رہا۔ 1988ء میں صرف 20 ماہ کیلئے مولانا ممبر رہا اور 1990 تا 1993 لٹی خان (فضل کریم کنڈی) جو کہ فیصل کریم کنڈی کا والد ہے، ایم این اے رہا۔ 1993 تا 1996ء پھر مولانا رکن اسمبلی رہا تو 1997 تا 1999 عمر خان میاں منتخب ہوا۔ 2002 تا 2007ء پھر مولانا رکن قومی اسمبلی رہا تو 2008 تا 2013، ڈیرہ سے ممبر قومی اسمبلی فیصل کریم کنڈی تھا جو ڈپٹی سپیکر بھی تھا۔ 2013ء سے تاحال مولانا فضل الرحمن ایم این اے ہیں۔ پس 1985 تا 2016ء 31 سالہ دورانیہ میں مولانا فضل الرحمن کل 11 سال ایم این اے رہے، جبکہ دیگر حضرات باقی 20 سال رکن قومی اسمبلی رہے۔ سوال اور موازنہ تو سب سے ہونا چاہئے تھا کہ انہوں نے ڈیرہ شہر کو کیا ترقی دی؟

البتہ میں اس سے اتفاق کرتا ہوں کہ مولانا کی سیاسی حیثیت کا باقی صاحبان سے کوئی تقابل ہی نہیں اور مولانا سے اہل ڈیرہ کو بجا طور پر زیادہ توقع رکھنی چاہیے، اس کے باوجود اگر ڈیرہ شہر پسماندہ ہے تو کیوں؟ اس پہ میری ذیل کی تحریر ملاحظہ فرمائیے:

### بڑے لیڈروں کے چھوٹے شہر

ایک بڑی حیران کن سی بات ہے کہ پاکستان میں قومی سطح کے لیڈروں کے اپنے حلقہ انتخاب عموماً پسماندہ ہوتے ہیں۔ بھٹو کا لاڑکانہ ہو یا ولی خان کا چارسدہ، صدر لغاری کا ڈیرہ غازی خان ہو یا نوابزادہ نصر اللہ کا مظفر گڑھ، مولانا فضل الرحمن کا ڈیرہ اسماعیل خان ہو یا عمران خان کا میانوالی وغیرہ۔



اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، اگرچہ ان لیڈران کو عام ایم این اے سے بھی کچھ زیادہ ہی فائدہ ملتا کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے ایک تو قومی لیڈرز، پورے ملک پہ پھیلی مصروفیات کی وجہ سے ایک شہر پہ مکاحقہ توجہ نہیں دے سکتے۔ دوسرے، ان کے عوام کو بھی کچھ زیادہ ہی توقعات ہوتی ہیں۔

آج سے 7 سال قبل میری میانوالی اندرون شہر تشکیل ہوئی، تو شہر کی حالت ڈیرہ اسماعیل خان سے بھی بدتر تھی۔ حالانکہ پنجاب کے اکثر شہر موزوں حالت میں ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی کہ فضائیہ کا ایک بیس بھی وہاں ہے۔ لوگوں سے پتہ کیا کہ پانچ سال عمران خان یہاں کا ایم این اے رہا تو کیا کام کیا؟ معلوم ہوا کہ اس عرصہ میں صرف 70 کلومیٹر درود بنائی جو اس کے نکل کالج تک جاتی ہے۔ میانوالی کے کوئی دوست اگر بتا سکیں کہ عمران خان نے پانچ سال میں میانوالی کے لئے کیا کارنامہ انجام دیا تو ممنون ہوں گا۔ اس لئے 2011ء میں جب اکثر دوست کہتے تھے کہ آزمائے ہوؤں کی بجائے عمران خان کو ایک چانس دینا چاہئے تو میں عرض کرتا تھا کہ وہ بھی تو آزمایا ہوا ہی ہے۔

خیر، ہمارا شہر ڈیرہ اسماعیل خان بھی پسماندہ ہے جس پر انصافی دوست مولانا فضل الرحمن کو کوٹنے دیا کرتے ہیں۔ جب عرض کریں کہ اسی شہر سے 1985ء سے لیکر اب تک، بطور ایم این اے مولانا کے کل 11 سال اور دوسروں کے 20 سال بننے ہیں اور مولانا کے علاوہ بھی تو چار ایم این اے رہے ہیں جن میں ایک ڈپٹی سپیکر بھی تھا۔ تو جواب ہوتا ہے کہ مولانا تو قومی لیڈر ہے، آپ صرف اس کی بات کریں۔ عرض کیا: آپ تو فرماتے ہیں، لیڈر کا کام سرٹکیں نالیاں بنانا نہیں، بلکہ صحت و تعلیم پہ توجہ دینا ہے۔

کہنے لگا: تو صحت و تعلیم میں مولانا نے ڈیرہ کے لئے کیا کر دیا؟

عرض کیا: لسٹ طویل ہو جائے گی، تعلیم کی بات ہو تو آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ آپ کو گول یونیورسٹی اس لئے ملی کہ جمعیت علماء کے سپیکر سردار اسماعیل نواب اللہ نواز سدوزی نے ذاتی زمین کا عطیہ تھا۔ اور یہ بھی مولانا فضل الرحمن کا دم ہے کہ یہ یونیورسٹی مالی بحران کا شکار ہونے سے بچی رہی ہے۔ آپ کو مزید ایک ایک بوائز اور گرلز ڈگری کالج عطا کیا۔ مزدور طبقات کیلئے خصوصی ورکنگ فوکس سکول دیا۔ معیاری تعلیم کیلئے صوبائی حکومت نے مفتی محمود پبلک سکول بنایا۔ صحت کی بات کریں تو آپ کو 300 بستروں کا مفتی محمود یچنگ ہسپتال دیا۔ مفتی محمود ڈسٹ آف ہسپتال کیلئے زمین دلوائی وغیرہ۔

کہنے لگے، نام تو مفتی محمود کا ہے نا؟

عرض کیا کہ: یوں کہیں نا کہ آپ کا اصل درد، ڈیرہ یا اس کی ترقی نہیں، بلکہ کچھ اور ہے۔



دوسرا الزام: ”مولانا، صرف اپنے خاندان کو آگے لارہا ہے۔“

مولانا عبدالغفور حیدری جیسے چٹائی نشین ڈپٹی چیئرمین سینیٹ بنائے گئے یا اکرم درانی جیسے خوانین، وزیر اعلیٰ بنائے گئے، یہ اور اس جیسے دیگر کئی لوگوں کا مولانا کے خاندان سے کوئی رشتہ ہی نہیں، تاہم ڈیرہ اسماعیل خان کی حد تک مولانا کے خاندان کی پروجیکشن پہ مجھے بھی کچھ تشویش ہے اور اس کا تفصیلی اظہار، میں نے کتاب کے آخر میں ”مولانا فضل الرحمن سے دوسری اعلانیہ مخالفت“ کے تحت کیا ہے۔

دینی حلقوں کا مولانا پر اعتراض:

”مولانا فضل الرحمن نے اسلام کیلئے کیا کیا؟“

”پاکستانی عوام کی اکثریت اسلامی نظام چاہتی ہے، آپ کہتے ہیں مولانا فضل الرحمن سب سے دانا لیڈر ہے، 60 سال ہو گئے ہیں، وہ ہر حکومت کا حصہ رہا ہے۔ آخر وہ اسلامی نظام کیوں نہیں لاسکا؟“

یہ ہے وہ سوال جو بعض سنجیدہ دینی دوست اٹھاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارا جواب سنجیدگی سے نہیں سنا جاتا کیونکہ ہر ایک اپنی سرحدی کا جواب سننا چاہتا ہے۔ بہر حال، اس پر میرا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

مذکورہ بالا سوال میں تین غلط بیانیوں ہیں، پہلی یہ کہ عوام کی اکثریت نہیں بلکہ وہ چھوٹی اقلیت اسلامی نظام کا نفاذ چاہتی ہے جو دینی جماعتوں کی جدوجہد میں شریک ہے اور ان میں بھی ان کا اپنا اپنا ورژن اور طریق کار ہے۔ پس مولانا کی جماعت شاید کل عوام کا 2 فیصد بھی نہیں، لیکن ایک جمہوری معاشرے میں کسی بھی اقلیت کو اپنے حقوق کی جمہوری جدوجہد سے منع نہیں کیا جاسکتا اور یوں مولانا اپنے دو فیصد حمایتیوں کے ساتھ 98 فیصد مخالفین کا مقابلہ کر رہا ہے۔ یہ بھی غلط بیانی ہے کہ وہ 60 سال سے میدان میں ہے اور یہ کہ ہر حکومت کا حصہ رہا ہے۔

اب آپ کے سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں، اس سوال کے جواب میں پہلے کچھ انفرادی سوالات سن لیں کہ یہ طریقہ، اصل ایٹو کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

دیکھئے! جمیعت علما اسلام ایک دینی جماعت ہے، جو غلبہ اسلام چاہتی ہے۔ پھر یہ ایک دینی سیاسی جماعت ہے، پھر یہ پارلیمانی سیاست کی جماعت ہے اور پھر یہ اسلامی قانون سازی کے لئے فورم ہے اور پھر یہ حکومتی انتظام چلانے کا متبادل ادارہ ہے۔

ان پانچوں حیثیتوں میں، اس کا تقابل پاکستان کے معروضی حالات کی روشنی میں، اس کے ہم پیشہ اداروں سے کرنا ہوگا۔



1: پاکستان میں خالص دین کیلئے کئی جماعتیں کام کر رہی ہیں، عوام کا مزاج بدلنے کی ادارے ہیں، دینی مدارس ابھی تک معاشرہ نہیں بدل سکتے تو کیا ان کو بند کر دیں؟ تبلیغی جماعت زیادہ معروف ہے، 60 سال میں انہوں نے کیا کر لیا؟ وہ اگر ابھی تک معاشرہ تبدیل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تو کیا اس جماعت کو بند کر دیا جائے؟ وہ اپنی کامیابی میں کہتے ہیں کہ تبلیغی جماعت، ایلیٹ کلاس کے لوگوں تک پہنچ گئی۔ اسی طرح جمعیت بھی تو ڈپٹی چیئرمین سینیٹ تک پہنچ گئی۔ صوبائی حکومتیں چلانے تک پہنچ گئی، اشارہ کافی است۔

2: جمعیت ایک دینی سیاسی جماعت ہے، بھلا اور کونسی دینی جماعت ہے جو اپنے اہداف میں کامیاب ہو گئی ہے؟ دوسروں سے تو جمعیت بہر حال زیادہ کامیاب ہے۔ 1970ء میں یہ حال تھا کہ جمعیت اور نورانی میاں کی سات، سات جبکہ جماعت اسلامی کی چار سٹیٹس تھیں۔ آج نورانی گروپ کا نام نہیں اور جماعت اسلامی اپنی بقاء کی آخری جنگ لڑ رہی ہے جبکہ مولانا کی جماعت ہر حکومت کیلئے ناگزیر ہو چکی ہے۔ کتنے غیر اسلامی قوانین، تنہا مولانا کی جماعت نے واپس کر دئے ہیں کہ مولانا کو ناراض کرنے کا کسی کو یارا نہیں، ورنہ عددی طور پر جمعیت کے ممبران کم ہوتے ہیں، عقلمندرا اشارہ کافی است۔

3: جمعیت کبھی پارلیمانی سیاست کی جماعت ہے، نہ کبھی چور دروازے سے اقتدار میں آ کر اہل اسلام کو بدنام کیا، نہ ہی آپارہ کے اشارے سے دفاع پاکستان کونسل تشکیل دی۔ نہ انگلی اور ایمپائر کے سہارے انقلاب کی تمنا کی، نہ بددوق اور دھمکی سے بات منوانے کی کوشش کی۔ تاریخ بتائے گی کہ ایسا رویہ بذات خود اہل اسلام اور اسلام کی عزت کا سبب ہے، اشارہ کافی است۔

4: جمعیت قانون سازی کا فورم بھی ہے۔ دیکھئے! ایک تو 1973 کا متفقہ آئین ہے، جس کے بنانے میں جمعیت علماء شریک رہی ہے، مگر یہ قرآن نہیں ہے، اس میں کمی بیشی کی خاطر سیاسی جماعتوں کے قانون ساز دماغوں کا کام کرنا چاہئے۔ لوگ کہتے ہیں، نظام میں سقم ہے۔ ٹھیک ہے مگر کس سیاسی جماعت نے اس سقم کو دور کرنے کے متبادل قانون سازی تیار کر کے اسمبلی میں پیش کی ہے؟ صرف جمعیت علماء ہے جس نے حسب بل بطور متبادل قانون تیار کیا اور پھر پختہ خواہ اسمبلی سے منظور کرایا اور صدر کی ٹیبل پر آن ہو لڈ رکھا ہے، کسی اور جماعت نے کچھ تحریری ہوم ورک کیا ہے یا صرف نعرے ہیں؟

5: جمعیت کسی بھی دیگر سیاسی جماعت کی طرح حکومت چلانے کا متبادل ادارہ ہے، اس کو اس چیز کا تجربہ ہونا چاہئے۔ اس نے دوبار صوبائی حکومت چلائی ہے۔ عوام کی امنگوں کے بالکل مطابق نہیں چلا سکی مگر اس پہ کرپشن کا الزام نہیں لگا۔ جیسے یہ سیاسی جماعت ایک ادارے کے طور پر پوری طرح کامیاب نہ



ہو سکی ویسے ہی کئی دیگر ادارے بھی کامیاب نہیں ہیں۔ فوج بھی ایک ادارہ ہے۔ بقول اصغر خان، چاروں جنگیں ہاری ہیں، ملک دو ٹکڑے کیا اور 90 ہزار گرفتار ہوئے، تو اس ادارے کو بند کریں کیا؟ آپ کی یونیورسٹیوں سے آج تک نکلے کسے سائنسدان پیدا نہیں ہوئے تو ان کو بند کر دیں کیا؟ بلکہ سارے ملکی ادارے ابھی تک ناکام ہیں، ان کو بند کر دیں کیا؟ جمعیت نے آپ کو ایک قومی ادارہ دیا ہے، جس کا نام ہے اسلامی نظریاتی کونسل۔ وہ تو بہر حال اپنا کام بھرپور کر رہا ہے، عقلمند راہ اشارہ کافی است۔

بات یہ ہے کہ ہمارے اکثر دیندار احباب کو جمعیت علماء اسلام بنانے کی غرض و غایت اور اس کے کام کی نوعیت کو پتہ نہیں ہے ورنہ ان کو خود ہی پتہ چل جاتا کہ مولانا نے اب تک دین کیلئے کیا کیا ہے؟ جمعیت علماء اسلام کی حیثیت باقی دینی تحریکوں میں ایسے ہے، جیسے فٹ بال کی ٹیم میں گول کیپر ہوتا ہے۔

ٹیم کے ہر کھلاڑی کا خاص رول ہوتا ہے، سنٹر فارورڈ پے کھیلنے والے سے سوال پوچھا جاتا ہے کہ آپ نے کتنے گول کئے ہیں؟ جبکہ گول کیپر سے سوال کیا جاتا ہے کہ آپ نے کتنے گول بچائے ہیں؟ اگر آپ کو اس نقطے کی سمجھ آگئی ہے تو جمعیت علماء کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں جن پہ آگے بات ہوگی۔

اکثر دینی لوگوں پر ابھی تک انفرادی اور اجتماعی محنت کا دائرہ کار واضح نہیں۔ دیکھئے! دو باتیں ہیں: پہلی بات یہ کہ اعمالکم عمالکم یعنی جیسے تمہارے اعمال ہوں گے، ویسے حکمران ہوں گے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے لوگوں کی تربیت ضروری ہے۔ دوسری بات یہ کہ الناس علی دین ملوکھم یعنی لوگ اپنے حکمرانوں کو فالو کیا کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ حکومت میں دیندار لوگ ہونا ضروری ہیں۔

اب یوں ہے کہ فرد کی اصلاح نہایت اہم امر ہے۔ یہ جو کہا جاتا کہ ہمارا سسٹم ٹھیک نہیں، اس میں جھول ہے۔ ”سسٹم“ نہیں بلکہ ”لوگ“ ٹھیک نہیں ہوا کرتے۔ سسٹم یا قوانین جتنے بھی اعلیٰ ہوں مگر لوگ بدنیت ہوں تو کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ یہی بات قرآن کریم نے سمجھائی کی موسیٰ کے ہوتے ہوئے خدا کے قانون (بابت شکار ماہی بروز سنچر) کا یہود نے کیا حال کر دیا تھا؟

سسٹم افراد ہی بناتے اور چلاتے ہیں، پس فرد کی تربیت بنیادی کام ہے۔ مگر ہم کو ”بنیادی کام“، ”بڑا کام“ اور ”افضل کام“ کا فرق جاننا ضروری ہے۔

ایک بنیادی کام ہوا کرتا ہے۔ ایک پرائمری اسکول کا ٹیچر، ساری عمر ”اے بی سی“ پڑھاتا رہتا ہے (اس سے نت نئے مضامین کی توقع کرنا، حماقت ہے)

ایک بڑا کام ہوا کرتا ہے کہ اس کے ہزاروں شاگردوں میں سے کوئی ایک، ڈاکٹر عبدالقدیر بن کر ملک و قوم کے لئے ایک بڑا کام کر جاتا ہے۔ یہ دونوں کام، لازم و ملزوم ہیں۔ اگر بنیادی کام نہ ہو تو بڑے کام



والے پیدا نہیں ہو سکتے۔ بڑے کام والے پیدا نہ ہوں تو بنیادی کام کی ضرورت ہی کیا ہے؟

"بنیادی کام" اور "بڑا کام"۔ "ان دونوں میں سے افضل کام کونسا ہے؟

یہ شخص رائے پر منحصر ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

تبلیغ کا کام، بنیادی کام ہے۔ آج کے مادیت زدہ معاشرے میں ایمان بالغیب کی بنیاد کمزور پڑ گئی ہے، اس لئے ہر مسلمان کو شروع میں اپنی بنیاد بنانے کیلئے اور بعد ازاں دوسروں کی بنیاد بنانے کے لئے اس بنیادی فلاحی کام کے لئے وقت نکالنا چاہیے، لیکن مسلمان ملت کو "ٹریک" پر لانے کے لئے جو بھی زعماء اور علماء اپنا کردار ادا کر رہے ہیں، وہ بڑا کام کر رہے ہیں جیسے "اسلامی نظریاتی کونسل" وغیرہ۔

اب تبلیغی محنت (بنیادی کام) اور علمی و عملی راہبری (بڑا کام) میں سے افضل کام کونسا ہے؟ یہ کوئی جھگڑے کی بات نہیں، اپنا اپنا فہم اور ذوق ہے۔ خاکسار کی رائے میں، علمی و عملی راہبری ہی افضل کام ہے۔ تبلیغ والوں میں معدودے چند لوگ ایسے بھی ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ کام ہے تو صرف تبلیغی جماعت کا، باقی تو دنیا میں کوئی کام ہی نہیں ہے۔ سوانہ سادہ دل احباب کو فقط "انگور" کیا جائے۔

### مولانا کے ناقدین کا اصل مسئلہ

مولانا کے اجلے اور ظاہر و باہر کردار کے باوجود اگر ان کو قوم میں کماحقہ پذیرایا نہیں ملی تو اس کی وجوہات یہ طور کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قوم میں مدرسے کے مولوی کا امیج ایک مسکین، سادہ لوح اور وظیفہ خور کا بنا ہوا ہے یا پھر دہشت گرد اور منہ سے جھاگ اڑاتے، شمشیر بکف مجاہد کا۔ جو مولوی اس امیج پر پورا نہ اترتا ہو، وہ ان کو ہضم نہیں ہوتا۔ پس جب عوام ایک مولوی کو بڑی گاڑی یا کروزر میں دیکھتے ہیں تو ان کے پہلے سے بنے امیج میں یہ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس کی وجہ خود علماء ہیں کہ کافی عرصہ وہ عوام سے الگ اپنی دنیا بسائے رہے۔ تبلیغی جماعت چونکہ عوام میں گھل مل گئی ہے تو تبلیغی علماء اور خواص کی جاگیریں عوام کو اجنبی نہیں لگتی۔ مولانا کے پاس تو بلحاظ عہدہ سرکاری لینڈ کروزر ہوا کرتی ہے لیکن مولوی کے پاس مہران گاڑی بھی ہو تو عوام کو تکلیف ہوتی ہے۔

معذرت سے عرض ہے کہ ہمارے صوبے خیبر پختونخوا کا کلچر باقی پاکستان سے بہت مختلف ہے۔ پنجاب میں تو ذات پات کا ہندوانہ نظام اس قدر پختہ ہے کہ مولوی کو ایک کمیون سمجھا جاتا ہے۔ قبیلوں، قوموں کا فرق پختونوں میں بھی ہے مگر یوں تعصب نہیں ہوتا اور علماء کو قدر سے دیکھا جاتا ہے۔



میں تو یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ پاکستان کی چاہے دنیاوی پارٹیاں ہوں جیسے پیپلز پارٹی وغیرہ یا خالص دینی جماعتیں ہوں جیسے تبلیغی جماعت، ان کے پختونخوا سیٹ اپ کا باقی پاکستان کے سیٹ اپ سے بالکل جدا گانہ مزاج ہوتا ہے۔

پس ایک طرف مولانا کی دنیاوی شہمت کے حسد میں مبتلا ہو کر ان پر لبرل طبقہ یوں حملہ آور ہوتا ہے کہ مفتی محمود کا کچا گھر تھا تو مولانا کے بنگلے کیسے بن گئے؟ حالانکہ جتنا بڑا گھر مولانا کا ہے وہ کسی بھی اوسط آمدنی والے کا ہو سکتا ہے۔ دوسرا حملہ، ان مولویوں کی طرف سے ہوتا ہے جو مولانا کے حاسدین ہیں مگر خود کو اصولی گردانتے ہیں مثلاً امام ابو حنیفہؒ سے منسوب ایک قول جو کہ امام صاحب کا ہے نہیں، سوشل میڈیا پہ گردش میں ہے۔ قول یہ ہے کہ ”کسی عالم کو بادشاہوں کے دربار میں دیکھو تو وہ خائن ہوگا“ اصل قول یوں ہے کہ ہنس الفقیر علی باب الامیر یعنی برا فقیر وہ ہے جو امیر کے در پہ ہو۔ یہ ایک عربی کہاوت ہے، اچھی ہے اور اس کے کئی معنی لئے جاسکتے ہیں، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود امام ابو حنیفہؒ کے پہلے شاگرد امام ابو یوسف نے تو عباسیہ کے ہاں چیف جسٹس کی ملازمت کی تھی، جبکہ مولانا تو کسی حکومت کا نوکر نہیں رہا، فقط جمہوری پارلیمنٹ میں آگینی کردار حاصل کیا۔ اور کسی حکومت کے ساتھ اس کا اتحاد یا اختلاف، اپنے نظریہ کے مفاد میں ہوتا ہے۔ حکمران کے دربار میں رہنا بذاتہ اگر برائی ہوتی تو مجدد الف ثانیؒ جہانگیر کے لشکر میں کیوں رہتے؟

نو جوان چاہے مذہبی ہوں یا لبرل، ان کی مولانا کے ساتھ کمیسٹری نہیں بنتی۔ ہمارے سماج میں جس انداز کی لیڈر شپ کو پسند کیا جاتا ہے، اس فریم میں مولانا کی سنجیدہ اور ٹھہراؤالی سیاست فٹ نہیں بیٹھتی۔ دراصل پاکستانی جذباتی قوم کی تعمیر میں مضر ہے اک صورت خرابی کی۔

پاکستانی قوم کے سماجی رویے ماپنے کے لئے ”پلڈاٹ“ سروے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہی ایک ثبوت کافی نہیں کہ پاکستان کی پہلی اور آخری سپر ہٹ فلم ”مولا جٹ“ رہی ہے۔ ویسے تو یہ کسی ماہر نفسیات کا موضوع ہے، مگر نظر بظاہر یوں لگتا ہے کہ اس قوم کی صورت گری میں احساس کمتری، جنسی بھوک اور انتقام کا مادہ بکثرت استعمال ہوا ہے۔

معاف کیجئے! بھٹو کی عوامی مقبولیت، روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے سے نہیں ہوئی بلکہ وہ اسی دن اس قوم کا دلدار بن گیا تھا جب اس نے ایوب خان کے حق میں تقریر کرتے ہوئے قاسم باغ ملتان میں مادر ملت فاطمہ جناح کو ”فاحشہ“ کہا تھا اور ہمارے کانوں کی تضحکی کو سیراب کر دیا تھا (میں نے اصل گالی کی حدت کم کر دی ہے)



پینپلز پارٹی، انقلابی اور پڑھے لکھے جوانوں کی طاقت تھی جس سے "آئی جے آئی" نے نہیں، اکیلے شیخ رشید نے نوجوانوں کا کراؤ ڈھین لیا تھا۔ کب؟ جب لیاقت باغ کے جلے میں شیخ صاحب اسٹیج پر سائیکل پہ چڑھ کر آیا اور اس کے بعد کہا "میں اپنے انتخابی نشان پہ چڑھ آیا ہوں، بے نظیر سے کہو، وہ اپنے انتخابی نشان پہ چڑھ کر دکھائے" بے نظیر کا نشان "تیر" تھا۔ (اس اسلامی قوم کو مدت سے ایسے ہی لیڈر کی تلاش تھی، پس وہ فرزندِ راولپنڈی ٹھہرا)

ایسی جذباتی مارکیٹ میں مولانا کے جیسی ٹھہراؤ، سنجیدگی اور ٹھنڈی تقریر کا سودا قوم کو نہیں بھاتا۔ انہیں کشتوں کے پٹے لگانے والے ذوالفقار مرزے چاہیے ہوتے ہیں۔

### مولانا بارے، مخلصین کے اشکالات:

یوں تو مختلف مذہبی مکتبہ فکر کے احباب کو مولانا کے کردار پر گونا گوں اشکالات رہتے ہیں، رہنے چاہئیں مولانا معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ لیکن جب تبلیغی جماعت کا کوئی چار ماہ لگا ہوا پرانا سائنسی تحریک انصاف کی وکالت کرتا ہے تو حیرت ہوتی ہے، کیونکہ ہم کو تو تبلیغ میں جمعیت علماء اسلام کی وکالت سے بھی روکا جاتا تھا کہ تبلیغ والوں کا دنیاوی سیاست سے بھلا کیا تعلق؟

ہمیں کہا جاتا تھا کہ بادے کی ترقی کے نعرے لگانے سے ایمان میں کمزوری آتی ہے۔ پھر ہمارے ہاشل ٹیل، ہمارے ایک امیر صاحب تھے جو آج کل عمران خان کی محبت میں مولانا فضل الرحمن کو گالیاں دیا کرتے ہیں (ان گالیوں کا اپنا ایک انداز ہوتا ہے جو کہ "اللہ معاف کرے" سے شروع ہوتا ہے) میرے پاس جدہ تشریف لائے تو میں نے بات چھیڑی کہ فلاں شخص کو رائے ونڈ والوں نے جماعت کا امیر بنا دیا حالانکہ وہ اس قابل نہیں۔ بڑے درویشانہ انداز میں بولے "بھائی! رائے ونڈ والوں کا تو صرف قلم چلتا ہے، فیصلے تو اوپر سے ہوتے ہیں" میں نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر عرض کیا "حضرت! دس آدمیوں کی جماعت کے امیر کا فیصلہ عرش سے ہوتا ہے اور لاکھوں علمائے دیوبند کے امیر کا فیصلہ، کیا عرش والے کی مرضی بغیر ہو جاتا ہے؟"

خیر، اس جملہ معترضہ کے بعد چند اشکالات بارے بات ہو جائے۔

ایک دوست نے کچھ سوالات رکھے جس کو عنوان دیا: "فضل الرحمن کی علییت سوالات کے آئینے میں" فضل الرحمن کے مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ کن قومی اداروں میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں؟ اگر ڈاکٹر، انجینئر، ناہسی، کون سی یونیورسٹی میں اسلامیات یا اسلامک ہسٹری کی تعلیم دے رہے ہیں؟



ان مدرسوں سے فارغ ہونے کے بعد ان کا مستقبل کیا ہوتا ہے؟ کیا یہ معاشرے کے لیے ایک مفید فرد کی حیثیت حاصل کر پاتے ہیں؟

کیا فضل الرحمن کے مدرسوں سے فارغ التحصیل طلبہ اسلام کی اشاعت کے لیے دنیا بھر میں نہ سہی پاکستان ہی میں کوئی قابل قدر خدمت انجام دے پائے؟

فضل الرحمن کے شاگرد تو دور کی بات، خود فضل الرحمن کسی تحقیقی کتاب کے مصنف ہیں؟

کیا فضل الرحمن نے اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کیلئے کوئی تحقیقی مقالہ جات یا مضامین لکھے؟ کیا دنیا کے تمام معاشی نظاموں کے مقابلے میں فضل الرحمن نے اسلام کو متبادل کے طور پر پیش کیا؟

لا محدود سوالات ذہن میں مسلسل آرہے ہیں لیکن کیا ان مختصر سے سوالات کا کوئی جواب دے سکتا ہے؟

الجواب بعون اللہ۔

عرض کیا کہ میرے فیس بک پیج پر اس بارے میں سنجیدہ سوالات کے جوابات پہلے سے موجود ہیں اور ایسے ہیگانہ سوالات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن محض آپ کی خاطر آپ کے سوالات کا مختصر جواب عرض کر رہا ہوں:

مدارس، فضل الرحمن کے نہیں ہیں بلکہ وفاق المدارس کے ہوا کرتے ہیں۔ فضل الرحمن خود ان مدارس سے سند یافتہ ہے، جیسے عمران خان، یونیورسٹی سے اکنامکس میں سند یافتہ ہے۔ مگر یونیورسٹیاں اس کی نہیں ہوتیں کہ میں کہوں عمران خان کی یونیورسٹیوں نے اب تک کیا کیا؟ البتہ، اسی "چین آف مدارس" میں سے مولانا کے زیر اہتمام ایک مدرسہ بھی ہے، جیسے عمران خان کے زیر اہتمام نمل کالج ہے، اور نمل کالج کا تعلیمی نصاب، کارکردگی، اور سٹوڈنٹس کے مستقبل کو عمران خان کا سٹاف ہینڈل کرتا ہے، وہ خود نہیں کرتا۔

بعینہ مولانا کے زیر اہتمام مدرسے کا حال ہے۔

مولانا فضل الرحمن کی علمیت یہ ہے کہ وہ سند یافتہ عالم دین ہے۔ اب کیا ہر ڈگری یافتہ کو لیکچر دینے لازمی ہوا کرتے ہیں؟ اور اگر کوئی ڈگری یافتہ آدمی پروفیسری نہ کر رہا ہو تو کیا اس کو جاہل کہیں گے؟

مولانا فضل الرحمن لیڈر اور عملی آدمی ہے۔ لیڈر کتابیں نہیں لکھتے بلکہ ان پہ کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ مسٹر جناح نے کتاب نہیں لکھی، نہ لیاقت علی خان وغیرہ نے۔ اور جنہوں نے جناح پہ کتابیں لکھیں وہ پاکستان کی عملی جدوجہد میں شریک نہیں تھے۔

اسلام کی حقانیت ثابت کرنا مدارس میں بیٹھے مفتی محمد تقی عثمانی جیسے علماء کا کام ہے اور مولانا فضل الرحمن فقط ان کیلئے چھتری کا کام دیتا ہے۔ آج اہل مدارس اس لئے اطمینان سے تحقیق و جستجو کر رہے ہیں کہ مولانا



نے مدارس کو ڈسٹر ب کرنے والے سارے وار روک رکھے ہیں (جس کے لئے اہل مدارس ممنون ہیں) مولانا کا کام سیاسی طور پر اسلامی موقف منوانا ہے، جیسے دوسری جماعتیں، میرٹ اور ترقی کا نعرہ لگاتی ہیں۔ مولانا نے تو اپنے سلوگن یعنی اسلامی نظام کی خاطر خیر پختو خواہ اسمبلی سے حہ بل منظور کروالیا۔ آپ بتائیے پاکستان سے غربت اور نا انصافی ختم کرنے کے لئے کوئی متبادل آئین بنا کر، کسی اور نے کسی اسمبلی میں پیش کیا ہے؟

باقی آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ اسلامی مدارس کے فضلاء کا مستقبل کیا ہے؟ انہوں نے کبھی جابز کیلئے جلوس نہیں نکالے، اپنی یونیورسٹیوں کی فکر کریں جہاں سے ایک نئے کا سائنسدان برآمد نہیں ہو سکا۔ باقی چھوڑیں، نمل کالج سے کوئی نئی ایجاد سامنے آئی ہے؟، یہ ہی بتادیں۔

اسلامی مدارس کا کیا کردار ہے، یہ سوال مولانا فضل الرحمن سے متعلق نہیں ہے اور نہ ہی وہ مدارس کے فضلاء کے کردار کے ذمہ دار ہیں۔

اسلامی مدارس کا فیلڈ اسلامی تعلیم دینا ہے۔ دنیا بھر سے یہاں بچے پڑھنے آتے ہیں، جبکہ آپ کی یونیورسٹیوں والوں کو باہر والے برابر کا پڑھا کھانا منے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ دوبارہ ٹٹ لیتے ہیں۔ یہاں کے مدارس کے علماء رابطہ عالم اسلامی میں رئیس کی کرسی پاتے ہیں اور آپ کے پروفیسروہاں اسٹنٹ بھی نہیں لگائے جاتے۔ تھوڑے لکھے کو بہت جانیں۔

### مولانا فضل الرحمن شریوں کا حامی ہے:

مخلص آدمی بھی پروپیگنڈے کا شکار ہو سکتا ہے مگر اس کے اخلاص کی نشانی یہ ہے کہ حق واضح ہوتے ہی، وہ رجوع کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ ضد اور عناد کا شکار نہیں ہوتا۔ اللہ والے لوگ، اپنے سے چھوٹوں کی حق بات کو بھی بخوشی قبول کرتے ہیں۔

پاکستان کے ایک بہت بڑے غیر سیاسی عالم دین، میرے غریب خانے پر رونق افروز تھے، ان دنوں جمشید دتی نے پارلیمنٹ کے ہاٹل سے شراب کی خالی بوتلیں برآمد کر کے میڈیا میں ہنگامہ کھڑا کیا ہوا تھا۔ مولانا فضل الرحمن صاحب سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ میرے گمان میں تو لوگ شراب نہیں پیتے۔ اور پھر معاشرے میں یہ چیز عام ہو گئی ہے تو جمشید دتی کو یہ برائی نہیں اچھالنی چاہیے۔

ہمارے مہمان بزرگ، مولانا کے اس بیان پر ذرا ناراض تھے۔ ان کے خیال میں مولانا کو اس کیس میں جمشید دتی کی مدد کرنا چاہئے تھی۔ مجھے حضرت کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں تھی، لیکن ناشتہ کے بعد میں



نے عرض کیا ”حضرت وہ امام ابوحنیفہؒ کے نو جوان ہمسائے کا کیا قصہ ہے، جورات بھر شعر پڑھتا تھا؟“  
یہ سن کر چند لمحے سوچا اور پھر بڑی فراخ دلی سے کہا کہ آپ نے مجھے مولانا فضل الرحمن سے بدگمانی سے بچالیا  
احباب کو اس قصہ کی تفصیل معلوم ہوگی۔ مختصر ایں کرتا ہوں کہ امام صاحب کے پڑوس میں ایک مست  
جوان رہتا تھا جو ساری رات شراب پی کر غل غپاڑہ کرتا تھا اور ایک شعر اکثر پڑھتا کہ لوگوں نے مجھ جیسے  
جوان کو ضائع کر دیا۔ کسی بات پر اس کو داروغہ پکڑ کر لے گیا۔ امام صاحب کو اس کا شور سنائی نہ دیا تو ماجرا  
دریافت کیا۔ پھر خچر پہ سوار ہو کر بذات خود جیل خانہ گئے، داروغہ احترام سے پیش آیا۔ امام صاحب نے اس  
نو جوان کی سفارش کی اور اس کو ساتھ لاتے ہوئے کہا کہ ہم نے تجھے ضائع تو نہیں کیا نا؟  
اس نو جوان نے امام صاحب کے حسن سلوک کی وجہ سے توبہ کر لی، لیکن اگر وہ توبہ نہ کرتا تو؟..... ہم یہ تو  
نہیں کہتے کہ امام صاحب عالم الغیب تھے، مگر یہ ضرور کہتے ہیں کہ صاحب بصیرت تھے۔

دوستوں سے عرض کرتا ہوں کہ علماء سے متعلق کسی بھی واقعہ پر آپ کے پاس چوٹس ہے کہ حسن ظن  
سے کام لیں یا سوء ظن سے۔ حسن ظن غلط بھی ہو تو خدا نہیں پکڑے گا مگر سوء ظن کی جواب دہی کرنا پڑے گی۔

Team OFFICIALJAMIA

### ریڈی میڈ مفتی:

جدہ کونسلٹ کے ایک متدین دوست، ایک خاص ذی فضاء میں وقت گزار کر آئے، جہاں حدیث سن  
کہ ”براہے وہ شخص جو امارت کی خواہش رکھتا ہو، پس ان کے نزدیک مولانا فضل الرحمن اس لئے برا آدمی  
ہے کہ وہ الیکشن میں خود کو امارت کے لئے پیش کرتا ہے۔ ہمارے دوست کو شیخ الہند اور مولانا حسین احمد مدنی  
وغیرہ کے نام بھی نہیں معلوم، لیکن اپنے فتوے پہ قائم ہیں۔

عرض کیا: ”حضور! یہ حدیث امارت کے لئے ہے یعنی جس کو ”امر“ ہاتھ لینے کا شوق ہو۔ پارلیمانی  
نظام میں مشورہ ہوتا ہے، امر نہیں ہوتا۔ یہاں امیر نہیں بلکہ چھوٹے یا بڑے وزیر ہوا کرتے ہیں، کسی کو اعظم  
تو کسی کو اعلیٰ اور کسی کو خالی وزیر کہا جاتا ہے۔ وزیر مددگار ہوتا ہے۔ آپ کو یہ تو پتہ ہے کہ خدمت کے لئے خود  
کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہی صورتحال ہے اور کوئی آدمی خود کو اس امانت یا خدمت کا اہل سمجھے تو اسے  
ضرور خود کو پیش کرنا چاہئے“

کہنے لگے ”کان کو ادھر سے پکڑ دیا ادھر سے، ایک ہی بات ہے۔ حدیث کا صاف مطلب ہے کہ بڑائی  
والے عہدے کے لئے خود کو پیش کرنے والا برا آدمی ہے“

عرض کیا ”یوسف علیہ السلام کے متعلق کیا خیال ہے؟ انہوں نے عزیز مصر سے کہا کہ: مجھے وزیر خزانہ



بنادو، کیونکہ میں امین ہوں۔"

"اچھا؟..... ہیں؟۔ یہ قرآن شریف میں لکھا ہے کیا؟"

نہ جانے کیوں لوگ دینی علوم کو باز پچہ اطفال سمجھتے ہیں؟

### مولانا کو کل تہمت سے بچنا چاہئے:

میرا ایک دوست جو کہ مولانا فضل الرحمن کا پروانہ ہے مگر اس کو بھی ایک دینی اشکال لاحق ہوا ہے، کہنے لگا، محل تہمت سے بچنے کی حدیث ہے کہ: حضور ﷺ اپنی زوجہ کے ساتھ کھڑے تھے اور کسی کو بدگمانی سے بچانے، اس کو بلا کر اپنی پوزیشن واضح کی۔ مولانا پر کب سے الزامات لگ رہے ہیں، آخر وہ اپنی پوزیشن واضح کیوں نہیں کرتے؟

عرض کیا: پیارے! پوزیشن تو واضح کی ہے۔ ہر پروگرام میں تو کہا ہے کہ "یہ الزامات جھوٹ ہیں" اور کیسے واضح کرے؟ کوئی آدمی کھڑے کھڑے کہہ دے کہ آپ نے ایک لاکھ روپے کا ٹین کیا ہے تو آپ اس کے سوا کیا صفائی دیں گے کہ یہ جھوٹ ہے۔

کہنے لگا: مولانا! الزام لگانے والوں کو عدالت میں گھسیٹنا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ عرض کیا: سعودی عرب میں رہ کر بھی میرا اپنی چاہت سے کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں۔ حکومت نے آن لائن تنخواہ کیلئے اکاؤنٹ کھولنے پر مجبور کیا ہے، ورنہ میں بینک سے لین دین کو ایمانی لحاظ سے اچھا نہیں سمجھتا۔

گر بڑا گیا کہ کہاں کی بات کو کہاں جا بچایا؟ Team OFFICIAL JAMIA AT Rights of Publications reserved By 7 JUL Answer Back میں نے عرض کیا "ہم بینک کے سودی نظام کو دینی طور پر غلط سمجھتے ہیں، اسے پر امن طریقے سے بدلنے کے خواہاں ہیں۔ البتہ جب مجبور ہوں تو گراہتا اس میں اکاؤنٹ کھولتے ہیں۔ پاکستانی عدالتوں میں رائج فرنگی نظام انصاف، دینی عدالتی نظام کا برعکس نظام ہے۔ ہم اس نظام کو پر امن طریقے سے بدلنا چاہتے ہیں، جب تک یہ ہونی نہیں جاتا، حتیٰ الوسع ہم خود اس نظام کے بھکاری نہیں بنیں گے، ہاں کوئی اور مجبور کر دے تو الگ بات ہے۔ پس راخ العقیدہ علمائے دیوبند ذاتی نقصان اٹھانے کو تیار ہیں لیکن از خود قرآن و حدیث کی عدالت کے سوا فرنگی نظام عدالت کو اپنے مقدمات میں فیصل بنانے کو تیار نہیں۔ ہاں کوئی دوسرا آدمی ہمیں عدالت میں گھسیٹ لے جائے تو ہم سیدہ ٹھونک کر میدان میں موجود ہیں۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ مولانا، عمران خان کو ملک کے لئے نقصان دہ سمجھتا ہے، پر اس کے خلاف خود عدالت نہیں گیا۔ لیکن جب عمران خان نے مولانا کو عدالت کے ذریعے سمن بھجوایا تو مولانا نے خم ٹھونک کر



## جمعیۂ علماء اسلام کی سیاست



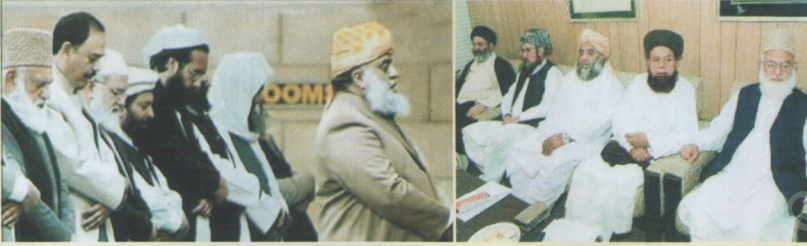
## پاکستان میں شریعت کی پھیلی تکریمات



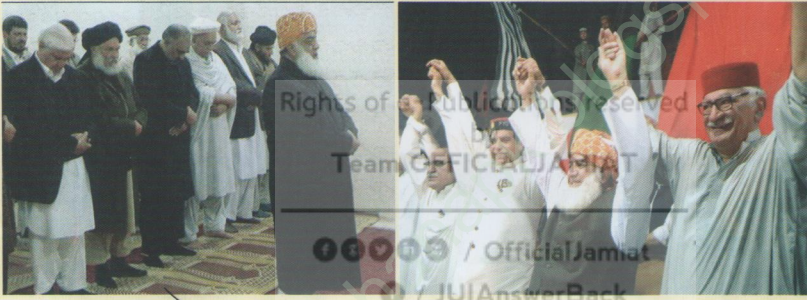
جمعیۂ علماء اسلام، بالغ النظر سیاست کرتی ہے یعنی حکومت اور ریاست میں فرق جانتی ہے۔ حکومت سے اختلاف کے باوجود، جہاں ریاست کا مفاد مقدم ہو، وہاں حکومت کا ساتھ دینا ضروری ہوتا ہے۔ افسوس، بعض سیاستدان جمہوری حکومت کے ساتھ کھڑا ہونا اس وقت تک پسند نہیں کرتے جب تک چھڑی سے ہانکا نہ جائے۔



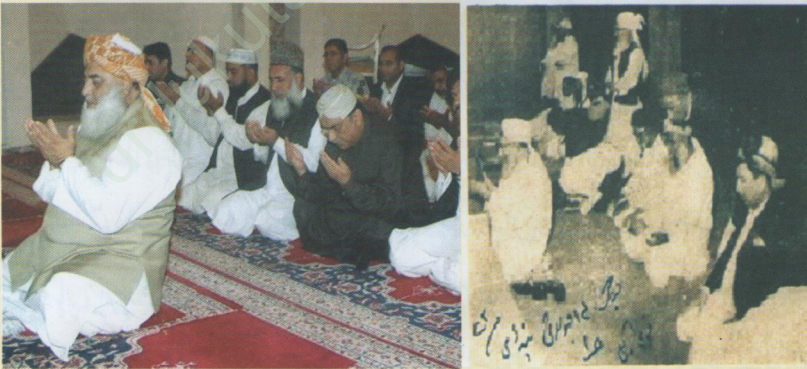
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز یہی ہے رخت سفر میر کا رواں کیلئے



جمعیت علماء اسلام کی سیاست کا پنچوڑ سب کو اپنے قریب لانا ہے، پھر سب کو خدا کے قریب لے جانا ہے



شاندار ماضی..... تابناک حال، روشن مستقبل





عدالت میں پیشی کی حامی بھری۔ وہ تو عمران خان خود ہی پیچھے ہٹ گیا کہ مولانا دہاں، اپنی بات کے ناقابل تردید ثبوت پیش کرنے والا تھا۔

پس یہی بات ہے کہ میڈیا اور ان کو دانہ دینکا ڈالنے والے، آپاروی فرشتے، مولانا کی عوامی کردار کشی کرتے رہتے ہیں لیکن کسی کو 30 سال میں یہ توفیق نہیں ہوئی کہ مولانا پر عدالت میں رٹ دائر کر دے۔ میرے پیارے! مولانا کی طرف سے اپنی صفائی کیلئے اس کی اپنی بات ہی کافی ہے۔ باقی عدالتوں کا دروازہ ہر محبت وطن کیلئے کھلا ہے اور مولانا، ان لیڈروں میں نہیں جو یا تو عدالت میں پیشی کی تاریخ بدلاتے رہتے ہیں یا عدالت پیش ہو کر، اپنے کہہ کی معذرت کیا کرتے ہیں اور پھر کارکنوں کو معذرت اور شرمندگی کی لغو تاویلوں سے بہلایا کرتے ہیں۔

### مولانا فضل الرحمن کا کمشنر بھائی اور کارکنان جمعیت:

حال ہی میں کسی نے بتایا کہ پانامہ لیکس پر خاموش رہنے کی قیمت مولانا فضل الرحمن نے وصول کر لی ہے اور وہ یہ کہ اس کے بھائی کو گریڈ 18 سے ڈائریکٹ گریڈ 20 میں پروموت کر دیا گیا۔

پہلے تو مجھے اس خبر پر حیرت انگیز خوشی ہوئی۔ یعنی مولانا کا بھائی پہلے 18 گریڈ کا افسر تھا۔ خوب بھائی میں تو سمجھتا تھا کہ مولوی بیچارے پڑھائی لکھائی میں صفر ہوتے ہیں۔ بلکہ اب تو یہ بھی پتہ چلا کہ مولانا کا وہ بھائی ایک پروفیشنل انجینئر بھی ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ مولانا کے گھر میں ماڈرن اینجینئرنگ کی نئی بات نہیں۔ اس سے میرے دل میں مولانا فضل الرحمن کی عظمت بڑھ گئی کہ اس نے اپنے دو بیٹوں کو مدرسہ میں قرآن کا عالم بنایا حالانکہ وہ چاہتا تو ان کو انجینیئر بنانے کا بھی داخل کر سکتا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس لئے مدرسوں میں پڑھتے ہیں کہ یہ ان کا فیملی بزنس ہے۔ اگر یوں ہے تو یہ افسر بھائی کیوں مدرسہ میں نہیں پڑھے؟ فیملی بزنس میں تو گھر کا دودھ پیتا بچہ تک گھسایا جاتا ہے، اپنے "شریفین عظیمین" کی مثال سامنے ہے۔

یہ بات البتہ مجھے ہضم نہیں ہوتی کہ مولانا کی قیمت اس کے بھائی کے دو گریڈ کی ترقی ہے۔ لوگ کہتے ہیں مولانا کرپٹ حکومتوں کو سہارا دیتا ہے۔ اب اگر ہر سہارے کے وقت اس کے بھائی کو دو گریڈ میں ترقی دی جائے تو آج اس کا گریڈ 96 ہونا چاہیے تھا مگر افسوس کہ پاکستان میں کل گریڈ ہی 22 ہیں۔ حیرت تو مجھے یہ بھی ہوئی کہ مولانا کے بھائی ابھی تک نوکری کیوں کر رہے ہیں؟



اس ملک کی روایت تو کچھ اور رہی ہے۔ نواز شریف کے اے ڈی سی کپٹن صفدر سے ملکی مفاد میں نوکری چھڑوا دی گئی تھی۔ اپنے جنرل کیانی صاحب، نے سپہ سالار بننے ہی اپنے دونوں بھائیوں کو میجر اور بریگیڈر کی عہدے سے میڈیکل بنیاد پر فارغ کروا کر ملکی خدمت پہ لگا دیا تھا۔ اپنے عادل ترین چیف جسٹس نے اپنے بیٹے ارسلان کو پولیس کی نوکری سے نکال کر ملک ریاض کا پارٹنر بنا دیا تھا۔ لیکن مولانا نے ابھی تک اپنے بھائیوں کو نوکری پر ہی رکھا ہوا ہے، چھی چھی چھی۔

خیر، میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے بھائی کی ترقی میں مولانا کا ہاتھ نہیں ہوگا بلکہ مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ اس کی تقرری میں بھی مولانا کا ہاتھ ہوگا۔ میرے بھائی! سیاسی لیڈر اسی لئے ہی ہوتے ہیں کہ لوگ ان کے پاس اپنی ملازمت، ترقی اور دیگر مسائل کیلئے آیا کرتے ہیں اور وہ ہر آنے والے کی سفارش کیا ہی کرتا ہے۔ قاعدے قانون دیکھنا حکومت کا کام ہوتا ہے، مولانا کے ہاتھوں اب تک ہزاروں لوگوں کی ملازمت اور ترقی ہوئی ہوگی، اگر اس کے اپنے بھائی کی بھی ہوگی تو اس میں مسئلہ کیا ہے؟ آخر کسی قاعدے قانون پر ہی ہوئی ہوگی نا۔ اور پھر اس کا بھائی، جس بھی گریڈ پر ملازمت کرتا ہو، وہ آخر کوئی کام کر کے ہی اپنی تنخواہ لیتا ہوگا نا۔

یہاں تو ہم نے ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ نواز شریف صاحب، اپنی صاحبزادی کو سات ارب کے فنڈ کا ڈائریکٹر لگا دیتا ہے، کس اہلیت پر، یہ کون پوچھے؟ اور تو چھوڑیں، اس ملک میں چشم فلک نے وہ نظارے بھی دیکھے ہیں کہ ایک لیڈر کو ایک رات، ایک چھوٹی قسم کی لڑکی پسند آتی ہے، دوسری رات اسے اپنی ملکہ بنا لیتا ہے اور اگلے ہفتے وہ ایک صوبے کی مالکن بن جاتی ہے، جس کو ساری بیوروکریسی جوابدہ ہوتی ہے۔ اور مشہور دانشور دلیل دیتے ہیں کہ وہ صوبے کی خاتون اول ہو گئی ہے۔ ایسے میں تو اپنے سگے بھائیوں کو سرکاری ملازمت پر رکھنا، بڑے دل گردے کی بات ہے بھائی۔

بات یہ ہے کہ اپنوں کا خیال رکھنا فطری سی بات ہے کہ جو اپنے کانہیں وہ پرانے کا کیا ہوگا؟ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مولانا نے اب بھی کمی ہی کی ہے۔ مولانا، اپنے بھائیوں کو انتخابات میں، عوام کے سامنے پیش کر دیا کرتا ہے۔ حالانکہ دستور یہ ہے کہ آدمی، اپنوں کو ایسے امتحانوں میں نہیں ڈالا کرتا بلکہ ڈائریکٹ مخصوص نشستوں پر منتخب کرا لیا کرتا ہے۔ جیسے قاضی حسین احمد مرحوم نے اپنی بیٹی کو قومی اسمبلی کا ممبر بنا دیا تھا یا اپنے پرویز خٹک وغیرہ وغیرہ۔

ادھر جمعیت کے سادہ لوح دوستوں کو دیکھئے کہ وہ مولانا کے بھائی کی ترقی کی دلیلیں، اس کا چھلا شاندار سروس ریکارڈ، اسی قسم کی دوسری مثالیں پیش کرتے پھرتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ مولانا کا بھائی بطور



سرکاری ملازم جمعیت کا ممبر نہیں اور نہ ہی ہم اس کے کسی قول و فعل یا ترقی و تنزلی کے ذمہ دار ہیں۔ مولانا کا بھراپرا خاندان ہے، آج اس کے بھائی کیلئے تو کل اسکے چچیروں میروں کیلئے دلائل ڈھونڈتے پھرو گے؟ صاف بات اتنی ہے کہ اس کی ترقی میں اگر مولانا کا ہاتھ ہے بھی تو اس میں کیا قیامت پڑ گئی ہے؟ سمجھنے والوں کے لئے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ پرویز خٹک اور پیسکو کے چیئرمین طارق سدوزئی کا ٹاکرا ہوا تو پرویز خٹک نے پریس کانفرنس میں کہا کہ اس چیئرمین کو مولانا نے ہم پہ مسلط کر رکھا ہے۔ تو بھائی! عرض یہ ہے کہ مولانا گریڈ 20، 22 سے بہت اونچی چیز ہے۔ آپ لوگ، اصولی اور نظریاتی دلائل پہ وقت لگایا کرو، ہر آواز پہ پتھر اٹھاتے پھرو گے تو پہنچ چکے منزل پہ۔ والسلام

Rights of e-Publications reserved  
by  
Team OFFICIALJAMIAI

📖📚📑 / Official Jamiat

📖 / JUAnswerBack



## باب سوم: عمران خان کی شخصیت

### عمران خان کا کردار:

لازم ہے کہ مولانا فضل الرحمن کی ذات پر سرعام رکیک حملے کرنے والے عمران خان کی شخصیت پر بھی ایک واقعاتی نگاہ ڈال لی جائے۔ میں عمران خان کے ماضی کو نہیں کھنگالوں گا اور نہ ہی مجھے اس کی غلطیوں کے کرتوتوں سے کوئی غرض ہے۔ لوگ سیتاوائٹ کیس کے حوالے سے بہت کچھ کہتے ہیں، مگر اس کی تفصیل یوسف صلاح الدین ہی بتا سکتے ہیں، جن کی حویلی میں وہ چار ماہ تک مہمان رہی اور جن کی گاڑی جوڑے کے استعمال میں رہی۔

انسان کمزور ہے، کسی سے بھی کوئی خطا سرزد ہو سکتی ہے۔ مجھے بہر حال، عمران خان کی جنسی ہوس سے زیادہ اس کی ذہنیت پر افسوس ہوا جب میں نے سیتاوائٹ کا وہ بیان پڑھا، جس میں اس نے کہا کہ: جب میں حاملہ ہو گئی تو عمران خان روز فون کر کے بچے کا پوچھا کرتا۔ جب میں نے عمران خان کو بتایا کہ الٹراساؤنڈ میں لڑکی معلوم پڑتی ہے۔ تو اس نے اصرار کیا کہ میں حمل گرا دوں۔ یہ کتنی گندی ذہنیت ہے کہ لڑکی کا باپ کہلانا کسی کو پسند نہ ہو۔ آدمی کو مرد بننا چاہئے، لڑکی ذات ضعیف ہے، مشرق کی ہو یا مغرب کی۔

آخر اسے باپ کے نام کی پہچان سے کیوں محروم رکھا جائے؟

مگر خیر، میری عمران خان سے کراہت کی وجہ اس کا دیگر کردار ہے۔

کہا جاتا ہے کہ کسی سے بھی نفرت نہیں کرنا چاہئے۔ یہ بات فی الحقیقت درست نہیں۔ محبت اور نفرت، آپ کے ہاتھ میں نہیں، البتہ اس کا جائزہ ضروری ہے کہ کس وجہ سے آپ کسی سے محبت یا نفرت کرتے ہیں؟ اگر وجہ جینوئین ہے تو محبت پہ بھی اجر ہے اور بغض پر بھی۔ ورنہ، کم از کم بغض پہ جوابدہی ضرور کرنا ہوگی۔ بعض اوقات کسی سے بلا وجہ بھی محبت یا نفرت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ فی نفسہ یہ غلط ہے، پر یہ بھی اختیار سے باہر چیز ہے۔ تاہم اس صورت میں بھی قرآنی حکم یہ ہے کہ کسی قوم کی دشمنی آپ کو عدل سے نہ ہٹا دے۔

عمران خان سے میری نفرت، نہ تو ذاتی بنیاد پہ ہے اور نہ ہی شروع سے ہے۔ بلکہ شروع میں تو عمران خان مجھے خاصا پسند تھا۔ آپ کے محبوب سے محبت کرنے والا، آپ کو خود بخود اچھا لگتا ہے۔ عمران خان نے مولوی نہ ہونے کے باوجود، وزارت عظمیٰ کیلئے مولانا فضل الرحمن کو ووٹ دیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی پہلے، جب وہ قومی اسمبلی کی آٹھ سیٹوں سے بیک وقت کھڑا ہوا تھا اور سب سے ہار گیا تھا، تب بھی میں اسے سپورٹ کرتا تھا اور دوستوں کے سامنے اس کی تعریف کرتا تھا۔



تحریک انصاف کے قومی اسمبلی کے پشاور سے ممبر حامد الحق میرے اچھے دوستوں میں تھے۔ 1996ء میں جب حامد نے تحریک انصاف جو اُن کرنے کا فیصلہ کیا تو دیگر دوستوں کے علاوہ میرا بھی یہی مشورہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ عمران خان میرے دل سے اتر گیا۔ پہلے اسے سادہ لوح اور لائی لگ آدمی سمجھتا تھا جو خلوص کے ساتھ بڑھکیں مارتا ہے، مگر مارچ 2013ء کے بعد سے اس سے بدگمانی شروع ہوئی، جواب کراہت میں بدل چکی ہے۔ اس کی وجہ اس کی دورنگی اور منافقت ہے۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ عمران خان کی جدوجہد کا اس کے سوا کوئی مقصد، کوئی ہدف یا کوئی آدرش نہیں کہ ان کو وزیراعظم بنادیا جائے۔

بات کو دیکھو، بات کرنے والے کو نہ دیکھو:

شروع میں عمران خان کی انقلابی باتیں سب کو اچھی لگتی تھیں، لوگ عمران خان کی بابت یہ محاورہ دہراتے تھے کہ بات کو دیکھو، بات کرنے والے کو نہ دیکھو۔ یہ بات درست ہے کہ اگر کوئی آدمی خود ”دو نمبر“ ہے لیکن آپ کو اچھی نصیحت کر رہا ہے، تو کہنے والے کو نہ دیکھو بلکہ اس کی بات کو دیکھو۔ مگر یہ ضرب المثل ادھوری ہے۔ مکمل بات یوں ہے کہ ”کسی کی نصیحت سننے کی حد تک اچھی بات پہ دھیان دینا ٹھیک ہے لیکن اسی اچھی بات کو رائج کرنے کیلئے اگر یہ ”دو نمبر“ آدمی، آپ کو اپنی پیروی کی دعوت دیتا ہے تو پھر بچ کر رہو۔ کیونکہ اس اچھی بات کی آڑ میں اس نے اپنا ”دو نمبر“ ایجنڈا ہی چلا نا ہے۔

دو نمبر آدمی کون ہوتا ہے؟

A man is known by the company he keeps. گلوبل دانش کہتی ہے۔ مکرر عرض ہے کہ مصاحبین، رشتہ داروں کو نہیں، ہم نفسوں یعنی آدمی اپنے مصاحبین سے پہچانا جاتا ہے۔ مکرر عرض ہے کہ مصاحبین، رشتہ داروں کو نہیں، ہم نفسوں کو کہتے ہیں۔ کسی اچھے آدمی کے رشتہ دار اگر دو نمبر ہوں تو اس کا دوش نہیں کہ رشتے خدانے بنائے ہیں لیکن دوست وہ آدمی خود چنتا ہے۔ اگر کسی کے دوست فراڈی ہیں تو یہ شخص خود بھی فراڈی ہے یا پھر انتہا درجہ کا سادہ لوح اور بے وقوف۔

مگر پاکستانی دانش چونکہ گلوبل دانش سے مختلف ہے۔ لہذا یہاں جس آدمی کے سارے ہمزاد فراڈی اور چور ہوں تو پھر بھی اس کو ”ایک نمبر“ کہا جاتا ہے (جیسے عمران خان کی اے ٹی ایم مشینیں) اور جس آدمی کے سب سپورٹر، دین دار اور امین ہوں، اسے ”دو نمبر“ کہا جاتا ہے، جیسے مولانا کے یہی خواہ علماء۔ عمران خان اور مولانا کو نہ سہی، ان کے مصاحبین کو جانچ لیں تو آدمی کی اصلیت سامنے آ جاتی ہے۔ عمران خان، ایک کٹھور دل اور بے اصول آدمی ہے:



میری عمران خان سے نفرت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اسے انتہائی بے حس، کٹھوردل اور بے اصول آدمی پایا ہے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اسلام آباد دھرنے کے دوران، کھلے میدان میں اور طوفانی بارش میں چند مخلص کارکن نے پاکستان کی خاطر سختیاں جھیل رہے ہیں اور موصوف، کنٹینرز کے اندر ایک خاتون صحافی سے پیار کی پیٹنگیں بڑھا رہے ہیں۔ پھر کنٹینرز میں نکاح بھی ہو گیا جس کی خبر بھی لیک ہو گئی۔ لیکن سچ بولنے والے موصوف مانے کو تیار نہیں، جب بالکل کوئی چارہ نہ رہا تو ایک رنگ بازی یہ فرمائی کہ بیوی کو لے کر اپنے پارٹی کے ایک مولوی کے مدرسے کے بچوں کے ساتھ ولیمہ منایا جانے کے فوٹو شوٹ کروائے جا رہے۔ ولیمہ تو نکاح کے بعد ہوتا ہے، نکاح کہاں ہوا تھا؟ پس سارا کام ہی ڈرامہ بازیوں پہ چل رہا ہے۔

آپ دیکھئے! عمران خان کا نہ تو ریحام خان سے نکاح نامہ موجود ہے، نہ طلاق نامہ۔ ہوا میں نکاح ہوا، ایس ایم ایس پہ طلاق۔ نکاح و طلاق کی بات میں ایمان و عقیدہ کی بنیاد پہ نہیں بلکہ قانون کے احترام کی بنیاد پہ کر رہا ہوں کہ عمران خان، قانون اور مسلم کی باتیں کرتا ہے، لیکن اپنا یہ حال ہے۔

خالی بے حس یا بے اصول ہی نہیں، بلکہ عمران خان درندگی کی حد تک کٹھوردل آدمی ہے۔

میں جاوید ہاشمی کی اور کی اس خبر کو بنیاد نہیں بناؤں گا جس میں انکشاف کیا گیا تھا کہ 2014ء کے دھرنے میں عمران خان اور طاہر القادری کا کم از کم 200 لاشیں گرانے کا پروگرام تھا۔

میں تو اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہوں۔

ملتان میں عمران کا جلسہ شروع ہے، گرمی سے لوگ مر رہے ہیں۔ تین نوجوانوں کی لاشیں، سٹیج پر کھینچ کر چڑھائی جا رہی ہیں۔ ڈی جے بٹ، سپیکر میں ایس بی لینس کے لئے چیختا ہے تو شاہ محمود قریشی، اسے چپ کر کر اپنا خطاب جاری رکھتا ہے۔ عمران سٹیج پر پوز بنائے وقفے وقفے سے میوزک پر تھرک رہا ہے اور لاشیں، آنکھوں کے سامنے لٹکائی جا رہی ہیں، کسی کو تو قیق نہیں کہ پروگرام روک کر، ان بدنصیب لاشوں کو عزت سے ایک طرف رکھ دے۔

بتائیے، کیا یہ درندگی نہیں ہے؟

دیکھئے! میں نے عمران خان کی کردار کشی نہیں کی۔ کردار کشی یہ ہوتی ہے کہ اپنی طرف سے ایک واقعہ بنا کر کسی کے کردار کو خراب کرنا۔ میں نے جس واقعہ پر عمران خان کا کردار جانچا ہے، میں اس واقعہ کی خبر ہی



نہیں، ویڈیو شہوت بھی پیش کر سکتا ہوں۔ رہا میرا تجزیہ، تو مذکورہ واقعہ ہر خدا خونی والے آدمی کے سامنے ہے جو دل پہ ہاتھ رکھ کر ہمیں بتائیے کہ لاشیں سچ پر لائی جائیں، تقریر اور گانے نہ رکھیں، قیادت بھی موجود ہو تو بھلا کونسا کردار ابھرتا ہے؟

عمران خان، دانستہ جھوٹ بولتا ہے:

یہ بات تو عمران خان کے حامی بھی مانتے ہیں کہ وہ حکمت سے خالی ہے۔ مگر مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ وہ دانستہ جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔ حکمت اور منافقت میں اتنا ہی فرق ہے جتنا جھوٹ اور ”توریہ“ میں ہوتا ہے۔ توریہ ذمہ جملہ ضرور ہوتا ہے مگر اسے جھوٹ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ سنا ہے مرزا غالب روزے نہیں رکھتے تھے، کسی نے پوچھا کہ: مرزا! کتنے روزے رکھے؟ اب اگر جوابا کہتے کہ اتنے رکھے ہیں تو جھوٹ ہوتا۔ مرزا نے کہا کہ: ”ایک نہیں رکھا۔“ اس کو توریہ کہتے ہیں۔

لاہور میں 23 مارچ 2013ء کو جلسے میں اس نے قوم سے 6 وعدے کئے تھے۔ صرف 2 سال کے اندر، جس طرح اس نے اپنے وعدوں کو جھوٹ ثابت کیا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔

وعدے ایفاء نہ کر سنا اور بات ہے اور اپنے وعدوں سے جاننے بوجھتے پھر جانا اور بات ہے۔ ذرا اس کے وعدوں پہ نگاہ ڈالئے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ قوم کو لولی پاپ دینے کا ماسٹر پہلے بنا کر وعدے کر رہا تھا۔  
Official Jam / Official Answer Back  
اس نے کہا تھا کہ: ”قوم سے ہمیشہ سچ بولوں گا۔“

روزانہ کی بنیاد پہ بولے جانے جھوٹ تو چھوڑیں، صرف ایک نجم سیٹھی کا تذکرہ ہی کر لیتے ہیں۔ عمران خان اپنے جوشیلے کارکنوں کو چار ماہ اشتعال دلاتا رہا کہ نجم سیٹھی نے الیکشن میں 35 حلقوں میں دھاندلی کر کے ہمارا الیکشن ہائی جیک کیا ہے اور میرے پاس اس کی گفتگو کا آڈیو ٹیپ موجود ہے۔

جب جوڈیشل کمیشن بنا تو اس نے پہلے نعیم الحق پہ ملبہ ڈال دیا، پھر کہا کہ سیاسی بیان تھا۔ مجھے نجم سیٹھی سے ہمدردی نہیں، لیکن فرض کریں جوشیلے نوجوانوں میں سے کوئی دشمن سمجھ کر، نجم سیٹھی یا اس کے اہل خانہ کو کوئی نقصان پہنچا دیتا تو عمران خان کیا کہتا؟

دوسرا وعدہ کیا کہ ”ظلم کے خلاف جہاد کروں گا“ اس کی بابت اس کے قابل اعتماد جٹس وجہ الدین سے دریافت کر لیں یا اس کے نامزد کردہ احتساب کمیشن کے سربراہ، جنرل حامد سے، کہ آیا وہ ظلم کے خلاف رہا یا ظالموں کا پشت پناہ۔



تیسرا وعدہ کہ "اقتدار سے نہ خود فائدہ اٹھاؤں گا نہ کسی اور کو اٹھانے دوں گا" اس کا حشر بھی سامنے ہے۔ اس نے پس پردہ، جہانگیر ترین کو صوبے کے وسائل حوالے کر کے اور پیش پردہ ریحام خان کو سٹریٹ چلڈرن کا ایمپیڈر بنا کر پورا کر دیا۔ اگر ریحام خان کو میرٹ کی بنیاد پر یہ کردار دیا گیا تھا تو طلاق کے بعد بھی اس سے نہ چھینا جاتا، کہ یہ ظلم تھا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ صرف عمران خان کی بیوی ہونے ناطے ہی اسے یہ منصب ملا تھا۔

چوتھا وعدہ کہ "عوام کے ٹیکس کی حفاظت کروں گا۔" عوام کے ٹیکس کی حفاظت تو بعد کی بات ہے جب وہ وزیر اعظم بنے گا۔ فی الحال تو تین سال سے عدالت اسے بلا رہی ہے کہ چندے میں گڑبڑ کا حساب دے، اور وہ تاریخ پہ تاریخ لے رہا ہے۔

پانچواں وعدہ کہ "ایسا وعدہ نہیں کروں گا جو پورا نہ کر سکوں" اس پہ ہنسنے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ "اپنے لیڈر، آپ چنوالی توالی" کی گونج ابھی باقی ہے۔

چھٹا وعدہ کہ "گورنر ہاؤس کو لائبریری بناؤں گا" یہ وعدہ بھی پورا نہ ہوا۔ چلیں اگر یہ مشکل تھا تو وزیر اعلیٰ ہاؤس کو لائبریری بنا دیتے۔ اس میں کونسے پیسے خرچ ہوتے ہیں؟ وہ بھی نہیں ہو سکتا تھا تو 300 کنال کے بنی گالہ میں سے ہی ایک کونے کو لائبریری بنا دیتے۔ اس میں تو نواز شریف آڑے نہیں آ سکتا تھا۔

مگر یہ سب صرف رنگ بازی ہی تھی۔ بہر حال ایک طرف معصوم کارکنان ہیں، جن کو سمجھ نہیں آتی کہ عمران خان کو کیسے ایک دیوتا ثابت کرویں؟ کبھی قائد اعظم تو کبھی جی گوہر ا ثابت کریں گے۔ ادھر لیڈر صاحب ہیں کہ کبھی تو خلافت راشدہ کا نظام لانے کا نعرہ لگاتے ہیں، کبھی ڈنکے کی چوٹ ایک معروف قادیانی کو فنانس منسٹر بنانے کے دعوے فرماتے ہیں (اور کنٹیننر پہ کھڑے ہو کر اس کے نام کے اعلان کا کیا موقع تھا؟ کیا کسی کو پیغام دینا تھا.....؟)

### شوکت خانم ہسپتال:

عمران خان کے پروانوں کے پاس، تروپ کا پتہ شوکت خانم ہسپتال ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رفاہی ہسپتال، اگرچہ قوم کے چندے سے بننا ہے اور ہسپتال کے لئے زمین، نواز حکومت نے دی تھی تاہم بہر حال، اس کا سہرا عمران خان کے سر ہے۔

مگر سوشل ورکر اور لیڈر میں فرق ہوتا ہے اور رفاہی کام کرنے والے کو فقط اسی بنیاد پر حکومت کا حق نہیں دیا جاسکتا کہ اس نے خیراتی پرجیکٹ چلایا ہے۔ حقیقی رفاہی کارکن اقتدار چاہتے ہی نہیں ہیں۔



بہر حال جس طرح عمران خان نے قوم کے چندے سے تعمیر کردہ اس ہسپتال کو اپنی ذاتی پروجیکشن کیلئے استعمال کیا ہے، اس سے وہ ایک لیڈر کی بجائے ایک سٹیجی آدمی کے طور پر اجاگر ہوا ہے۔ اپنے اقتدار کے آخری دنوں میں سخت سیاسی رقابت کے باوجود اے این پی کی حکومت نے پشاور شوکت خان ہسپتال کیلئے زمین عطیہ کر کے اخلاقی برتری کا ثبوت دیا ہے۔ اس موقع پر میں نے عمران خان کی ہسپتال پالیسی کو مندرجہ ذیل پیرائے میں بیان کیا:

### جامع مسجد شوکت خان مرحوم:

ہمارے یار فرقان خان کی جوانی کیا گئی، نوکری بھی ساتھ ہی گئی اور شبانہ روز کے اللے تللوں نے زندگی مشکل کر دی۔ مگر بھائی فرقان بڑا تیز بندہ ہے، بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ایسا منصوبہ بنایا کہ "رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی" والا محاورہ اس پہ فٹ آتا ہے۔

دراصل ہمارے گاؤں میں جامع مسجد کی بہر حال ضرورت تھی۔ فرقان کی کمشنر صاحب سے سلام دعاء تھی۔ ان سے کہا کہ ہمارے گاؤں میں ایک جامع مسجد کی ضرورت ہے، اگر زمین مل جائے تو میں اپنی کچھ رقم سے یہ نیک کام کرنا چاہتا ہوں۔

کمشنر نے حکومتی زمینیں آپس میں بندر باند کے لئے رکھی تھیں، مگر اس نیک کام میں ان کو بھی اپنی مغفرت نظر آئی اور اس نے زمین کے علاوہ کچھ رقم بھی فراہم کر دی۔

یوں تو فرقان اپنے والد شوکت خان کا ہمیشہ نافرمان رہا تھا (شادی بھی اسکی مرضی کے خلاف کی تھی) لیکن پلاٹ ملے ہی اس نے والد کے نام سے "جامع مسجد شوکت خان مرحوم" کا بورڈ لگا کر چندہ مانگنا شروع کر دیا (والد کے نام کا استعمال، ایک جذباتی داؤ ہے)

مگر گاؤں کے لوگ سادہ طبیعت ہیں، وہ مسجد کا چندہ نام دیکھ کر نہیں دے رہے تھے، لیکن جب مسجد مکمل ہو گئی اور فرقان نے اس پر سپاہ صحابہ کا جھنڈا بھی لگا دیا تو کچھ لوگوں نے دبے لفظوں شکایت کی کہ مسجد سب گاؤں کے چندے سے بنی ہے، اس کو فرقہ واریت کی بھینٹ نہ چڑھایا جائے۔ لیکن وضع دار لوگ ہیں، پس بات زیادہ اچھالی نہیں۔

یوں تو فرقان اس مسجد کا مہتمم ہونے کے باوجود خود کوئی تنخواہ نہیں لیتا، تاہم اس کو دوسرے منافع بہت مل جاتے ہیں۔ سیاسی و مذہبی لیڈر اب اس مسجد کی وجہ سے اس کے دربار پر حاضر ہوتے ہیں، اس کو اپنے ساتھ ملانے کو بہت نذرانے بھی پیش کرتے ہیں۔ نوجوان خاص طور پر فرقان پہ فدا ہیں، کیونکہ اس کے پاس



نوجوانوں کو کورجھانے کے کئی گرہیں۔ مثلاً اٹھتے بیٹھتے دہراتا رہتا ہے کہ کوئی اور مائی کالال ایسٹیک کام نہیں کر سکا، وغیرہ وغیرہ۔

مسجد کے چندے کا حساب وہ کبھی نہیں دیتا، البتہ اگر کچھ لوگ مسجد کے چندے میں گڑبڑ کی بابت سوال اٹھاتے ہیں تو وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ بھائی میں تو کوئی تنخواہ ہی نہیں لیتا۔ غرض وہ مسجد اب اس کا سیاسی ڈیرہ اور مالی آمدن کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اور اس کی پانچوں گلی میں ہیں۔

اب فرقان اگرچہ خود ایک بڑے شہر میں کئی کنال کے گھر میں رہتا ہے مگر پچھلے دنوں پھر کمشنر صاحب سے ملا اور ان سے دوسرے گاؤں میں بھی باپ کے نام پر جامع مسجد بنانے کی زمین الاٹ کروالی ہے۔ فرقان کی اس روز افزوں کامیابی کے پیچھے اس کی یہ ذہانت ہے کہ اس نے گاؤں کے تھانیدار کو ساتھ ملایا ہوا ہے جو زیادہ مین میخ لگانے والوں کے کماحقہ علاج کا بندوبست کرتا رہتا ہے۔

دعا کریں کہ خدا باقی پتھر دل لوگوں کو فرقان خان کی طرح نیک اعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ:

۔ ایں سعادت بزور بازو نیست

Rights of e-Publications reserved  
by

Team OFFICIAL AMIAT

مضمون ختم ہوا۔

ایک عجیب بات آپ نے نوٹ کی ہوگی کہ ماں کے نام پہ ناز کے برعکس، عمران خان اور الطاف حسین صاحب دونوں حضرات اپنے والد صاحبان کا تذکرہ نہیں کیا کرتے۔ الطاف صاحب کے والد پنجابی تھے اور خان صاحب کے والد، مجگہ زراعت کے سرکاری ملازم۔ کیا اس بارے میں مزید باز پرس، دونوں حضرات کی طبیعت پہ گراں گذرتی ہے؟

عمران خان، منفرد سیاستدان:

راقم، عمران خان کو لیڈر تو کیا ایک عام سیاسی کارکن بھی ماننے کو تیار نہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ اس پر اتنے صفحے کالے کرنے کی ضرورت کیوں ہوئی؟ تو اس پہ ذرا وضاحت کر دوں۔

عمران خان جیسے خوش فہم آدمی کو پاکستانی سیاست میں کوئی اہمیت تھی ہی نہیں۔ تاہم 2011ء میں اچانک اس کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور اب یہ ماننا پڑے گا کہ گزشتہ تین برس سے پاکستان بھر کا میڈیا، سیاست، موضوع گفتگو، عمران خان پر مرکوز ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر یہ ہرگز اس بات کا ثبوت نہیں کہ عمران خان بہت عظیم لیڈر ہے۔ ضروری نہیں کہ کسی کا موضوع گفتگو ہونا اس کی اچھائی کا ثبوت ہو۔

ایک گاؤں میں نیا سکول ٹیچر آیا۔ ہر ایک سے خلیق، ہر ایک کا مددگار۔ گاؤں کے بچوں کو مفت پڑھانا



شروع کیا۔ گاؤں بھر کا موضوع، اس استاد کی ذات ہے۔ اسی گاؤں میں ایک ننگ دھڑنگ نشئی کھس آیا۔ ہر ایک کو گالی، ہر ایک کے پیچھے پتھر لے کر دوڑ رہا۔ یہ بھی تو گاؤں بھر کا موضوع ہے نا۔ خواہی نہ خواہی ہر بیٹھک پاس آدمی کا تذکرہ ہے کیونکہ ہر شریف آدمی، اس سے اپنے کپڑے بچاتا پھر رہا ہے۔

لیڈر بنائے نہیں جاسکتے بلکہ لیڈر پیدا کئی ہوا کرتے ہیں۔ میڈیا، ایجنسیاں، پیسہ وغیرہ کی کمک ایک لیڈر کو نمایاں تو کر سکتے ہیں لیکن جواز لیڈر نہ ہو، اسے دنیا بھر کی ایجنسیاں مل کر بھی لیڈر نہیں بنا سکتیں۔

جب میرا بیٹا دو سال کا تھا، اسے چچا نے کندھے پہ اٹھایا تو وہ کہنے لگا میں ابو سے اونچا ہو گیا ہوں۔ جنرل حمید گل اور جنرل پاشا کے مشترکہ کندھوں پر چڑھ کر عمران خان خود کو سب لیڈروں سے بڑا لیڈر سمجھنے لگ گیا ہے۔ جس بد لے سے ادائیں نہیں بدلی جاسکتی۔

لیکن خدا کو جان دینی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ پاکستانی سیاست میں، عمران خان کو بہر حال ایک خاص انفرادیت حاصل ہے۔ عمران خان اس اعزاز میں یکتا ہے کہ وہ خود کو پاکستان کا سب سے مقبول اور سب سے زیادہ نامقبول سیاستدان ثابت کر چکا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کا وہ واحد سیاستدان تھا جسے بیک وقت قومی اسمبلی کے چار حلقوں سے عوام نے کامیاب کر لیا تھا، اس کے بعد دوسرے نمبر پر ایسے لیڈر نہیں جو بیک وقت، قومی اسمبلی کے تین حلقوں سے کامیاب ہوئے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں ایسے تین سیاستدان ہیں یعنی جاوید ہاشمی، مولانا فضل الرحمن اور عمران خان۔ ظاہر ہے کہ تین حلقوں سے بیک وقت جیتنا، عوامی مقبولیت کی علامت ہے۔ جس میں عمران خان کے علاوہ دو اور شخصیات بھی شامل ہیں۔

مگر یہ اعزاز صرف اور صرف عمران خان کو حاصل ہے کہ قومی اسمبلی کے بیک وقت آٹھ حلقوں سے بطور امیدوار کھڑا ہوا اور آٹھوں حلقوں سے بیک وقت بری طرح شکست کھائی۔

اس سے ملتی جلتی ایک اور مثال بھی ہے۔ جب طاہر القادری کی عوامی تحریک نے بھی اپنے ظہور کے وقت، اچانک ہی مینار پاکستان پہ تاریخ ساز جلسہ کیا تھا اور اس کے بعد کے الیکشن میں پاکستان کے 125 حلقوں سے امیدوار کھڑے کئے تھے، جو پیپلز پارٹی کے بعد دوسرے نمبر پہ تعداد تھی۔ لیکن کوئی ایک بھی قومی یا صوبائی سیٹ نہ جیت سکے۔

اور ایک منفرد اعزاز امیر جماعت اسلامی، قاضی حسین احمد مرحوم کا ہے، جو "خالمو! قاضی آ رہا ہے" کے نعرے کے ساتھ تین قومی سیٹوں پہ کھڑے ہوئے، تینوں میں ہارے۔ لیکن کراچی والی سیٹ کا نتیجہ ایک منفرد ریکارڈ ہے جہاں ان کے حریف ایم کیو ایم کے کنور نوید کو 1 لاکھ 80 ہزار ووٹ پڑے اور قاضی



صاحب کو 3 ہزار روٹ۔ ایسے اعزازات کے حامل سیاستدانوں کو منفرد نہیں "وکر" کہا جاتا ہے، کیونکہ ایسی انفرادیت سے عظمت ثابت نہیں ہوا کرتی۔

### عمران خان اور سوشل میڈیا:

عمران خان کو عظیم ثابت کرنے میں فقط سوشل میڈیا کا ہاتھ ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ جن لوگوں نے ان کو سوشل میڈیا کے داؤ بیچ سکھائے، وہ جنگی پلان کی تربیت ضرور حاصل کر چکے ہوں گے (اگرچہ تھوری اور پریکٹیکل میں فرق ہوتا ہے)

آج کل عمران خان کی کریڈیبلٹی کافی ڈاؤن ہے، پس اس کے حامیوں کی نئی سٹریٹیجی یہ ہے کہ سوشل میڈیا پہ روزانہ کم از کم پانچ پوسٹیں شیئر کرتے ہیں، جن میں سے دو قرآن وحدیث پر مبنی ہوتی ہیں (تاکہ سچائی کا تاثر قائم ہو) دونوں ایک کے خلاف اور ایک عمران کو مسیحا ثابت کرنے کے لئے۔ جس کے لئے خیر پختونخوا کے فوٹو شاپ پر ایکٹس کی تصاویر شامل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

آپ آج کل ان سے (سوشل میڈیا پہ) گفتگو کریں تو یہ پہلے کہیں گے کہ ہم تو کسی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے اور اس کے بعد عمران کے ہر مخالف پر سچڑا اچھالنا شروع کر دیں گے۔ سوشل میڈیا، عمران خان کے حامیوں کے ہاتھ کیا آیا، گویا بندر کے ہاتھ استرا آ گیا۔

ایسے ہی سٹی لوگوں نے مولانا کو بدنام کرنے ایک ویڈیو بنائی، مگر دارالناظر گیا۔ ویڈیو میں یوں ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا فضل الرحمن کسی انٹرپورٹ پر اتر چکے ہیں (ظاہر ہے کسی کے مہمان ہیں) استقبال کرنے والوں کے ساتھ، ایک "پڑھا لکھا" پختون بھی موجود ہے (کیونکہ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھا ہے) یہ صاحب بطور خاص اس موقع کی ویڈیو بنانے کا انتظام کر کے آئے ہوئے ہیں۔

بہر حال، اس پڑھے لکھے شفتالو نے مولانا سے ہاتھ ملاتے ہی سوال داغ دیا کہ آپ ہر حکومت کے ساتھ ہوتے ہیں، آپ نے پختونوں کے لئے کیا کیا؟ پختون کی حالت کب بدلے گی؟

آنے والے مہمان سے، کسی کے گھر پہنچتے ہی کوئی پختون تو ایسا سلوک بہر حال نہیں کرتے کیونکہ یہ مہمان کی نہیں، میزبان کی بے عزتی ہوتی ہے جو پختون روایات کے خلاف ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ مولانا نے انٹرپورٹ کے بعد کسی ہوٹل یا حجرہ میں خطاب بھی کرنا ہوتا ہے اور وہاں اطمینان سے سوال و جواب بھی ہوتے ہیں، اس "پڑھے لکھے" نمونے کو چٹائی نشین مولوی کا مسکت جواب سنیں۔ کہا "جب پختونوں کو یہ عقل آئے گی کہ کوئی بات، کس موقع پر کرنی ہے؟"



اس ویڈیو کے بنانے والے کا خیال تھا کہ مولانا ان کے لیڈر عمران خان کی طرح کم ظرف ہوگا جو پریس کانفرنس میں صحافی کے منطقی سوال پر بھی اس کو ڈانٹنے لگا (اور بعد میں معذرتیں کرتا پھرے گا) خیر، موصوف کا من پسند ہنگامہ ریکارڈ نہ ہو سکا۔ اگرچہ اس ویڈیو کو پھیلانے میں بھی انصافی دوستوں نے کافی محنت کی۔ الٹا، سنجیدہ لوگوں کو مولانا کا برجستہ جواب پسند آیا۔

کچھ بار لیش انصافی بھی ہوتے ہیں، جن کا نشانہ مولانا فضل الرحمن کی ذات ہے، ان میں سے کچھ تو مننی اور عرفات میں نعرے لگاتے پھرتے ہیں، مگر ایسے انصافی، مولانا کو ملفوف گالیاں دینے سے پہلے یہ ضرور کہیں گے کہ ہم مفتی محمود صاحبؒ کی عظمت کے قائل ہیں۔ حالانکہ یہ فظ رنگ بازی ہوتی ہے، ان کے ہی آباؤ اجداد، مفتی محمود مرحوم کو گالیاں دیتے ہوئے یہی کہا کرتے تھے کہ: ہم مولانا اشرف علی تھانوی کے عظمت کے قائل ہیں“

بہر حال، عمران خان کے لئے امید کی آخری کرن سوشل میڈیا ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اب سوشل میڈیا کا میدان بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

### مولانا فضل الرحمن اور عمران خان:

اگرچہ عمران خان کا فتنہ پلان (جسے وہ سونامی کا نام دیتا ہے) مشرقی اقدار کے لئے زوال اور بالخصوص خیبر پختونخوا کیلئے بد معنی کا موجب ہے، مگر مولانا فضل الرحمن کیلئے غیبی امداد بن گیا ہے۔

خود سوچئے کہ بظاہر کرپشن کو ختم کرنے کے نعرے کیسا تھ تحریک انصاف کی حکومت بنی، اپنے بے لاگ احتساب کا ادارہ بنایا، اے این پی کے سینیٹر، سابق وزیر اعلیٰ حیدر ہوتی، خود اپنے وزرا اور افسران کو کرپشن کے الزامات کے تحت گرفتار کرنے کے ڈرامے رچانے کے بعد یوٹرن لے لیا مگر مولانا فضل الرحمن کی بدترین دشمن حکومت عرصہ تین سال میں مولانا تو کیا، جمیعت کے ضلعی لیول کے کسی راہنما تک کو کرپشن پر گرفتار نہ کر سکی۔ بلکہ گرفتاری تو دور کی بات، کرپشن کا خالی الزام بھی نہ لگا سکتی تو کیا یہ خدائی امداد نہیں؟ اگر صوبے میں عمرانی حکومت نہ ہوتی تو میڈیا کے پھیلانے گند کی وجہ سے شاید اپنے کارکنان بھی مولانا بارے متروک ہو جاتے۔ چنانچہ عمران خان مولانا کیلئے رحمت ثابت ہوا ہے۔

خدا کی قدرت دیکھئے کہ ایک طرف دشمن کے ہاتھوں مولانا کی امانت کی گواہی دلا رہا ہے، تو دوسری طرف آئے روز اپنے ہی ہم پیالہ دوستوں کے ہاتھوں عمران خان کے کر تو ت فاش ہو رہے ہیں۔ ایک بار ایک انصافی دوست نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا "کیا آپ عمران خان کو دیانتدار نہیں سمجھتے؟"



عرض کیا "بھائی! کوئی دوسرا نہ بھی کہے تو میں عمران خان کو ضرور دیا نندار کہوں گا۔ وہ اس لئے کہ پہلی بار 1996 میں ڈیزل سپلائی میں مولانا کا نام آیا، پھر 1998 میں نواز شریف کے ایما پر اے این پی نے باقاعدہ اسے مہم کی شکل دے کر مولانا ڈیزل نام مشہور کیا۔ پھر اس الزام کے چھ سال بعد، یعنی 2002ء میں مشرف دور میں وزارت عظمیٰ کے لئے تین امیدوار میدان میں تھے۔ ظفر اللہ جمالی، امین فہیم اور مولانا فضل الرحمن۔ اوپن ووٹنگ تھی، عمران خان نے اپنا ووٹ مولانا فضل الرحمن کو دے کر مولانا کو ایک دیانت دار اور اہل لیڈر قرار دیا تھا۔"

اگر ایسا ہے تو دوبارہ عمران خان نے اسے مولانا ڈیزل کہنا کیوں شروع کر دیا؟

"اگر وہ ایسا نہ کرے، تو پھر اور کیا ثبوت ہے کہ وہ عمران خان ہے؟

مگر معصوم انصافی کارکن، کہاں کہاں سے دلائل اٹھا کر، عمران خان کی مولانا فضل الرحمن پہ برتری ثابت کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ایک خاصے معقول صاحب نے فرمایا: آپ عمران اور مولانا کا تقابل کرتے ہو حالانکہ عمران وہ واحد لیڈر ہے جسے اعزازی طور پر بریڈ فورڈ یونیورسٹی نے وائس چانسلر کا عہدہ دیا ہے۔ عرض کیا: ہمارا تقابل بطور سیاستدان ہو رہا ہے، عمران خان چند دیگر شعبوں میں بھی ممتاز ہے۔ تو کیا ہر بات میں تقابل کریں؟ یعنی مولانا سے پوچھا جائے کہ کتنے رز بنائے ہیں یا عمران سے پوچھا جائے کہ کتنے جمعے پڑھائے ہیں؟ رہی مغربی دنیا کے اعزازات کی بات، تو وہ چاہے ملالہ کا نوبل پرائز ہو یا عبید شرمین کا آسکر ایوارڈ، ہمارے لئے کچھ وقعت نہیں رکھتے۔

کہنے لگے: لیکن تعلیم تو بہر حال ہر سوسائٹی کیلئے قابل احترام شعبہ ہے، کیا آپ نہیں سمجھتے کہ ایک غیر ملکی یونیورسٹی اگر ہمارے ایک سیاستدان کو اس قدر عزت دیتی ہے تو یہ پورے پاکستان کیلئے عزت ہے؟ عرض کیا: تقابل اگر یونیورسٹی کے اعزاز پر ہے تو انڈیا کا دارالعلوم دیوبند، بریڈ فورڈ یونیورسٹی سے کہیں زیادہ معزز ہے۔ انہوں نے اپنے یکے از صد سالہ تقریبات میں مولانا فضل الرحمن کو بطور مہمان خصوصی بلا کر عزت افزائی فرمائی تھی۔ اس بارے آپ کیا کہیں گے؟

اب موصوف نے اگلا اعزاز بتایا کہ: میرے لیڈر کی تصویر ٹائم رسالے کے سرورق پہ چھپی ہے۔ دنیا کی 100 پر اثر شخصیات میں اس کا نام آیا ہے۔

عرض کیا: میرے لئے اس میں یہی بات کافی ہے کہ تیرے لیڈر نے، میرے لیڈر کو اپنا لیڈر مانا ہے جب 2002ء میں وزارت عظمیٰ کیلئے اپنا ووٹ مولانا فضل الرحمن کو دیا ہے۔

پینتر اہل کر فرمایا: یہ تو اس کا ظرف ہے، مولانا میں اتنا ظرف نہیں کہ اس کو لیڈر مان سکے۔



عرض کیا: محترم! یہ ظرف کی نہیں، دنیا کے دستور کی بات ہے کہ کارکن، لیڈروں کو فالو کیا کرتے ہیں، لیڈر کبھی کارکنوں کو فالو نہیں کیا کرتے۔

بعض انصافی دوست تو مولانا فضل الرحمن بارے اس قدر گندی زبان استعمال کرتے ہیں کہ الامان والحفیظ (پی ٹی آئی کے پنجاب کے علما ونگ کے صدر مفتی عبدالقوی کی عزت افزا ویڈیوز کے علی الرغم بھی) ایک انصافی دوست نے فرمایا: جتنی محنت مولانا فضل الرحمن نے نواز شریف اور زرداری کو بچانے کیلئے کی ہے، اتنی عوام کی فلاح کیلئے کرتا تو آج اس کی کوئی عزت ہوتی۔

ایک طرف انصافی حضرات، مولانا کی کوئی حیثیت ماننے کو تیار نہیں، دوسری طرف وہ مولانا کی وجہ سے نواز شریف حکومت کی بقاء سمجھتے ہیں۔

عرض کیا "اس اعتراف کا شکریہ کہ مولانا فضل الرحمن اس ملک کا وہ طاقتور ترین آدمی ہے جس کی وجہ سے زرداری اور نواز شریف آج تک بچے ہوئے ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ "انگلی دہندہ" و "انگلی کندہ" نے بھی جتنی محنت نواز شریف کو بھٹانے کیلئے کی، اتنی عوام کی فلاح کیلئے کرتے تو آج ان کی کوئی عزت ہوتی۔ اب عزت داری کی طرف آئیے!

تین قسم کی عزت ہوتی ہے، ایک دنیاوی عزت جو قوموں کے لیڈر دوسرے لیڈروں کو دیا کرتے ہیں۔ ایک دین داروں کی طرف سے عزت ہے، جو اللہ والے کسی کو دیتے ہیں۔ تیسری ان سچ طبقات کی عزت ہے جو ہماری سوسائٹی میں کنجہ برادری کہلاتی ہے۔ جیسے آوارہ لڑکیاں، کسی دادا برابر بندے کو لوٹتیج کے پبلک ویڈیو بھیجا کرتی ہیں۔

آپ ان میں سے کس عزت کی بات کر رہے ہیں؟ بفضل خدا پہلی دو عزتیں تو مولانا کو حاصل ہیں۔ کہنے لگے: میں تو اللہ والوں کی عزت کی بات کرتا ہوں، مگر مولویوں کی نہیں بلکہ تبلیغ والے بزرگوں کی بات کرتا ہوں۔

عرض کیا: آپ کو تو پتہ ہے ناکہ تبلیغی جماعت کے امیر حاجی عبدالوہاب صاحب، مولانا کے گھر ڈیرہ اسماعیل خان ملنے گئے تھے؟

کہنے لگے: وہ تو مولانا کو ڈانٹنے گئے تھے۔

عرض کیا: چلو یہی سہی۔ کوئی قلبی تعلق تھا تو مرکز کی مصروفیات سے وقت نکال کر مولانا کے گھر گئے تھے۔ اس پر فرمانے لگے: یوں تو مولانا طارق جمیل بھی گئے تھے عمران خان کے پاس۔

عرض کیا: مولانا طارق جمیل صاحب بہت جگہوں پہ جایا کرتے ہیں۔ خیر عمران خان سے ملاقات



بارے ان کا کہنا ہے کہ حج کی دعوت دینے گئے تھے، جو اس نے قبول بھی کر لی (اور حسب عادت یوٹرن بھی لے لیا) تو کیا حاجی صاحب، مولانا کو حج کی دعوت دینے گئے تھے؟  
انصافی کہنے لگا: آپ کسی اور طرف چلے گئے ہیں، پس بحث نہیں کرتے۔  
راقم کا دعویٰ ہے کہ انصافی دوست جن خبروں کی بنیاد پر مولانا کو بدنام کیا کرتے ہیں، ان کا ثبوت تو کیا ان کو توڑ مروڑ کر بھی درست ثابت نہیں کر سکتے۔

جب کوئی اور دلیل نہ ملے تو مرنے کی وہی ایک ٹانگ یعنی افغان جہاد اور مولویوں کے ڈالر کا قضیہ چھیڑ بیٹھتے ہیں۔ مگر یہ دلیل بھی مولانا کے خلاف استعمال نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اگر امریکی ڈالر، جہادی ملا اور جنرل ضیا کو رکھ کر مثلث بنانی ہے، تو یاد رہے کہ مولانا فضل الرحمن جنرل ضیاء کے زمانے میں معتبوب اور محبوس تھا، مگر اس زمانے میں فوجیوں کے ہمراہ جو ملا پیش پیش تھے، ان کے مدرسے کو عمران خان نے مزید سرکاری رقم فراہم کر کے گویا اس عمل کی تائید کر دی ہے (اگرچہ یہ بھی ان کو خریدنے کے لئے ٹانگ کیا گیا ہے) بہر حال، مولانا فضل الرحمن بارے گندی زبان استعمال کرنے والے، چند منٹ بھی منطق و دلیل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

Rights of e-Publications reserved  
by  
Team OFFICIALJAMIA

①②③④⑤ / OfficialJamiat

① / JUIAnswerBack



## باب چہارم:

## مولانا فضل الرحمن سے میرا ذاتی اختلاف

مولانا کی بہت سی پالیسیوں سے میرا اختلاف رہا ہے۔ دینی جماعتوں پر معقول اعتراضات اٹھانا اور ان کو اچھا مشورہ دینا بھی آپ کی دینی ذمہ داری ہے، تاہم اس اختلاف کے بھی اپنے آداب ہیں۔ آپ کو کسی دوست سے اختلاف ہو تو پہلے اسے تنہائی میں متوجہ کرو، اگر آپ کا اعتراض اس کے ذاتی فائدے نقصان سے تعلق رکھتا ہے تو پھر نصیحت کرنے کے بعد آپ کی ذمہ داری ختم۔

اگر آپ کا اعتراض، اجتماعی کام کے سلسلے میں ہے اور خلوت میں آپ کی بات پہ کان نہیں دھرا جا رہا تو اعلانیہ اپنا اختلاف بیان کرو۔ مگر جماعت سے جدا ہونا تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اگر آپ اپنے ہم نظریہ ساتھیوں کی جماعت میں رہ کر ان کی اصلاح نہیں کر سکتے تو اپنے نظریہ کے مخالفین کے ساتھ مل کر اور ان کو مضبوط کر کے بھلا کیا دینی خدمت کریں گے؟ البتہ اگر آپ نے نظریہ ہی بدل لیا ہے یا آپ کی پوری جماعت نے اپنا نظریہ بدل لیا ہے تو پھر کھلی مخالفت میں حرج نہیں۔

تبلیغی جماعت اور جمعیت علماء اسلام دونوں میرے لئے عزیز ہیں، ان کی بھلائی اور ترقی کیلئے میرے ناقص ذہن میں کئی مشورے آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض باتوں پہ اشکال بھی وارد ہوتا ہے۔

فرصت کے زمانے میں راقم رائے و نظر مرکز اور مولانا فضل الرحمن کو خطوط لکھتا تھا: مثلاً میں نے کافی سال پہلے مولانا کو خط لکھا تھا کہ: آج کل ملکی سیاست میں ایک نیا طبقہ بھی کافی اثر انداز ہونے لگا ہے اور وہ ہے بیرون ملک کام کرنے والے پاکستانی۔ جن کے خاندان کے ووٹ ان کے ہی مہون منت ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی دلجوئی آپ کو خاصے ووٹ دلوا دے گی اور یہ آسان بھی ہے۔ پریس میں کبھی کبھار انکے مسائل بارے میں رکارڈ کرنا اور بعض شہروں میں یورپی سہولیات سے آراستہ جمعیت کی طرف سے باپردہ گیسٹ ہاؤس مہیا کرنا، جس میں دین دار فاران ریٹرن چھٹیوں میں آ کر ٹھہر سکیں۔ یہ گیسٹ ہاؤس بھلے مفت میں نہ ہوں مگر اس سے جمعیت کا جدید امیج ابھرے گا کہ وہ اس کمیونٹی کا بھی احساس رکھتے ہیں۔

اسی طرح مجھے بعض چیزوں پہ اختلاف بھی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک متشرع حلیہ کے خوش نوا شاعر ہیں جن کو شاعر جمعیت سمجھا جاتا ہے۔ یہ صاحب ایک طرف مزاحیہ شاعر مشہور ہیں اور یوٹیوب ویڈیوز میں دیکھا جاسکتا ہے کہ یہ لڑکیوں کے مجمع میں انڈین اداکاراؤں کے نام پہ ترنم جگا رہے ہیں اور داد پار رہے ہیں۔ تو



دوسری طرف جمعیت کے جلسوں میں فحاشی کے خلاف نظمیں بھی پڑھا کرتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن کو یہ صاحب پسند ہیں۔ ایک تو شاید اس وجہ سے کہ ان کے والد گرامی کی جمعیت کیلئے بہت خدمات رہی ہیں اور مولانا جمعیت کے کارکنان کے بچوں کو بھولتا نہیں۔ دوسرے، میرا گمان ہے کہ جناب سلمان گیلانی کی شاعری کے دوسرے پہلو کا مولانا کو پتہ ہی نہیں ہوگا۔

ہمارے بچپن میں، پنجابی کا ایک گانا مشہور تھا "نبواں دا جوڑا" جو ہم جیسے تلنگوں کو ازبر تھا۔ حضرت درخواسی مرحوم ڈیرہ تشریف لائے تو ایک نوجوان نعت خوان شاعر نے اسی طرز میں منقبت پیش کی کہ: "عاشقان دا جوڑا، نال ستا دلدار دے"۔ طرز اچھی تھی، حضرت درخواسی نے دوسری بار بلا کر سنا، ہم کو ہنسی آرہی تھی مگر حضرت کو کیا معلوم کہ اس ہنسی کی وجہ کیا ہے؟ (ویسے گانوں کی طرز یہ نعتیں پڑھنا بھی کوئی قابل تحسین عمل نہیں ہے)

جمعیت میں آج کل بہت سے موقع پرست لوگ بھی گھس گئے ہیں، جو مولانا سے اپنا کام کرا لیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے ان لوگوں کے ساتھ تعلق بننے کا سبب، خود جمعیت کے سادہ لوح مولوی ہی ہوا کرتے ہیں۔ موقع پرست مافیاء خوشامد اور کام نکالنے کے طریقوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتی، پہلے جمعیت کے غریب مگر مخلص مولوی کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر مولانا کی زیارت کیلئے لاتے ہیں، مولوی بچارہ گاڑی کی سواری کے احسان کا مارا ہوا، مولانا کو خان صاحب کی دین دوستی اور جمعیت دوستی کے قصے سناتا ہے، اگلی بار خان صاحب خود اپنا راستہ بنا چکے ہوتے ہیں اور مولانا نبی تو ہے نہیں کہ دلوں کا حال جھانک سکے۔ سرکارِ دو عالم کی حدیث کا مفہوم ہے کہ تم میں سے دو آدمی میرے پاس فیصلہ کرانے آتے ہو اور ایک اپنی چرب زبانی سے اپنے حق میں فیصلہ کرا لے تو یہ نہ سمجھے کہ جیت گیا ہے، خدا کے ہاں قیامت میں پکڑا جائے گا۔

یہ حدیث بھی ہر کارکن کے پیش نظر رہے جس کا مفہوم ہے کہ: خدا اپنے دین کا کام کبھی بے دینوں سے بھی لے لیا کرتا ہے، مگر اس حدیث کو سوچتے ہوئے آپ کے ذہن میں بھٹو جیسے داڑھی منڈے ہی نہ آئیں بلکہ اپنی ذات پہ بھی ڈرتے رہا کریں کہ کہیں ہم تو بے دینوں میں شامل نہیں؟

آدم برسر مطلب!

اب میں مولانا سے اپنے ان اختلافات کا ذکر کرتا ہوں، جن پر آج بھی قائم ہوں۔

مولانا فضل الرحمن سے پہلا علانیہ اختلاف:

مولانا سے میرا پہلا علانیہ اختلاف، عمران خان کو یہودی ایجنٹ کہنے پر ہوا تھا۔



اسلام نے جماعت کے افراد کو امیر سے آداب کے دائرے میں اختلاف کا حق دیا ہے لیکن یہ کہ جب ایک مشورہ طے پا جائے تو اس کو ماننا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مولانا سے 35 سالہ سیاسی زندگی میں کئی غلطیاں بھی ہوئی ہوں گی (یا مجھے ایسا لگا ہوگا) لیکن میری کوشش رہی کہ اپنا موقف، جماعت کے ذمہ داروں تک پہنچا دوں اور بس (آدی گھر کے کپڑے گلی میں نہیں لٹکاتا)

لیکن عمران خان کے بارے مولانا کے بیان پر میں نے سخت رد عمل دیا، اس کا تفصیلی پس منظر آپ کے سامنے رکھتا ہوں تاکہ سارے معاملے کا ہر پہلو واضح ہو جائے، امید ہے آپ اس سے مستفید ہوں گے۔ دیکھئے! پہلے مولانا نے کی تھی، عمران خان نے نہیں۔ عمران خان کے ایجنڈے میں مذہبی قوتوں سے بگاڑ نہیں تھا۔ عمران خان نے صرف زرداری اور نواز شریف کو ٹارگٹ کیا ہوا تھا، لیکن مولانا نے اسے یہودی ایجنٹ قرار دے کر جنگ چھیڑ دی۔

مجھے اس پر حیرت ہوئی کیونکہ ایک تو مولانا کے سیکولر اور نرم مزاج کے پیش نظر مجھے اس سخت حملے کی امید نہیں تھی۔ دوسرے، میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا، کیونکہ اس وقت مولانا کے جلسے عمران خان کے جلسوں سے زیادہ بڑے نہیں تو ہم پہلے ضرور تھے۔ اس وقت تک مولانا کا نواز شریف سے اتحاد بھی نہیں بنا تھا، بلکہ نواز شریف نے ڈیرہ میں اس کے بھائی کے مقابلے معروف میا خیل خاندان کو ٹکٹ دیا ہوا تھا۔ میری تشویش پر مولانا عبید الرحمن کا وسیع کسی واسطے سے ملا کہ خود گھر میں بھی مولانا کو اس ایشور پر روکا جاتا ہے مگر وہ اس پہ سننے کو تیار نہیں۔ مولانا کے مدرسے کے ایک غیر سیاسی مفتی صاحب سے بات کی تو انہوں نے فرمایا کہ یہ مولانا کی کوئی اپنی کشتی چیر گئی ہے، جس کی ہمیں سمجھ نہیں آتی۔

صاف ظاہر ہے کسی کی کشف یا مزاج پہ فتوے نہیں مانے جاسکتے۔ یہاں میں ایک ضروری بات واضح کر دوں کہ ”تحریک انصاف کو ووٹ دینا حرام ہے“ والا فتویٰ، مولانا فضل الرحمن نے نہیں دیا تھا اور نہ ہی وہ مفتی ہے۔ میری معلومات میں یہ فتویٰ علامہ ڈاکٹر شیر علی شاہ مرحوم نے دیا تھا جو مولانا سمیع الحق کے دارالعلوم حقانیہ کے شیخ الحدیث تھے، جس مدرسے کو عمران خان نے 30 کروڑ کی امداد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ لگے ہاتھوں، میں اس فتویٰ کی کہانی بھی بیان کر دوں کہ حضرت شیخ نے پہلے یہ فتویٰ دیا، پھر واپس لیا اور پھر دوبارہ دیا تھا۔

ہوا یوں کہ قادیانیوں کے خلیفہ مرزا طاہر کا ایک ویڈیو بیان سامنے آیا جس میں وہ اپنی ایک پیروکار جو لندن پی ٹی وی کی آفس ہولڈر تھی، کو بتا رہے ہیں کہ عمران خان نے اپنا بندہ میرے پاس سپورٹ حاصل کرنے بھیجا تھا۔ جس کے بدلے آئین سے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے والی آئینی شق ختم کرانے کا



وعدہ کیا تھا۔ اس کلب کی تصدیق ہوگئی تو حضرت شیخ شیر علی شاہ نے مذکورہ فتویٰ دیا، اس کے بعد عمران خان نے خود جا کر حضرت شیخ سے ملاقات کی تو انہوں نے فتویٰ واپس لے لیا۔ اور کچھ عرصے بعد دوبارہ وہی فتویٰ دیا اور وجہ بیان کی۔ انہوں نے کہا کہ عمران خان میرے پاس آیا تھا اور بتایا کہ وہ قادیانیوں کو کافر سمجھتا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ مرزا طاہر کے بیان کے جواب میں بیان ریکارڈ کرائیں کہ یہ جھوٹ ہے، اس نے یہ وعدہ کر لیا اور میں نے فتویٰ واپس لے لیا، لیکن ایک ماہ گزرنے کے باوجود وہ علی الاعلان تردید نہیں کر رہا۔ تو دال میں کچھ کالا ہے، پس میرا پہلا فتویٰ قائم ہے۔

خیر، واپس موضوع کی طرف آتے ہیں کہ مولانا فضل الرحمن نے عمران خان کو یہودی ایجنٹ کہا، اگر ایک پارٹی کسی استعمار کے خلاف نعرے پر کام کر رہی ہو، چاہے پنجابی استعمار کے خلاف ہو یا صیہونی استعمار کیخلاف، تو اس سامراج کے گماشتوں کو لکارتا اس کی مجبوری ہوا کرتی ہے۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ مولانا کا بیان پاکستانی سیاسی رواج کا حصہ ہے جس میں ایک دوسرے کو امریکی کارندہ، روسی پٹھو، انڈیا کا یار وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ مولانا کی سنجیدہ سیاست سے یہ بھی امید نہیں تھی۔ لیکن جب ایک ٹاک شو میں مولانا سے پوچھا گیا کہ آپ کے دعوے کی کیا دلیل ہے؟ تو مولانا نے جواب دیا کہ اس کا ثبوت میں خود ہوں، میں علماء کی ایک بڑی جماعت کا امیر ہوں تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں ایسی غیر ذمہ دارانہ بات بغیر ثبوت کے کر لوں گا؟

پہلے تو مجھے مولانا کی اس بات پہ بڑا غصہ آیا کہ کیا آپ نبی ہیں، جو صرف آپ کے کہنے پہ بلا دلیل ایمان لایا جائے۔ مگر کچھ عرصہ سوچنے کے بعد مجھے مولانا کی اس بات پر حق نواز جھنگوی شہید یاد آئے جب انہوں نے (غالباً ۱۹۸۸ء میں ڈیرہ اسماعیل خان ڈسٹرکٹ بار میں تقریر کی تھی) وکیلوں سے خطاب کرتے ہوئے مولانا جھنگوی نے فرمایا تھا: ”میں شیعہ کو کافر کہتا ہوں جس سے ملک کے حالات خراب ہوتے ہیں، آج کل چوکوں پر مناظروں کا دور نہیں رہا بلکہ سپریم کورٹ کی ٹیبل پر فیصلے ہوتے ہیں۔ پاکستان کا کوئی شیعہ مجھ پر عدالت میں رٹ دائر کرے کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ آدمی ہم کو کافر کہتا ہے۔ اگر کوئی شیعہ نہیں کرتا تو حکومت پاکستان مجھ پر مقدمہ کرے کہ یہ آدمی ہمارے ملک کے مسلمان شہریوں کو کافر کہتا ہے، میں وہاں دلیل دوں گا۔ اگر حکومت بھی کسی وجہ سے نہیں کرتی تو آپ (یعنی وکلاء) بطور پاکستانی شہری، مجھے عدالت میں بلائیں کہ میں کیوں غلط بیانی کر کے ملک کے حالات خراب کرتا ہوں؟“

پس میں نے سوچا کہ بطور پاکستانی شہری مجھے اپنا پارٹ ادا کرنا چاہئے تاکہ بات واضح ہو۔ میں چونکہ سعودی عرب میں ہوتا ہوں تو سوشل میڈیا کے ذریعے تحریک انصاف کے دوستوں کو دعوت دی کہ جو کوئی



بھی مولانا کے خلاف عدالت جائے گا، اس کا ہرجہ خرچہ میرے ذمہ ہوگا۔ مگر اس پر بھی کوئی آگے نہ آیا (میری پبلیکیشن اب بھی قائم ہے)

اس دوران، خود عمران خان نے 13 اگست 2013ء کو مولانا کو لیگل نوٹس بھیج دیا جس میں ایک ہفتے میں معذرت کرنے اور 10 کروڑ جرمانہ ادا کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

یقین جانئے! مجھے یہی خیال آیا کہ چونکہ مولانا منطق کا بادشاہ ہے تو ایران، توران کی کہانی بنا کر، اپنے الفاظ کا دیگر مفہوم بنا کر معذرت کر لے گا یا پیشی سے راہ فرار اختیار کرے گا۔ کئی سال اسی میں گزر جاتے ہیں کہ مدعا علیہ کو نوٹس موصول نہیں ہوا یا وہ موجود نہیں ہے۔ مگر مولانا نے تو فی الفور کہہ دیا کہ اسی دن کا میں انتظار کر رہا تھا اور اب باقی بات عدالت میں ہوگی۔

جناب، اس بات کو دو سال ہو گئے ہیں، پی ٹی آئی نے چپ چاپ اپنا تھوک چاٹ رکھا ہے۔ برادران! اس واقعہ کے بعد، مولانا نے اپنے اس دعوے میں کہ "عمران خان یہودی ایجنٹ ہے" قانونی طور پر سرخرو ہو چکا ہے۔

تاہم اس دعوے کے دو پہلو ابھی مزید رہتے ہیں کہ کیا یہ سیاسی اور دینی طور بھی درست قدم تھا یا نہیں؟ سیاست مولانا کے گھر کی لونڈی ہے۔ پس اس پہلو پر اس کی ہر چال کو وقت ثابت کر دے گا۔ میرا خیال یہ ہے کہ مولانا سمجھ گیا تھا کہ پاکستان کی سیاسی قیادت اور تحریک انصاف کے پردے میں ایجنسیوں میں بیچ بڑنے والا ہے اور جیت بہر حال سیاسی قوتوں کی ہوگی۔ اس سے سیاسی قوتوں کو مولانا جیسے آدمی کی سخت ضرورت ہوگی کہ جس پہ کرپشن کا کوئی کیس بھی نہ ہو اور جس کے پاس لاکھوں متحرک اور فدائی نوجوانوں کا جم غفیر موجود ہو۔ پس مولانا نے میدان میں کود کر، اپنی حیثیت جتوائی اور کامیاب رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پنجاب کے لوگ، جن کا طبعی طور پر نواز شریف یا جماعت اسلامی سے لگاؤ تھا، پہلی بار جمعیت کے قریب آئے اور مولانا نے وہاں اپنی جماعت کو انٹری دے دی ہے۔

البتہ دینی پہلو کے لحاظ سے، میرا ناقص خیال یہ ہے کہ مولانا کو اس سے احتراز کرنا چاہئے تھا اور میرا یہ اختلاف برقرار ہے۔ تاہم، جب کسی بات کا حق ہوتا، اصولی طور پر ثابت ہو جائے تو صرف طریق کار کے اختلاف پر، جماعت سے راہ جدا کرنا حماقت کہلاتی ہے، عقلمند راشارہ کافی است۔

مولانا فضل الرحمن سے دوسرا اعلانیہ اختلاف:

مولانا سے میرا دوسرا اعلانیہ اختلاف ان کے بیٹے کو نائیک سے بطور قومی اسمبلی امیدوار ٹکٹ دینے پر ہوا،



جس پر میں نے مولانا اسعد محمود کو ہرانے کے لئے دامے درمے سخی مدد کی تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ ٹانک سے ایک ضمنی نشست ہار کر، جمعیت علماء اسلام اس لوکل گروہ کے زرنے سے نکل آئی جو خود کو عقل کل سمجھ کر، کسی کی سننے کو تیار نہ تھے۔

اس سے پہلے کہ میں اپنا موقف بیان کروں، چند ضروری باتوں کی وضاحت ہو جائے۔ لوگ کہتے ہیں کہ مولانا اپنے خاندان میں اقتدار رکھنا چاہتا ہے، اس کے لئے وہ اسمبلی الیکشن کی مثال دیتے ہیں کہ اس کے بھائیوں اور بیٹے کو ٹکٹ دیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ بھائیوں کو اقتدار دلانے کا سب سے محفوظ راستہ سیٹیں کا ٹکٹ ہے جو مولانا کے لئے آسان بھی ہے اور جس پہ وہ 5 سال نہیں بلکہ 6 سال کیلئے سلیکٹ ہو جاتے اور زیادہ مراعات پاتے ہیں۔ جنرل الیکشن میں تو آدمی عوام کے سامنے امتحان میں ہوتا ہے۔ اچھڑی صاحب کی طرح بھائیوں کو گورنر بھی لگوایا جاسکتا ہے۔

میں اصولی طور پر موروثی سیاست کے خلاف نہیں ہوں، لیکن یہ میرٹ پر ہونا چاہئے۔ اگر آپ کا خاندان، آپ کے اصول اور نظریے کی خاطر آپ کے ساتھ قربانیوں میں شریک ہے تو ان کو کیوں پیچھے رکھا جائے؟ کیا محض اس تصور پر کہ وہ آپ کے رشتہ دار ہیں؟

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا کہ موروثی سیاست سے کسی کو کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہئے۔ اگر قیادت کو کارکنوں کا اعتماد حاصل ہے۔ دیکھئے! ہمارے ہاں پیٹھے اور ہنر بھی خاندانی بنیادوں پر قائم ہیں، بڑھی کا بیٹا بچپن سے باپ سے ہنر سیکھتا ہے تو بڑا ہو کر باکمال ہنرمند بنتا ہے۔ ڈاکٹروں کے ہاں تو نسل در نسل پیشہ ورانہ وراثت کا سلسلہ قائم ہے۔ وکلاء، سول سرونٹ، کاروبار، ہر شعبے میں رسمی تعلیم سے زیادہ گھر میں تشکیل پانے والے مزاج کا زیادہ عمل دخل ہے۔ اسی کو سیاست پر منطبق کر لیں، مولانا فضل الرحمن، محمود خان اچھڑی، اسفندیار ولی، بلاول بھٹو سب نے سیاسی ماحول میں آنکھ کھولی، سیاسی گفتگو میں اور تجزیے سنتے بڑے ہوئے، اپنے بڑوں کو جیلیں کانتے جدوجہد کرتے اور سیاست گری کرتے دیکھا۔ یہ تجربہ اور بصیرت ایم اے سیاسیات کرنے سے نہیں آتا، البتہ مفادات حاصل کرنا ایک الگ بحث ہے۔

دراصل، ضلع ٹانک، پرویز مشرف دور تک، فقط ایک صوبائی سیٹ ہی رہی تھی۔ ٹانک کی صورتحال ایسے ہے کہ صوبائی سیٹ پر یہاں بھٹی قبائل کا ووٹ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ قبائل میں محسود قبیلہ کی بھٹی قبیلہ سے رقابت ہے۔ سرائیکی عوام کی کافی بڑی تعداد ہے مگر ان کا کوئی امیدوار لیول کا نمائندہ نہیں ہوتا۔ عرصہ تک یہاں سے مولانا فتح خان جمعیت کی صوبائی سیٹ پر امیدوار ہوا کرتے تھے اور دینی جذبے کے تحت سب قبائل ان کو سپورٹ کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ٹانک میں لکی مروت کے سیف اللہ برادران کا کافی



ہولڈ تھا، جو کنڈی خاندان کے ساتھ مل کر یہ صوبائی سیٹ لے اڑتے تھے (اب مولانا نے خود سیف اللہ برادران پر لکھی مروت میں چڑھائی کر کے ان کو آؤٹ کر دیا ہے) مولانا فتح خان کے بعد مولانا شریف الدین کو جمعیت نے ٹکٹ دیا۔ لیکن وہ بہت ہی کمزور امیدوار ثابت ہوئے۔

مشرف دور میں اچانک قومی اسمبلی کے حلقے بڑھا دیئے گئے، ٹانک میں قومی اسمبلی کے الگ امیدوار کیلئے تیاری ہی نہیں تھی، پس اچانک فیصلہ میں موزوں ترین امیدوار مولانا عطاء الرحمن تھے جو بھاری لیڈ سے جیت گئے۔ زمینی حالات سے میدان میں کام کرنے والے کارکن زیادہ واقف ہوتے ہیں یہ نسبت ہم جیسے دور بیٹھے تجزیہ نگاروں کے۔ مولانا عطاء الرحمن یا مولانا لطف الرحمن کی نامزدگی میرٹ پر تھی، مگر مولانا اسعد محمود کی نامزدگی پر مجھے اعتراض تھا۔

دوسری وجوہ کے علاوہ، اس کی اصل وجہ ڈیرہ شہر میں لگنے والے جمعیت کے اشتہارات تھے۔ ورنہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، مولانا اسعد محمود بہت ہی شریف، متحمل اور قابل نوجوان ہے۔

ان دنوں ڈیرہ کے لوکل اخبارات میں اور کھبوں پر مولانا برادران کی تصویروں سے مزین اشتہارات لگے، جس پہ درج تھا کہ: ”ترقی کے رنگ، مولانا برادران کے رنگ“

مجھے حیرت ہوئی کہ کیا شیخ الہند اور مولانا لاہوری کی وراثت اب کسی خاندان کی پروموشن کے لئے استعمال ہوگی؟ کیا یہ پارٹی مفتی محمود صاحب کی ذاتی پارٹی ہے؟ ہماری جدوجہد، جمعیت کے نظریے کے لئے ہے یا مولانا کے خاندان کے لئے؟

مولانا اسعد محمود ایک بہترین سلیکشن تھی۔ نوجوان نے پہلی بار ہی ٹانک سے 60 ہزار ووٹ لئے۔ حالانکہ اس کا مقابل 5 ہزار ایکشن لڑ چکا تھا جو صرف 10 ہزار ووٹ زیادہ لے سکا۔ لیکن ٹانک اور لکی کی ضمنی سیٹ ہارنے سے ہم کو جمعیت واپس مل گئی۔

مولانا برادران سے میں واقف نہیں، عمومی پراپیگنڈے کے زیر اثر مولانا لطف الرحمن بارے میرا تاثر اچھا نہیں تھا لیکن کینال کالونی میانوالی کے قاری انور شاہ صاحب (راہنما اشاعت التوحید) نے ایک ایسا واقعہ تفصیل سے سنایا جس کی کچھ مبہم معلومات میرے پاس بھی تھیں، جس سے اب بدگمانی ختم ہو گئی ہے۔

دروغ برگردن راوی، مولانا لطف الرحمن کو ڈیرہ کے ووٹروں نے مولانا فضل الرحمن تک پہنچنے کی سیڑھی بنایا تو وہ عجب میں مبتلا ہو گیا اور خود کو مولانا فضل الرحمن سے بھی زیادہ ذہین سمجھنے لگا۔ ہر انسان کمزور ہے۔

میں نے مولانا اسعد محمود کے خلاف ٹانک کے عوام کے نام ایک کھلا خط لکھا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ اس نوجوان کا مستقبل تابناک ہے، یہ جمعیت کا نیا چہرہ ثابت ہوگا اور زندگی میں کئی ایکشن جیتے گا مگر فی الحال اس



کا ہرانا ضروری ہے۔ جمعیت کو ایک سیٹ سے فرق نہیں پڑے گا لیکن لائن سیدھی ہو جائے گی۔ میں اپنے اس موقف پر اب بھی قائم ہوں، مزید یہ مشورہ بھی ہے اب ٹانک کی سیٹ پر مولانا اسعد محمود کو مستقل ٹکٹ دیا جائے کہ بار بار امیدواروں کا بدلنا بھی سیاسی لحاظ سے سودمند نہیں ہوتا۔

باقی، یہ فیصلے جمعیت کے اپنے ورکرز اور اکابرین کو کرنا ہیں۔ ہم تو بحیثیت جماعت کے خیر خواہ کے، ساتھ بھی دیں گے اور کڑا احتساب بھی کریں گے۔ تاہم جب بھی جماعت کو ہماری ضرورت ہوئی تو وہ ہمیں اپنے ساتھ پائیں گے۔

میں بار دیگر عرض کرتا ہوں کہ مولانا کے خاندان کو از خود، اپنے آپ کو نمایاں کرنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ زمانہ خود ہی آپ کو عزت دے گا۔ ڈیرہ میں خیبر بنک کے منیجر جو کہ لائنز کلب کے ممبر بھی تھے، مولانا برادران کے مخالف تھے۔ ایک بار مجھے بتایا کہ خدا کو جان دینی ہے، مفتی محمود آئی ہسپتال کا نام میرے مشورے سے رکھا گیا۔ کہنے لگے، ہسپتال کیلئے زمین مولانا عطاء الرحمن نے دی تھی، جو اگرچہ سرکاری زمین تھی مگر بہر حال اس آدمی کی کٹری بیوٹن تھی۔ مولانا عطاء الرحمن نے از خود ہسپتال کے نام بارے کوئی مطالبہ نہیں کیا لیکن میرا دل چاہا کہ مفتی صاحب کے نام سے موسوم کیا جائے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اخلاص والوں کو صلہ دیر سے ملے، مگر ملتا ضرور ہے۔ اخلاص پہ دھیان دیجئے۔

Rights of e-Publications reserved  
by  
Team OFFICIALJAMIAT

📞📞📞📞 / Official Jamiat

📞 / JUIAnswerBack



## دوسرا حصہ:

## جمیۃ علماء اسلام کی سیاست

### پہلا باب: پارلیمانی جمہوریت کا دینی زاویے سے تجزیہ

مذہبی طبقے کا ایک حصہ رومانوی طور پر خلافت کے تصور میں اسیر ہے۔ موجودہ جمہوری نظام کی بوجہ کمزریوں کو بنیاد بنا کر جمہوری نظام کو کفر تک قرار دیتا ہے۔ پھر ایسے میں علامہ اقبال کے کسی خاص زاویے کے پیش نظر کہا گیا مصرعہ کہ ”دیواستبداد جمہوری قبا میں پائے کو بے ان کی دلیل کو کمک پہنچاتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اسی نظام کے تحت علامہ خود بھی پنجاب کونسل کے نمائندہ رہے ہیں۔ علامہ کی شاعری کو اپنی سوچ کے فریم میں فٹ کرنے والوں کو علامہ کا یہ مصرعہ نہیں یاد رہتا کہ: ”اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک“ جس کی بناء پر ان دینی مراکز کو ختم کیا جائے۔

بہر حال خاکسار نے ایک مضمون بعنوان ”خلافت و جمہوریت“ لکھا تھا، ملاحظہ کیجئے:

Team OFFICIAL JAMIA

### خلافت و جمہوریت:

کسی مغربی مفکر نے درست کہا کہ ”جس معاشرے میں ظلم و نا انصافی عام ہو جائے، وہاں یا تو انقلاب آتا ہے یا سٹریٹ کرائم بڑھ جاتے ہیں“ گذشتہ 60 سال سے جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے، ہم میں اہلیت ہوتی تو انقلاب آچکا ہوتا۔ چونکہ انقلاب نہیں آ سکا تو معاشرہ میں جرائم بڑھ گئے ہیں۔ اگر آپ ایک لمحہ کے لئے اس بحث کو ایک طرف رکھیں کہ ایم کیو ایم اور لشکر طیبہ کی نرسری کہاں مشکل ہوئی، تو میں عرض کروں کہ اس سوسائٹی پر حافظہ سعید جیسے لوگوں کا احسان ہے جس نے بے روزگار نوجوانوں کو جہاد کے شغل میں لگا کر سٹریٹ کرائم کے سامنے بند باندھے رکھا۔ ورنہ یہ ایم کیو ایم جیسی لبرل تنظیموں کے ہاتھ ہی لگتے تو آج گلی گلی، پوری بند لاشیں ملا کرتیں۔

تاہم ہر دواء کا سائیڈ ایفیکٹ بھی ہوتا ہے۔ جہادی تنظیموں کی وجہ سے عوام کی ایک نسل شاید گلی محلے کے جرائم سے بچ گئی، لیکن دوسری طرف ہمارے دین و ملت کا انسانیت نواز چہرہ مسخ کرنے، ایسی تنگ ذہنیت تخلیق ہو گئی جس کی بنیاد صرف یہ ہے کہ جو چیز بھی مغرب سے آئی ہے، وہ کفر ہے۔

دنیا نے انسانیت نے صدیوں کے تجربات کو سامنے رکھ کر غور و خوض کیا اور جمہوری نظام حکومت کو فی الحال بہترین نظام حکومت قرار دیا ہے، مگر چونکہ موجودہ جمہوری نظام کا سورج مغرب سے طلوع ہوا تو



ہمارے ہاں کا جہادی طبقہ اس کو کفر قرار دیتا ہے۔ دلیل کیا ہے؟ ایک حدیث کہ: ”جس کسی نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ ان میں سے ہے۔“  
ہم اس مضمون میں اختصار کے ساتھ، اسی بنیادی بات پر بحث کریں گے۔

من تشبہ بقوم، فهو منهم کا فلسفہ جھاڑنے والوں کی خدمت میں عرض ہے کہ سلمان فارسیؑ کے مشورے سے جنگ خندق (کی کھدائی) کا وار پلان بنایا گیا تھا جو کہ صرف ایرانی تکیک تھی اور جس پر خود نبی اکرم ﷺ نے اپنے سامنے عمل کروایا تھا۔ عقلمندرا اشارہ کافی است۔

میرا عقیدہ ہے کہ انسانیت کی نجات صرف نبی ﷺ کی پیروی میں ہے، مگر سنت کی حدود کیا ہیں؟ اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نبیؐ نے جو کچھ کیا، اگر اس کی ہو بہو نقل کا نام ہی سنت ہے تو پھر عربی کے سوا دوسری کوئی زبان نہیں بولنا چاہیے۔ کیا کوئی کان دھرے گا کہ زمان و مکان کے لحاظ سے مسائل بدل جایا کرتے ہیں؟ تصویر کشی پر اختلاف ہو سکتا ہے، پر مجسمہ سازی تو بالاتفاق حرام ہے۔ لیکن قادیسیہ کے میدان میں جب جنگی ہاتھیوں سے مقابلہ ہوا جو کہ عربی گھوڑوں کے لئے ایک اجنبی چیز تھے تو ان کے دل سے ہاتھیوں کا خوف نکالنے کے لئے مٹی کے ہاتھی بنا کر ان پر سیاہ رنگ کر کے گھوڑوں کو ان کے سامنے دوڑایا گیا۔ یہ کام جید صحابہؓ کے مشورے سے ہوا اور ان کی نگرانی میں ہوا۔ اس لئے عرض ہے کہ دین میں اگر قرآن و حدیث کے الفاظ کو صحابہؓ کی زندگی سے ملا کر نہیں سمجھا جائے گا تو غیر منطقی نتائج برآمد ہوں گے۔

حیرت ہوتی ہے جب اچھے خاصے بڑھے لکھے لوگ جمہوریت کو کفر کہہ کر نظام خلافت کی پاپولر اصطلاح اختیار کرتے ہیں (کسی زمانے میں ہمارے ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم بھی متاثر ہوئے تھے، پھر رجوع کر لیا تھا) دیکھئے! اللہ اور رسولؐ نے کسی ایسی بات کو مبہم رہنے ہی نہیں دیا جو سوسائٹی کے لئے انتہاء ضروری اور اہم ہو۔ ذرا غور فرمائیے، سارے قرآن میں نماز جیسی اہم عبادت کا طریقہ تو کیا رکھتیں بھی درج نہیں۔ لیکن عورت کو میراث میں کیا ملنا چاہئے، اس پر پورا صفحہ موجود ہے (بات دوسری طرف چل پڑے گی، ورنہ یہ بھی کہ معصوم رسولوں کو آراء سے چیرا گیا، ان کا مرثیہ نہیں ہے لیکن قرآن اس معصوم بچی کا استغاثہ ضرور سناتا ہے جو بے گناہ دفن کی گئی)

ایک مسلمان حکمران کیسا ہونا چاہئے؟ اس کی مفصل ہدایات نبیؐ نے دی ہیں۔ مگر اس حکمران کی سلیکشن کیسے ہو؟ اس کو شریعت نے مبہم چھوڑا ہے۔ اسی خاطر مبہم چھوڑا ہے کہ یہ بات قیامت تک آنے والی ہر دور کی انسانی منطق خود طے کر سکتی ہے، اس میں کوئی جائز، ناجائز کا چکر نہیں ہے۔

خود رسول اللہ ﷺ نے تو کسی کو نامزد کیا ہی نہیں تھا، اسلام کا پہلا حکمران جمہوری طریقے سے مدینہ کے



لوگوں کے ووٹ (بیعت) سے مقرر کیا گیا، اب 20 کروڑ عوام ایک مسجد میں تو بیعت کیلئے جمع نہیں ہو سکتے حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت عمرؓ کو اگر چہ نامزد کیا گیا تھا لیکن اس کیلئے کبار صحابہ کے تھنک ٹینک کیساتھ بیک ڈور مشورے مکمل ہو چکے تھے۔ یہ گویا حکمران منتخب کرنے کا دوسرا اسلامی طریقہ ہوا، لیکن جو لوگ اسی کو نظام خلافت کی مثال بنا کر پیش کریں تو یہ بھی فرمائیں کہ اب حکمران سازشوری یعنی سلیکشن کمیٹی کس بنیاد پر تشکیل پائے گی، کون لوگ اس میں شامل ہونے کے اہل ہوں گے؟ اس اہلیت کا فیصلہ کون کرے گا؟

اسلامی طریقہ چناؤ کا تیسرا روپ (اگر کوئی اسلامی طریقہ ہو تو) حضرت عثمان کے انتخاب میں سامنے آتا ہے جب سابق حکمران اپنی صوابدید پر 6 امیدواروں کو نامزد کرتا ہے۔ جن میں سے انہوں نے خود ہی ایک پر راضی ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کے فوراً بعد ملوکیت کی ابتدا ہو گئی تھی اور کبار فقہا نے اس کے خلاف بغاوت نہیں کی، تو ظاہر ہے کہ یہ بھی کفریہ نظام نہیں ہے۔

قصہ مختصر حکومتی انتظام چلانے کا کوئی طریقہ خلافت ہو، ملوکیت ہو یا جمہوریت، فی نفسہ غیر شرعی نہیں ہے۔ جمہوریت بارے ہمارے ہاں دینی طبقہ واضح طور پر دو انتہاؤں میں منقسم ہے۔ مگر جماعت اسلامی کی ہر موضوع پر گولگوئی پالیسی رہی ہے۔ مولانا مودودی نے جمہوریت کو کفریہ نظام کہا پھر اس میں حصہ بھی لیا۔ ملوکیت کے خلاف شہرہ آفاق کتاب لکھی، مگر اس پہ ایوارڈ بھی سعودی ملوکیت سے ہی وصول کیا۔ طرفہ تماشا یہ بھی ہے کہ جماعت اسلامی کے احباب مولانا مودودی کو دئے گئے اس سعودی ایوارڈ پہ بہت بغلیں بجایا کرتے تھے تو خیر سے سعودی حکومت نے اس سے بھی ایوارڈ، انڈیا کے مودی کو دے دیا (شاید ملتے جلتے نام سے غلط فہمی ہوئی ہو) بس فرق یہ ہے کہ مولانا مودودی کو ایوارڈ "کنگ" کے ہاتھوں ملا تھا جبکہ ہندو مودی کو "خادم الحرمین شریفین" کے ہاتھوں۔

واپس اپنے موضوع پہ آتے ہیں۔ جمہوریت ہی اسلام کی اصل ہے کہ ان کا حکمران، ان کا خادم ہوا کرتا ہے۔ پس حکومتی ملکیت عوام کے پاس ہوئی، اگرچہ جمہوری نظام انتخاب کا وہ خاص طریقہ جو ہمارے دیار میں رائج ہے، بلاشبہ قرون اولیٰ میں ایسے نہیں تھا۔ تو بھائی مدراس اسلامیہ کی شکل اور ان کی ڈگریاں بھی تو آج کی طرح ماضی میں مروج نہیں ہوا کرتی تھیں۔

جہاں تک خاکسار کی رائے کا تعلق ہے تو نہ صرف جمہوریت کا واضح حامی ہوں بلکہ موجودہ پارلیمانی نظام کو اقرب الی السنہ سمجھتا ہوں۔ تسلیم کہ موجودہ جمہوری نظام میں بہت سی خامیاں ہیں مگر یہ اسی نظام کے تسلسل سے ہی دور ہوں گی کہ چلتا پانی، خود کو خود ہی صاف کر لیا کرتا ہے۔

مضمون ختم ہوا۔



جمعیت علماء اسلام آج کے تناظر میں پارلیمانی جمہوری نظام کی حامی ہے اور نظام ایک انتظامی معاملہ ہوا کرتا ہے نہ کہ عقیدے کا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے صحابہ گھوڑے کی سواری فرماتے تھے اور آج کل گاڑی میں سواری کا رواج ہے۔ مسئلہ سواری کا نہیں، سواری کے آداب کا ہے، جس کی محنت میں جمعیت علماء اسلام نے سبک میل قائم کئے ہیں۔

### ہمارے پارلیمانی نظام بارے چار غلط فہمیاں:

ارتقاء زمانہ سے جہاں دیگر شعبہ جات کو نئی شکلیں عطا ہوئیں، وہیں سیاست میں جمہوری طرز حکومت نمودار ہوا۔ جسے اب تک بہترین طریق حکمرانی سمجھا گیا ہے۔ جمہوری نظام کی دو صورتیں ہیں: صدارتی نظام اور پارلیمانی نظام۔ پاکستان میں ماشاء اللہ، انسانیت کی معلوم تاریخ سے لے کر آج تک جتنے انداز حکمرانی رہے ہیں، وہ صرف 60 سال میں آزمائے جچکے ہیں اور بالآخر قوم کی اکثریت پارلیمانی جمہوری نظام پہ متفق نظر آتی ہے۔

اس مضمون میں ہم پارلیمانی نظام اور اس بارے چند عام غلط فہمیوں پہ بات کریں گے۔ دیکھئے! جہاں بھی کچھ لوگ اکٹھے رہیں گے، کچھ نہ کچھ اختلاف اور تنازعہ تو ضرور رہے گا۔ ایک محلے کی ہی مثال لیجئے، اس محلے میں تین بڑے موضوعات ہوتے ہیں، جن کی بنیاد پہ اہل محلہ کے بیچ جھگڑا کھڑا ہو سکتا ہے۔

ایک تو انفراسٹرکچر سے مسئلہ پیدا ہوتا ہے مثلاً فلاں کی ٹالی یا دروازے کی وجہ سے ہمسائے کا راستہ تنگ پڑ گیا، وغیرہ۔ دوسرے، ثقافت کا فرق جس سے مسئلہ بنتا ہے۔ فلاں کے گھر طویل اور پر شور فنکشن، فلاں کو ڈسٹرب کرتے ہیں، وغیرہ۔ تیسرا، جو تفرقہ آرا یا بیکل مسئلہ ہے، وہ مذہبی اختلاف سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اس محلے سے فلاں فرقہ کے لوگوں کو محلہ بدر کیا جائے، وغیرہ۔

اس محلے میں پہلا کام جو کرنے کا ہے وہ یہ کہ اس محلے کے چندہ لوگوں کا جرگہ تشکیل دیا جائے یعنی ایسی محلہ کمیٹی جس کے فیصلوں کو سب اہل محلہ مان کر چل سکیں۔ یہ کمیٹی، ایسے اصلی نسلی لوگوں پر مشتمل ہونا چاہئے جن میں معاملات کو سلیقے سے نبھانے کی صلاحیت ہو۔ جب شروع میں اس محلہ کمیٹی کیلئے اہل محلہ سے کچھ لوگوں بارے مشاورت کی جائے گی تو عین ممکن ہے کہ محلے کے چند نو دولتے کمین یا کم عقل بد معاش بھی کسی طور اس کے ممبر بن جائیں، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہی کی اکثریت ہو جائے۔

مگر یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ اسی کمیٹی کو چلنے دیجئے، جب یہ لوگ چند ہی جھگڑوں کی مالٹی کریں گے تو لوگوں کو خود ہی اندازہ ہو جائے گا کہ خاندانی کون ہے اور کم اصل کون؟ اہل محلہ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ



مقررہ مدت میں کمیٹی کے چناؤ کے عمل کو نہ رکھنے دیں۔

پاکستان گونا گوں عقائد، نسلوں، ثقافتوں اور مزاجوں کے لحاظ سے ایک ایسا ہی مخلوط آبادی والا محلہ ہے، یہاں آمریت نہیں چل سکتی اور صدارتی نظام بھی نہیں چل سکتا کہ جس میں صرف ایک آدمی کو مختلف النوع قومیتوں کا متفقہ نمائندہ قرار دیا جائے اور اس کے ہاتھ کامل اختیارات دیئے جائیں۔

یہاں صرف جمہوری پارلیمانی نظام ہی قابل عمل ہے جس میں اگرچہ بہت کمزوریاں ہیں مگر وہ اس کے تسلسل اور استمرار سے ہی دور ہوں گی کہ چلتا پانی خود کو خود ہی صاف کر لیا کرتا ہے۔

بعض دوستوں کے ذہن میں پاکستان کے پارلیمانی جمہوری نظام بارے (جو 1973 کے آئین پر مبنی ہے) بہت سی غلط فہمیاں ہیں، طوالت سے بچنے، فی الحال صرف چار غلط فہمیوں پہ مختصر بات کریں گے۔

### پاکستان کے پارلیمانی نظام بارے پہلی غلط فہمی:

ہمارے دانشور دوستوں کا فرمودہ ہے کہ چونکہ عوام بے وقوف ہوا کرتے ہیں پس وہ الیکشن میں اپنے جیسے جہلاء کو ہی اپنا لیڈر منتخب کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عوام بچوں کی طرح ہوتے ہیں، عربی میں محاورہ ہے: عوام کا لانعام، یعنی عوام چوپایوں کی طرح سادہ دماغ ہوتے ہیں جو چارے کے چکر میں قصائی کے چھرے کے نیچے آ جایا کرتے ہیں، پس اگر بیوقوف لوگوں کے ٹوٹے کو کہا جائے کہ اپنے میں سے ایک لیڈر چن لو تو وہ اپنے جیسا ہی چنیں گے۔ مگر پارلیمانی جمہوریت میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ یہاں عوام ”چنتے“ نہیں بلکہ لیڈر خود کو ”چنوا یا“ کرتے ہیں (واضح رہے کہ یہ دیوار والا چنوا نا نہیں)

ہر حلقے کا منتخب نمائندہ، چاہے وہ انگریزی بول سکتا ہو یا نہیں، وہ یا تو اس علاقے کا ایک ذہین شخص ہوتا ہے یا کسی ذہین گروہ کا مہرہ ہوتا ہے (آپ ذہین کی جگہ چالاک، شطریارنگ باز کہہ لیں مگر مفہوم وہی نکلے گا کہ وہ ایک عام آدمی یعنی بیوقوف یا سادہ لوح آدمی نہیں ہوا کرتا)۔

ہوتا یوں ہے کہ الیکشن سے کم از کم ایک ماہ پہلے سے، سادہ لوح عوام کے سامنے بہت سے نمائندے ”خدمت“ کیلئے پیش ہوا کرتے ہیں، ان میں اچھے کردار والے بھی ہوتے ہیں اور برعکس بھی۔ یہ لوگ عوام کے سامنے دن رات کمپین چلا کر کوئی سنجیدہ منشور یا سبز باغ پیش کرتے ہیں اور بیچاری عوام کو چکرا کر رکھ دیتے ہیں۔ اب اس مہم میں اگر ایک اچھا آدمی عوام کے ذہنوں کو گرفت میں نہیں لاسکتا تو وہ ہار جاتا ہے، یہ تو اس کی اپنی کمزوری ہوتی۔ اس میں اتنی صلاحیت ہونی چاہئے کہ عوام پر اپنا منشور منوا سکے، ورنہ کیوں



لیڈری کا شوق ہے؟ پھر یوں بھی ہے کہ قوموں کی پالیسیاں بیس سالہ نہیں ہوا کرتیں۔ ایک اچھے لیڈر میں کچھ مستقل مزاجی ہونی چاہئے تاکہ اس بار نہیں تو اگلے الیکشن میں خود کو منوالے۔ لیڈر بے صبر نہیں ہوا کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل الیکشن میں پیسہ اور اس کی بنیاد پر پراپیگنڈہ، عوام کو گمراہ کرنے کے کام آتا ہے۔ مگر فہم سیاسی لیڈر ایسے حالات میں بھی اپنی چالوں سے زرداروں کو ناکام بنا سکتا ہے اور پاکستان میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں، جہاں غریب مگر ہوشیار سیاسی کارکنوں نے، پرانے جاگیرداروں کو شکست دی ہے۔ پس الیکشن میں بے وقوف عوام اپنا نمائندہ نہیں جتنے بلکہ ایک شاطر نمائندہ اپنے آپ کو چناتا ہے۔ دیکھئے! ملکی پالیسیاں تو فقط ایک ذہین یا شاطر گروہ ہی تشکیل دیا کرتا ہے، چاہے آمریت ہو، بادشاہت ہو یا جمہوریت ہو، امریکہ ہو یا افریقہ ہو۔ مگر جمہوری نظام میں (چاہے پارلیمانی ہو یا صدارتی) سادہ لوح عوام کو یہ خوش فہمی رہتی ہے کہ ملکی پالیسیاں ان سے پوچھ کر بنائی جا رہی ہیں۔ عوام کے اس اطمینان یا معاشرے کے امن کی خاطر، چند کروڑ لگا دینا مہنگا سودا نہیں۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے آپ اپنے بچوں سے پوچھتے ہیں کہ چھٹی کا دن کیسے گزارنا ہے؟ اور پھر باتوں باتوں میں وہی کچھ، ان مصحوموں سے مواپیتے ہیں جو آپ چاہتے ہیں، مگر بچے خوش ہوتے ہیں کہ ہمارے کہنے پہ ابونے یہ فیصلہ کیا ہے۔ اس طرز عمل سے گھر کا ماحول خوشگوار اور پر امن رہے گا۔ اور یہ بھی کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوا کرتا کہ آپ ہی بچوں کو گائیڈ کریں۔ بعض بچے، والدین سے زیادہ سمجھدار نکل آتے ہیں تو وہ ایسا مشورہ دیتے ہیں کہ والدین کو ان کی ماننا پڑتی ہے۔ ہر دو صورت فیملی کے لئے بہتر ہیں۔ تاہم ضروری ہے کہ مشورے کا عمل جاری رہنا چاہئے۔

پاکستان کے پارلیمانی نظام بارے دوسری غلط فہمی:

ایک غلط فہمی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ ایک عالم دین اور ایک جاہل کا ووٹ کیسے برابر ہے؟ یا ایک چھا بڑی فروش، ملک کے نیوکلیئر سٹیشن کے بارے میں کیا رائے دے سکتا ہے؟ وغیرہ

یہ ذہن میں رکھا جائے کہ پاکستان میں اوسطاً 3 لاکھ عوام پہ مشتمل قومی اسمبلی کا حلقہ، اپنا ایک بااعتماد نمائندہ منتخب کرتا ہے۔ عوام اس نمائندے کو دین یا فزکس کی بنیاد پر نہیں، بلکہ صرف اپنے روزگار اور علاقے کی ترقی کی خاطر پر منتخب کرتے ہیں۔ یہ نمائندہ جو علاقے کے لوگوں پہ اثر رکھتا ہے، خود بھی سائنس و فقہ یا عالمی امور کا ماہر نہیں ہوتا۔ کوئی رکن پارلیمنٹ چاہے کتنا ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو، مگر ہر فیئلہ کا سپیشلسٹ تو پھر بھی نہیں ہو سکتا۔



جب پارلیمنٹ میں کوئی ٹیکنیکل مسئلہ پیش ہوتا ہے تو ماہرین کی آئینی کمیٹیاں، ان نمائندوں کی راہنمائی کرتی ہیں۔ پارلیمنٹ میں دلیل اور جوڑ توڑ کے ذریعے اس مسئلہ پر متفقہ رائے لی جاتی ہے۔ یہ نمائندے راضی ہو جائیں تو اپنے علاقے کی عوام کو مطمئن کر سکتے ہیں اور یوں گویا پاکستان کا ہر شہری، اپنی داخلہ و خارجہ پالیسی میں اپنے با اعتماد نمائندے کے ذریعے شریک ہوتا ہے۔

ارکان پارلیمنٹ کی بہت کم تعداد نظریاتی پارٹیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ باقی ارکان پارلیمنٹ سے بہت خوش گمانی بھی کی جائے تو بھی ان کی دلچسپی، فقط اپنے حلقہ انتخاب میں میکانیزم جیکبسن لینے یا ملکی آئین کے انتظامی حصوں میں ہوا کرتی ہے۔ اسلامی نظام یا مغربی نظام سے نہ ان کو دلچسپی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا مطالعہ ہوتا ہے (اور نہ ہی اس کی ضرورت ..... ) اس لئے پارلیمنٹ میں کسی نظریاتی آدمی کو اپنی بات منوانے کے لئے اکثریت کی نہیں بلکہ دلیل اور باہمی تعلق کی ضرورت ہے۔ یہ صفات موجود ہوں تو پارلیمنٹ میں اکیلا نظریاتی ممبر بھی اپنا موقف منوا سکتا ہے۔

اب مسئلہ یوں ہے کہ آج کل جو چند ایک نظریاتی سیاست کے داعی ارکان پارلیمنٹ ہیں، ان میں خوئے دلجوئی باقی نہیں رہی۔ جس کی وجہ سے باقی ارکان پارلیمنٹ ان اصحاب کی دلیل بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ یعنی مسئلہ ان کی اپنی کم حکمتی اور کم اخلاقی کا ہے، مگر گلہ جمہوری نظام سے کیا جاتا ہے۔ دیکھ لیجئے، مفتی محمود صاحب اور ان کے نظریاتی ساتھی تعداد میں کم تھے مگر اپنی منطق اور سب کے ساتھ رکھ رکھاؤ کی وجہ سے اپنا موقف پارلیمنٹ سے منوا لیا تھا۔ اس میں ان کو تعداد اڑے نہیں آئی۔

پاکستان کے پارلیمانی نظام بارے تیسری غلط فہمی:

ایک غلط فہمی یہ بھی پائی جاتی ہے کہ جمہوری پارلیمانی نظام میں پنجابی، افغان، اپنی عددی برتری کے لحاظ سے صوبوں کے حقوق غصب کر لیتی ہے۔

یہ درست ہے کہ قومی اسمبلی میں پنجاب سے 60 فیصد ممبران ہوتے ہیں جبکہ باقی سارے پاکستان سے ملا کر بھی صرف 40 فیصد ہوا کرتے ہیں مگر اس سے صوبوں کو کیا فرق پڑتا ہے؟ اول تو صوبوں کے انتظامی معاملات کافی حد تک صوبوں کے پاس ہی ہیں جس پر صدر زرداری کو خراج تحسین پیش کرنا چاہیے۔ لیکن اگر صوبوں کے ساتھ کچھ زیادتی ہونا ہی ہو تو اس کے لئے آئینی ترمیم کرنا پڑے گی، جس کیلئے قومی اسمبلی اور سینیٹ دونوں جگہ سے الگ الگ منظوری لینا ہوگی۔

اب سینیٹ یعنی ایوان بالا میں تو ہر صوبے سے برابر کے ممبر ہیں، جو کہ اپنی صوبائی اسمبلیوں کے ممبران



کے ووٹ سے منتخب ہوا کرتے ہیں۔ پس صوبوں کے سینئرز اپنے حقوق کے ضامن بھی ہیں اور محافظ بھی۔ پنجاب کو قومی اسمبلی میں عددی اکثریت سے صرف ایک فائدہ ہو سکتا ہے کہ ملک کا منتظم اعلیٰ، یعنی وزیر اعظم پنجابی آدمی بن سکتا ہے۔ انصاف کی بات ہے کہ اگر ملک پاکستان میں پنجابیوں کی 60 فیصد آبادی ہے تو ملکی تاریخ کے 65 سال میں 35 سال پنجابیوں کو اور 25 سال باقی قومیتوں کو ملکی انتظام چلانے کا حق ملنا چاہئے۔ مگر حقیقت یوں ہے کہ اس ملک کا نظم و نسق 25 سال تو صرف مہاجروں کے ہاتھ رہا (لیاقت علی خان، جنرل ضیاء اور جنرل مشرف) دس سال پنجتون صدر یعنی جنرل ایوب رہا۔ اور تو اور، حصہ بقدر جیش، جمہوری طور پر بلوچ وزیر اعظم یعنی ظفر اللہ جمالی 2 سال، سرائیکی وزیر اعظم یعنی یوسف رضا گیلانی 4 سال جبکہ سندھی وزیر اعظم 12 سال (ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو کا کل دورانیہ) اس منصب پر رہے۔ اب پنجابی وزیر اعظم کے دورانیہ کا حساب آپ خود کر لیں۔

پس یہ نری غلط فہمی ہے کہ پارلیمانی جمہوریت میں پنجاب چھا جائے گا بلکہ جوں جوں جمہوری اخلاقیات آگے بڑھ رہی ہیں، توں توں سب کو ساتھ لیکر چلنے کی اہمیت بھی قومی سطح پر مسلم ہوتی جا رہی ہے۔

### پاکستان کے پارلیمانی نظام بارے چوتھی غلط فہمی:

ایک اور غلط فہمی جو کسی حد تک قابل توجہ بھی ہے کہ ایک حلقے میں ایک امیدوار، چند ووٹوں سے جیت جاتا ہے جبکہ اس کے مقابل امیدواران کے مجموعی ووٹ اس سے زیادہ ہوتے ہیں تو اس آدمی کو حلقے کے لوگوں کا نمائندہ کیسے مانا جاسکتا ہے؟ دیکھئے! کسی حلقے میں رجسٹرڈ ووٹ مثلاً دو لاکھ ہیں، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کئی ہزار لوگوں کے ووٹ درج ہی نہ ہوئے ہوں یا زیادہ درج ہو گئے ہوں۔ ووٹر لسٹیں، پہلے سے آشکار کی جاتی ہیں۔ لوگوں کے علاوہ سیاسی جماعتوں کا کام ہے کہ اس کی تصحیح کریں (سو وہ کیا کرتے ہیں)

آگے چلیں۔ ان دو لاکھ ووٹرز میں سے ایک لاکھ ووٹر ہی ووٹ ڈالنے آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ووٹ نہ ڈالنے والے، اس جیتنے والے کے ضرور مخالف ہیں یا حامی ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا تو منطقی طور پر اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ ان کو اس کو اس نظام سے دلچسپی نہیں یا اس پہ اعتماد نہیں۔ تو جناب! اس کی ذمہ داری سب سیاسی پارٹیوں پہ آتی ہے کہ لوگوں کو اعتماد دیں۔ حکومت کسی کو بزدل ووٹ ڈالنے پہ مجبور نہیں کر سکتی۔

قصہ کوتاہ، ایک لاکھ ووٹرز نے 15 امیدواران کو ووٹ ڈالے، جیتنے والا مثلاً سو ووٹ کے فرق سے



جیت گیا۔ اگرچہ باقی چار امیدواروں کے مجموعی ووٹ، اس جیتنے والے سے زیادہ ہیں۔ مگر یہ بھی فقط غلط فہمی ہے کہ جیتنے والے کو ووٹ نہ دینے والے لوگ، اس کے مخالف ہی ہوتے ہیں۔ اگرچہ تیسرے نمبر پر آنے والے امیدوار کے حامی، پہلے نمبر والے سے زیادہ اپنے امیدوار کو اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے والے سے زیادہ، دوسرے نمبر پر آنے والے کو بہتر سمجھتے ہیں۔

آئیڈیل انتخاب تو یوں ہی ممکن ہے کہ سب باشندگان کو ووٹ ڈالنے کا قانوناً پابند کیا جائے۔ اس کے بعد جب کسی حلقے کا رزلٹ نکل آئے تو دو دن بعد صرف پہلے دو امیدواران کے درمیان ایک بار پھر الیکشن ہوتا کہ واقعی متفقہ نمائندگی سامنے آ سکے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے وسائل کی کمی کے علاوہ عوامی تربیت بھی آڑے آتی ہے۔

اب یوں ہے کہ چند ووٹوں کے فرق سے جیتنے والا مثلاً صرف 26 ہزار ووٹ لینے والا آدمی، دو لاکھ ووٹرز کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ اس بارے عرض ہے کسی گیم کے اصول پہلے سے طے کرنے کے بعد ہی ٹیمیں اس میں حصہ لیا کرتی ہیں۔ ہارنے کے بعد کوئی ٹیم کہے کہ گیم کے روڈز غلط ہیں تو تماشا بیوں کو چاہئے کہ ایسی ٹیم کو ٹھڈے مار کر گراؤنڈ سے نکال دیں۔

جمہوریت چلتی رہی تو طریقہ انتخاب کی کمزوریاں بھی آہستہ آہستہ دور ہوتی جائیں گی۔ ایک زمانہ تھا کہ قومی اسمبلی کے انتخابات کے دو دن بعد صوبائی الیکشن ہوتے تھے، لیکن اس صورت میں چونکہ قومی رزلٹ، صوبائی اثر انداز ہوتا تھا پس ایک ہی دن الیکشن کا فیصلہ کیا گیا۔ ماضی میں ووٹر کیلئے شناختی کارڈ کی شرط نہیں ہوتی تھی، اکیس سال سے کم عمر ووٹ بھی نہیں ڈال سکتا تھا۔ کئی حلقوں میں خواتین کو ووٹ سے محروم رکھا جاتا تھا، جواب قانوناً جرم قرار دیا گیا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اسی زخم خوردہ جمہوریت میں بھی ہم ایک لمبا فاصلہ طے کر آئے ہیں، تسلسل رہے گا تو مزید بہتری آتی رہے گی۔



## باب دوم: سیکولرزم کیا ہے؟

چونکہ میری گفتگو جمیعت علماء اسلام کے سیکولر جمہوری کردار سے متعلق ہوگی، تو پہلے سیکولرزم کی اصطلاح کو سمجھ لیجئے۔ اس پر مندرجہ ذیل مضمون آپ کے پیش خدمت ہے:

**فرہنگ سیلیمی:** ایک ٹی وی چینل کے مشہور پروگرام کا ایک سگمنٹ ”فرہنگ آصفیہ“ کے نام سے ہوتا ہے جس میں میزبان، اردو الفاظ کے اصل اور مستعمل معانی کا فرق بتاتے ہیں۔

بغیر کسی تمہید کے عرض ہے کہ سیکولرزم، سوشلزم، ڈیموکریسی وغیرہ چند ایسے انگریزی الفاظ ہیں جن کی اصطلاحی تعریف، لغوی معانی اور عوامی استعمال، غرض ہر پہلو سے لوگ محضہ کا شکار ہیں۔

اس بحث میں پڑے بغیر کہ آکسفورڈ ڈکشنری کیا کہتی ہے، خاکسار اپنے فہم کی بناء پر ان الفاظ کے جو معانی لیتا ہے، اسے آپ کے سامنے رکھ رہا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے میری ذاتی فرہنگ کہہ لیں۔

اگر آپ میری طرح سیکولر ہونے کے دعویدار ہیں تو مجھ سے اتفاق کریں گے، اگر نہیں کرتے، تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ مجھے سیکولرزم کا ”فرقہ سلیمیہ“ کہہ لیں۔ (دیگر مذہبی تشریحات پہ فرقے بن سکتے ہیں تو سیکولرزم پہ بھی کسی کا کیا اجارہ ہے؟)

اپنی بات واضح کرتے کے لئے ایک گاؤں کی مثال لیتا ہوں:

ایک ہزار گھرانوں پہ مشتمل ایک گاؤں ہے جس کے لوگوں نے اپنے مسائل کے حل کے لئے ایک نظام وضع کیا ہے کہ گاؤں میں دس نمائندوں پہ مشتمل ایک پنچایت بنادی جائے، جو گاؤں کی ترقی اور امن کی ذمہ دار ہو۔ گاؤں کے جو لوگ اس ذمہ داری کے لئے فرصت اور توانائی رکھتے ہیں، وہ اپنا نام پیش کریں اور گاؤں والے خفیہ رائے شماری سے ان دس نمائندوں کو پنچایت میں چن لیں۔ جن پر لوگ دوسروں کی نسبت زیادہ اعتماد کا مظاہرہ کریں اور پھر یہ دس نمائندے گاؤں کا ایک مکھیا چن لیں۔ اس کو جمہوری نظام کہتے ہیں۔ کوئی مفتی صاحب، براہ کرم ہمیں بتائیں کہ اس نظام میں غیر اسلامی بات کیا ہے؟ (غیر اسلامی بات وہ ہوتی ہے جس سے قرآن وحدیث صریح طور پر منج کرے۔) اب میں آپ کو گاؤں کے دس کرداروں سے ملواتا ہوں جن میں سے، دوسو شلٹ ہیں، دو سیکولر ہیں، ایک لبرل ہے، ایک کمیونسٹ ہے، ایک فاشٹ (انجنا پسند) ہے، ایک ملحد ہے، ایک نظریاتی ہے اور ایک بنیاد پرست ہے۔

سوشلسٹ: گاؤں میں مسٹر طاہر رہتے ہیں، جو گاؤں والوں کی غربت پہ کڑھتے ہیں۔ پس انہوں



نے ایک بینک بنا دیا ہے، جو سود پہ قرض دیتا ہے تاکہ لوگ اپنا روزگار پیدا کر سکیں۔ اسی گاؤں میں حاجی ابرار نامی ایک صاحب ثروت تبلیغی آدمی بھی ہیں، جو کہ سود کو برا خیال کرتے ہیں تاہم لوگوں کی بے چارگی بھی کھکتی ہے۔ انہوں نے صدقات اکٹھے کر کے بلا سودی قرض دینے شروع کر دیے۔

مسٹر طاہر اور حاجی ابرار، دونوں سوشلسٹ ہیں۔

سوشلزم، دراصل سوسائٹی کی فکر کرنے کا نام ہے۔ پس ہر وہ شخص جو اپنی ذات سے ماوراء دوسرے بندوں کے بارے سوچ رکھتا ہے، وہ سوشلسٹ ہے۔ بالفاظ دیگر سوشلسٹ وہ آدمی ہے جو سوسائٹی کی بہتری کی خاطر جدوجہد کرتا ہو، اپنے معاشرے کے لئے سوچتا ہو، یا حیات اجتماعی کی فکر رکھتا ہو۔ اس جدوجہد، سوچ اور فکر میں وہ غلط یا درست ہو سکتا ہے۔ سوشلزم ایک انسانی صفت ہے، یوں تو کسی بھی انسان کو دردی یہ دولت میسر آ سکتی ہے، پر میرا دعویٰ ہے کہ مسلمان سے بڑا سوشلسٹ کوئی نہیں ہو سکتا۔

۔ درودل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروہیاں

چینی سوشلزم یا کوئی اور سوشلزم ایسے ہی ہیں، جیسے سعودی اسلام یا ایرانی اسلام۔ یعنی اسلام، الگ چیز ہے اور اس کی تفہیم کی بنیاد پر کوئی نظام بنانا الگ چیز ہے۔ ایسے ہی سوشلزم، انسانی کردار کا خاصہ ہے۔ پھر اپنے فہم مطابق اس کا نظام بنانا الگ چیز ہے۔

لبرل اور نظریاتی:

گاؤں میں حکیم طارق ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے بینک سے کاروبار کرنا حرام ہے، یہ خدا سے دشمنی ہے۔ پس وہ بینک سے رابطہ نہیں رکھتے۔ حکیم طارق، نظریاتی آدمی ہیں۔

گاؤں میں نعیم رہتا ہے، آزاد روش آدمی ہے۔ اس کو بینک پہ کوئی اعتراض نہیں۔ یہ خود کو مسلمان کہتا ہے لیکن دین کے کسی حکم سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے، نعیم ایک لبرل نوجوان ہے۔

حکیم طارق اور نعیم کو اپنے انداز میں گزارنے کا پورا حق حاصل ہے جب تک یہ فاشزم کی راہ نہیں اپناتے، لبرلزم، صرف آزاد روی کا نام ہے (جس کے حامی اسے ”روشن خیالی“ اور مخالفین اسے ”مادر پدر آزادی“ کا نام دیتے ہیں۔ دونوں غلط ہیں) کسی فرد کا لبرل ہونا، اسلامی نقطہ نگاہ سے مستحسن نہیں، لیکن کوئی لبرل کسی دوسرے کیلئے تکلیف کا سبب نہیں تو اسلام کو بھی اس سے تکلیف نہیں۔

ہمارے نظریاتی شخص یعنی حکیم طارق کو پورا حق ہے کہ ہر معقول طریقے سے نعیم کو اپنے نظریے پر لائے



اور چاہے تو حکومت کو بھی نظریاتی بنانے کی کوشش کرے۔ (معتول طریقہ وہ ہے جسے اس کے زمانے اور منطقے کی سوسائٹی، کثرت رائے یعنی جمہوری طور پر قبول کرتی ہو۔)

### فاشٹ (تنگ نظریا انتہا پسند):

گاؤں کی مسجد میں ملا ممتاز قادری ہیں۔ وہ سود کو خدا کے خلاف جنگ کہتے ہیں اور نوجوانوں کو ابھارتے ہیں کہ بینک کو آگ لگا دو۔ اسی گاؤں میں پرویز بٹ صاحب ہیں، ان کو ممتاز قادری اور مذہب سے بیزاری ہے۔ وہ پرچار کرتے ہیں کہ مسجد کو گرا کر یہاں بچوں کا پارک بنائیں، یہ زیادہ فائدہ مند ہیں۔ قادری اور پرویز، دونوں فاشٹ، تنگ نظریا انتہا پسند ہیں۔

### سیکولرازم:

گاؤں میں ہیڈ ماسٹر ریاض کا بڑا رسوخ ہے۔ بینک کے بارے وہ کہتے ہیں کہ کسی کو سود سے تکلیف ہے تو بینک نہ جائے۔ ماسٹر صاحب امن کے داعی ہیں، ان کا یہ کہنا ہے کہ بینک آج کل کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں کو بینک سے تکلیف ہے، وہ اس کا تبادلہ مہیا کر کے دکھائیں۔ گاؤں میں بشیر چشتی صاحب ہیں، نوجوانوں کو دین کی تعلیم دیتے ہیں۔ سود کے نقصانات بتاتے ہیں مگر مرنجاں مرغ آدی ہیں۔ ان کی محفل میں خود بینک والے مسٹر طاہر بھی بے خوف شرکت کرتے ہیں۔ ماسٹر ریاض اور چشتی صاحب دونوں سیکولر ہیں۔

Rights of e-Publications reserved

Team OFFICIAL JAMIA

### سیکولرازم، تھیو کریسی کی ضد ہے:

پہلے تھیو کریسی کو سمجھیں۔ فرض کریں، ایک آدی کے خیال میں پینٹ شرٹ پہننا حرام ہے اور تہہ بند باندھنا ہر مسلمان کی شرعی ضرورت ہے۔ جس میں اس کی دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔ یہ آدی چاہتا ہے کہ پاکستان آرمی میں پتلون کی بجائے، شرعی لباس جو کہ اس کے خیال میں تہہ بند ہے، وہ رائج کیا جائے تو غیبی امداد ہوگی۔ اس آدی کو بنیاد پرست کہیں گے۔ اس آدی کی سوچ کے مطابق حکومت چلائی جائے تو اس کا نام تھیو کریسی ہے۔ اس بنیاد پرست آدی کو اپنی ذاتی زندگی اپنے خیال کے مطابق گزارنے کا پورا حق حاصل ہے، اگر حکومت یا معاشرہ، بلاوجہ اس کی زبان بندی نہیں کر رہا تو اس کا نام سیکولرازم ہے۔

خاکسار کا دعویٰ ہے کہ اسلام سے زیادہ کوئی دین، سیکولر نہیں۔ یہ دین ”لا اکراہ فی الدین“ کا اصول دیتا ہے، دلیل کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس کے جنگی رولز میں اسلام کے مقابل اصل نظریاتی کرداروں مثلاً پادری اور چرچ کو امان دی گئی ہے، اس لئے کہ اسلام دلیل کا سامنا کرنے سے نہیں گھبراتا۔



### سیکولر ازم کیا ہے؟

یہ تصوف کی ہی شکل ہے کہ اپنا عقیدہ چھوڑ نہیں، کسی اور کے عقیدے کو چھیڑ نہیں۔ اس میں یہ اضافہ کر لیجئے کہ اپنے عقیدے یا نظریے کا، دلیل اور قول احسن (منطقی اور میٹھی بات) سے پرچار کر سکتے ہو۔

### کیونز م:

یہ کسی عقیدے کا نام نہیں، ایک اجتماعی معاشی نظام کا نام ہے۔ کیونست وہ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ افراد کی آمدنی، ریاست کی اجتماعی ملکیت یا مشترکہ وراثت ہے۔ انفرادی دولت جمع کرنے کی گنجائش نہیں۔ کام سارے لوگ مل کر کریں لیکن آمدن ریاست کے پاس جمع ہو، جو اس کو سب لوگوں کی فلاح میں خرچ کرے۔ کیونز م، سرمایہ داری نظام (کپٹلزم) کا رد ہے۔

ایک کیونست، مسلمان یا عیسائی یا لاندہب وغیرہ ہو سکتا ہے، اس کا عقیدہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بحیثیت مسلمان، ہم کیونز م کے معاشی نظام کو ناقص سمجھتے ہیں۔ اسی طرح سرمایہ داری نظام پر بھی ہمیں تحفظات ہیں۔ اسلام کے پاس ان دونوں سے بہتر معاشی نظام موجود ہے۔

### دہریہ یا ملحد:

گاؤں میں ایک چوہدری یوسف بھی ہے جو مذہب اور خدا کو بالکل نہیں مانتا۔ پس چوہدری ایک دہریہ ہے، سیکولر اور اسلامی حکومت میں دہریہ کی سارے انسانی حقوق محفوظ ہیں مگر تھوکر لسی میں وہ قابل موت ہے (امام ابوحنیفہ کا دہریے سے بغداد کی مسجد میں برسر عام مناظرہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی ملحدین کو اپنے قتل کو خوف نہ تھا اور دلیل کی بنیاد پر، وقت کے اکابر علما کو چوک میں چیلنج دے سکتے تھے) ہمارے ہاں کیونست، سوشلسٹ، لیبرل، سیکولر، سب کو دہریہ سمجھا جاتا ہے، سو غلط ہے۔

### جمہوریت:

گاؤں کا نظام چلانے، پنچایت کے دس ارکان کا انتخاب ہوتا ہے۔ گاؤں میں تیس امیدوار اس کے لئے میدان میں آگئے ہیں۔ اس الیکشن میں قادری، حکیم طارق اور حاجی ابرار نے حصہ نہیں لیا۔ کیوں؟ قادری اس عمل کو غیر اسلامی سمجھتا ہے۔ حکیم طارق اور حاجی ابرار اسے فضول اور وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ (ان دونوں کی اتباع میں، ان کے چند ہم خیال بھی الیکشن سے دور ہے۔) پرویز، فاشٹ ہونے کی بناء پر قادری کی ہی طرح محدود حلقہ اثر رکھتا ہے، پس وہ بری طرح ہار گیا۔



نتائج کچھ یوں آئے:

چشتی، نعیم اور چوہدری ممبر بن گئے۔ مسٹر طاہر گروپ کے دو آدمی جبکہ ماسٹر ریاض کے 5 آدمی ممبر بن گئے۔ یوں گاؤں کی 10 آدمیوں کی پنچایت کا کھیا، ماسٹر ریاض کو منتخب کر لیا گیا جو سیکولر آدمی ہیں۔ اس وقت گاؤں میں بڑا مسئلہ امن کا ہے جس کی بنیاد بینک ہے۔ بینک، پنچایت کی رکن کی ملکیت ہے۔ ملا قادری، رکن نہ ہونے کے باوجود، گاؤں میں ایک اثر تو بہر حال رکھتا ہے۔ ماسٹر ریاض بینک کو گاؤں کی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ معزز رکن، چشتی صاحب بھی چاہتے ہیں کہ بینک ختم ہو جائے مگر ان کو بھی احساس ہے کہ بینک، عوام کی سہولت بھی ہے اور طاہر صاحب کا بزنس بھی ہے۔ وہ بھی حکیم طارق اور حاجی ابرار کی طرح نظریاتی اور سوشلسٹ ہیں، مگر جمہوری آدمی بھی ہیں۔ پس، چشتی صاحب نے اہل علم کی مشاورت سے، پنچایت میں ایک تجویز پیش کی، کہ بینک کی بجائے، مضاربہ سکیم کھول دی جائے، جس کا سربراہ طاہر صاحب کو بنادیا جائے۔

فرمایئے! اس تجویز پہ کھیا ریاض صاحب، ان کے مد مقابل طاہر صاحب اور انتہا پسند ملا صاحب، ان تینوں کو کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ ریاض صاحب کو تو چشتی صاحب یا طاہر صاحب کی بجائے گاؤں کا امن عزیز ہے، جس کو ملا قادری خراب کرنے پہ تلا ہے۔ ان کی ترجیح یہ ہے کہ ملا، بد امنی سے باز آ جائے۔ مگر چوہدری یوسف اور نعیم اس کی بھی مخالفت کریں گے کیونکہ ان کو چشتی صاحب سمیت ہر مذہبی آدمی سے بغض ہے۔ مگر اکثریت کی بنیاد پہ فیصلہ چشتی صاحب کے حق میں آیا اگرچہ ان کا اپنا ایک ہی ووٹ تھا۔ یوں پر امن طریقے سے مسئلہ کا حل نکل آیا، اس کو جمہوریت کہتے ہیں۔ اس میں چشتی صاحب کے ارکان کا زیادہ ہونا، اچھی بات سہی مگر ضروری نہیں۔ اہم بات، خود چشتی صاحب کی سوچ، دلیل کی طاقت اور بیشتر ارکان

میں ان کی وقعت و محبت کا ہونا ہے۔

مضمون ختم ہوا۔



## باب سوم: دینی سیاسی جماعت کا مطلب کیا ہے؟

جمیعت علماء اسلام اگرچہ علمائے دیوبند کے تصور حکومت کی داعی ہے، مگر یہ ایک مذہبی سیاسی جماعت نہیں بلکہ دینی سیاسی جماعت ہے۔ مذہبی جماعت، کبھی جمہوری ہوئی نہیں سکتی۔ آسانی کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ مذہب اور چیز ہے، دین اور چیز۔

مذہب میں فرد کا اپنے نفس سے تعلق ہوتا ہے، جبکہ دین میں فرد کا اپنے باہر سے۔ مثلاً آپ کا پارک کر کے مسجد گئے۔ آپ وہاں 100 رکعت نماز پڑھیں، یہ آپ کا مذہب ہے۔ لیکن اگر پارکنگ سے کسی کا راستہ بند ہوتا ہے تو یہ دین ہے۔ خدا نے قرآن میں دین پہ زور دیا، مذہب کو زیادہ مٹ نہیں کیا۔

نماز افضل ترین عبادت ہے لیکن قرآن میں اس کے اوقات تو کیا رکعات کا بھی ذکر نہیں۔ دوسری طرف یتیم کی وراثت بارے 2 صفحے، مسئلہ طلاق بارے 2 رکوع، غرض خدا نے دین کو واضح کیا ہے۔

یاد رکھئے، آج کے مولوی آپ کو مذہب پہ الجھائیں گے، دین کی بات نہیں کریں گے۔ کیوں؟ سنئے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”دین میں پہلی بدعت جو شروع ہوئی وہ پیٹ بھر کر کھانے کی تھی“ اب بھلا کونسا مولوی اس بدعت کا تذکرہ کرے گا؟ پس آپ لوگ کبھی مذہبی بحث میں نہ پڑا کریں۔ دین کی بحث کریں گے تو دین میں کسی فرقے کا اختلاف ہے، یہی نہیں۔ ساری دکانداری مذہبی بحث پہ چلتی ہے جس کی خدا کے ہاں وقعت نہیں۔

سارے قرآن کا خلاصہ، ایک جملہ میں ہے کہ: ”انسان بن کر رہو“ جیسے ”پختو“ غیرت کا دوسرا نام ہے اور جس میں غیرت نہیں، وہ پشتو بولتے ہوئے بھی پٹھان تو ہو سکتا ہے (جو قوم کا نام ہے) پختون نہیں ہو سکتا۔ ایسے اسلام، انسانیت کا نام ہے جس میں انسانیت نہیں، وہ مسلمان تو ہو سکتا ہے (جو ایک گروہ کا نام ہے) مسلم نہیں (یہ صرف پختون بھائیوں کو سمجھانے کے لئے مثال عرض کر دی، تعصب کے لئے نہیں)

دینی سیاسی جماعت کی جدوجہد جمہوری طریقے سے اپنے نظریہ کی حکومت قائم کرنے کیلئے ہوتی ہے۔ اس میں اس جماعت کے افراد کا حکومت میں آنا اصل نہیں ہوتا بلکہ جمہوری طریقے سے اپنے نظریے کی حفاظت، حمایت اور اس کی نفاذ کا ہدف ہوتا ہے، پس اس میں تعداد کی اہمیت نہیں ہوا کرتی۔

یہاں ایک دلچسپ بات کا تذکرہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہمارے ہاں مغرب زدہ لبرل فاشسٹوں کا ایک گروہ، مولویوں کو سیاست تو کیا، زندہ رہنے کا حق دینے کا روادار نہیں۔ مگر ان کا آدرش مغرب کا



آئیڈیل جمہوری نظام ہوتا ہے۔

اہل مغرب کے ہاں وہ دینی مریض طبقہ جسے ”کیز“ کہا جاتا ہے، شاید چوتھائی فیصد سے بھی کم ہو لیکن ان کو بھی وہاں اپنے حقوق کی بات کرنے پر کوئی طعن و تشنیع کا ہدف نہیں بناتا۔ اس لئے اہل مغرب کو لبرل سوسائٹی کہتے ہیں کہ وہ رنگ، نسل، عقیدے یا جنس کی بنیاد پر انسانوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے، بلکہ وہ تو ان لوگوں کی بات کو بھی احترام سے سنتے ہیں جو ایسی تفریق کے حامی ہیں۔ ہمارے ہاں کے ویسی لبرلز کا فارمیٹ ان کی سوشل میڈیا پوسٹوں سے بخوبی ظاہر ہے۔ اس پر میرا ایک مختصر مقدمہ سن لیجئے:

پاکستان کے بیس کروڑ عوام میں سے پشتون شاید 4 کروڑ ہوں۔

بتائیے لبرل ازم کے کس اصول کے تحت، نسل کی بنیاد پر پشتونوں پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں؟ کیا پشتونوں کی یہ توہین، اس احساس کمتری کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے ہیں؟ پاکستان کے بیس کروڑ عوام میں سے مدارس سے فارغ مولوی شاید ایک کروڑ ہوں گے۔

بتائیے لبرل ازم کے کس اصول کے تحت، پروفیشن کی بنیاد پر مولویوں پر پھبتیاں کسی جاتی ہیں؟ کیا مولویوں کی یہ توہین، اس احساس کمتری کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پروفیشن سے تعلق رکھتے ہیں؟ پشتونوں نے اگر اپنے حقوق کی خاطر، الگ سیاسی جماعت بنائی ہوئی ہے تو کسی لبرل کو کیا حق ہے کہ اس جماعت پر فقرے کے؟ مولویوں نے اگر اپنے حقوق کی خاطر الگ سیاسی جماعت بنائی ہوئی ہے تو لبرل کو کیا حق ہے کہ اس جماعت پر فقرے کسے؟

اس وقت پشتونوں کی کئی نمائندہ سیاسی جماعتیں ہیں، وہ اکٹھے کیوں نہیں ہو جاتے؟ یہ در دوسرے پشتونوں کا ہے یا غیر پشتونوں کا؟ کسی لبرل کو اس سے کیا تکلیف؟ اس وقت مولویوں کی کئی نمائندہ سیاسی جماعتیں ہیں وہ اکٹھے کیوں نہیں ہو جاتے؟ یہ در دوسرے مولویوں کا ہے یا غیر مولویوں کا؟ کسی لبرل کو اس سے کیا تکلیف ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی انرجی ضروریات کے لئے کالا باغ ڈیم بننا ضروری ہے۔ قوم پرست سیاسی جماعتوں کو اس سے اتفاق نہیں۔ وہ پریشر ڈالتے ہیں، سخت زبان استعمال کرتے ہیں کہ یہ ڈیم نہیں بننا چاہئے تو کیا یہ مطالبہ کرنا اس طبقہ کا حق نہیں؟ کیا وہ پاکستان کے شہری نہیں؟

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی امن اور معیشت کیلئے سیکولر آئین بننا ضروری ہے۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کو اس سے اتفاق نہیں۔ وہ پریشر ڈالتے ہیں، سخت زبان استعمال کرتے ہیں کہ ایسے قوانین نہیں بننے چاہئیں۔ تو کیا یہ مطالبہ اس طبقہ کا حق نہیں؟ کیا وہ پاکستان کے شہری نہیں؟

کالا باغ ڈیم کا مسئلہ اگر باقی پاکستانیوں کے لئے اتنا تشویش کا باعث ہے تو ریاست پاکستان کے



مقتدر ادارے، اس پہ قومی ٹیکنکل مکالمے کا اہتمام کیوں نہیں کراتے؟ تاکہ قوم پرستوں کا موقف بھی قوم کے سامنے آجائے؟ کیا قومی میڈیا میں اس مکالمے کا اہتمام اس نہیں کیا جا رہا تاکہ پشتونوں کو ضدی، کم عقل اور ملک دشمن ظاہر کیا جائے؟

آزاد آئین کا مسئلہ اگر باقی پاکستانیوں کے لئے اتنا تشویش کا باعث ہے تو ریاست پاکستان کے مقتدر ادارے، اس پہ قومی تھیورٹیکل مکالمے کا اہتمام کیوں نہیں کراتے؟ تاکہ مولویوں کا موقف بھی قوم کے سامنے آجائے؟ کیا قومی میڈیا میں اس مکالمے کا اہتمام اس لئے نہیں کیا جا رہا تاکہ مولویوں کو ضدی، کم عقل اور ملک دشمن ظاہر کیا جائے؟

معاف کیجئے، اپنی بات سمجھانے مجھے پشتونوں اور مولویوں کی مثال اس لئے بھی ایک ساتھ دینی پڑی کہ پختو، غیرت اور اسلام، ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔

بات یہ ہے کہ سیکولر اور لبرل میں ایک فرق ہوتا ہے۔ ایک سچا سیکولر، دلیل کا احترام کرتا ہے۔ دلیل پہ اپنا موقف پیش کرتا ہے اور دلیل کو سنتا ہے۔ جبکہ لبرل شخص، اگرچہ مذہب بیزار ہوتا ہے اور مذہبی لوگوں سے نفرت کرتا ہے لیکن بنیادی انسانی اخلاقیات کے پیش نظر، کسی بھی طبقے کا تمسخر نہیں اڑایا کرتا۔

مگر ہمارے دیسی جعلی لبرلز، فقط ایک خالی الذہن متعصب طبقہ ہے، جن کے پاس سوائے جگتوں اور لطیفوں کے کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اس لئے ان لبرلز کو میں ”میڈان چائنا“، یعنی دو نمبر لبرلز کہتا ہوں۔ راقم خود کو ایک سچا سیکولر سمجھتا ہے، اس لئے کہ سیکولر مناقف نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل مضمون، کئی جہات واضح کرے گا۔

### ایک سیکولر، کم علم ہو سکتا ہے پر مناقف نہیں:

لبرل اور سیکولر میں بڑا فرق ہے۔ لبرل کہتا ہے کہ ہم اپنی مرضی کی زندگی گزارنے میں آزاد ہیں۔ مجھے آپ سے اور آپ کو مجھ سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہئے۔ کھالے، پی لے، موج اڑالے:

۔۔۔ بابر بہ عیش کوش، کہ عالم دوبارہ نیست

سیکولر مگر یہ کہتا ہے کہ: آئیے! ایک مہذب معاشرے کو وجود میں لانے کے لئے ہم مکالمہ کریں۔ اگر ایک دوسرے کی دلیل سے مطمئن نہ ہو سکے، تب بھی ایسا پر امن راستہ نکالیں گے جس میں بقاءے باہمی سے زندگی گزار سکیں۔

ایک سیکولر آدمی، امن کا داعی ہوتا ہے۔ پس وہ اپنی سوسائٹی سے بے گانہ نہیں رہ سکتا۔ سیکولرزم، سوشلزم اور جمہوریت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔



تجزیے کی دعوے سے جنم لیتے ہیں، ایک سیکولر کسی دعوے پر اپنے تاثرات دینے سے پہلے مقدور بھر ہر زاویے سے اس کا جائزہ لیتا ہے۔ اس تحقیق میں کم علمی یا بھول چوک تو ہو سکتی ہے مگر منافقت نہیں۔ اس لئے کہ سیکولر آدمی، معاشرے کے کسی طبقے سے تعصب رکھتا ہے، نہ کسی سے نانصافی برداشت کرتا ہے۔ مگر پختونخوا کے آرمی پبلک اسکول میں بچوں کے قتل عام کے ضمن میں سیکولرزم کے داعی چند لکھاریوں نے خود ہی جج بن کر پہلے قاتل نامزد کئے، پھر اس بنیاد پر ”ملاں“ کی مذمت میں مرصع بیانئے لکھ کر، ملفوف انداز میں اسلام کو پختونواری کی علت قرار دینے کی کوشش کی۔

ملا برہمن ہیں یا شورو، تعداد میں کم ہیں یا زیادہ۔ مگر ہمارے معاشرے کا ایک طبقہ ضرور ہے۔ اپنی ذاتی رائے رکھنا اور بات ہے، مگر کسی طبقے کی تذلیل کرنا، چاہے وہ احمدی ہی کیوں نہ ہوں، کم از کم میرے سیکولرزم سے تو بعید ہے۔ تجزیہ کرنے اور نتیجہ نکالنے سے پہلے دو بنیادی معلومات اکٹھی کریں۔ قاتلوں کی شناخت اور بربریت کی وجوہات۔

ایک سیکولر کو کیسے تجزیہ کرنا چاہیے؟ اس پر اپنا موقف واضح کرنے میں آرمی سکول پشاور کے سامنے کی مثال لیتا ہوں۔ جب قاتل و مقتول دنیا میں نہ رہے، اور فوج نے فوراً چند سہولت کار پکڑ لئے جنہوں نے اعتراف کیا کہ یہ ٹی ٹی پی کی کارروائی ہے، تو کوئی وجہ نہیں بنتی کہ فوج کی اس خبر پہ اعتبار نہ کیا جائے۔ مہذب ملکوں میں سرکاری، بالخصوص فوجی ایجنسیاں ہی تو ہوتی ہیں کہ قاتل کون تھے؟ شومی قسمت کہ پاکستان کے عوام کی اکثریت اپنی ایجنسی کی اطلاع کو قابل اعتماد نہیں سمجھتی، اس لئے کہ اس محکمہ کا ٹریک ریکارڈ مشکوک ہے۔ ماضی یہ ہے کہ بنگال میں 90 ہزار فوج ہتھیار ڈال رہی تھی اور یہ محکمہ ہماری فتح کی رلیز جاری کر رہا تھا۔ حال یہ ہے کہ میان حلفی تھا ”پاکستانی ائیرپورٹ، امیریکیوں کو نہیں دئے گئے“ اور بعد میں پتہ چلا، بغیر کسی لکھے معاہدے کے ڈبائی ہی حوالے کر دئے گئے تھے۔

لوگ اس پہ یقین نہیں کرتے کہ نظریاتی سہولت کار، ڈاکٹر عاصم جیسوں سے بھی کمزور دل ہوں گے۔ ڈاکٹر عاصم کو چھ ماہ تحویل میں رکھ کر ایجنسیاں کچھ نہ اگلواسکیں، مگر سہولت کار دوسرے روز ہی سب راز اگل دیتے ہیں۔ لہذا، جنرل عاصم باجوہ کے انکشافات کو ایک طرف رکھیں اور ممکنہ قاتلوں کی دلائل کے ساتھ ایک فہرست بنائیں۔

پہلا نام تو دشمن ملک کی ایجنسی کا ہوگا جس کے اسباب ظاہر ہیں۔ دوسرا نام، ٹی ٹی پی کا ہے۔ پاکستانی طالبان کوئی خیالی وجود نہیں ہے، بلکہ ان کی دہشت و بربریت کی تفصیلی داستانیں، ابھی اہل پاکستان کو پوری طرح معلوم نہیں ہیں۔



بحرین پولیس میں محسود قبائل کافی تعداد میں بھرتی ہیں۔ 2007ء میں خاکسار وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں طالبان کا چندہ (یا بھتہ) جمع کیا جاتا ہے اور ایک آدمی نے لیت و لعل سے کام لیا تو اس کے اہل خانہ کو بیت اللہ محسود نے اٹھوا لیا اور پھر اس نے وہاں جا کر معافی طلبی کی۔ مہمند ایجنسی میں ولی خان نامی سفاک طالبان لیڈر کے قصے سنیں تو آپ کو آرمی سکول کا سانحہ بھول جائے۔ مگر ایک بہت افسوسناک پہلو یہ ہے کہ قبائلی، جب طالبان کی درندگی کی باتیں سناتے ہیں، تو دبے لفظوں میں آرمی اور طالبان کے گٹھ جوڑ کے بھی کئی واقعات سناتے ہیں۔

ممکنہ قاتلوں میں تیسرا نام، ایم کیو ایم بھی ہو سکتا ہے کہ بربریت ان کی پہچان بن چکی ہے۔ کبھی فوجی ایجنسیوں نے ہی ہمیں بتایا تھا کہ ایم کیو ایم کے لوگ بوری بند لاشوں میں ملوث ہیں اور ان کے حقوق خانوں میں مخالفین کے بدن میں ڈرل سے سوراخ کئے جاتے ہیں۔ صولت مرزا جیسوں کی گواہی کے بعد، ان وحشیوں کے گرد گھیرا تنگ ہونے لگا تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے ایجنسیوں کو عوامی دباؤ میں لانے کو یہ حرکت کی ہو؟ ایک نام پیپلز پارٹی کا بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی تاریخ بھی ایسے کاموں سے مبرا نہیں۔ انہوں نے پی آئی اے کا جہاز اغوا کر کے اور معصوم مسافر کو قتل کر کے، اس ملک میں پہلی دہشت گردی کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ خبریں بھی آتی رہی ہیں کہ زرداری ٹولے کی طالبان سے رسم و راہ تھی۔ خود زرداری کی فوج کو دھمکی بھی ریکارڈ پر ہے۔ افواہ تو یہ بھی ہے کہ بینظیر کو مروانے میں اس کا ہاتھ ہے۔ عزیز بلوچ، پیپلز پارٹی کا سرکردہ راہنما ہے۔ بھتہ نہ دینے پر 400 معصوم لوگوں کی جان لینے کا اقرار کر چکا ہے اور اس خونخواری میں بقول اس کے ”انسانیت نواز“ پیپلز پارٹی کے بڑوں کی آشریہ باد حاصل رہی۔ آج عزیز بلوچ کی وجہ سے ان کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے تو وہ لوگ جو بال بنانے کے لئے معصوموں کی جان لینا کھیل سمجھتے تھے، کہیں انہوں نے تو ایجنسیوں کو گمراہ کرنے کیلئے یہ تل عام نہیں کیا؟

پھر اپنی فہرست میں، فوج کو بھی مشتبہ کے طور پر رکھنا ہو گا کہ بربریت میں خود فوج کا ماضی بھی داغدار ہے۔ جنرل نگا خان نے بنگال میں قتل عام سے کہا تھا کہ مجھے بنگال کی زمین چاہیے، بنگالی نہیں۔ ممکن تو یہ بھی ہے کہ کسی نے یہ جملہ دہرایا ہو کہ ہمیں پختونخوا کی زمین چاہیے، پختون نہیں۔ ڈھا کہ یونیورسٹی اور لال مسجد کے طلباء کو قتل کرنے والا ادارہ، کیونکر مشکوک نہیں ہو سکتا؟

آپ خود کو سکولر سمجھتے ہیں تو آپ کو سب مشکوک کرداروں پر نگاہ رکھنی ہوگی۔ اگر دعوے کے ذمہ داران کی فہرست میں آپ کو طالبان کے علاوہ کوئی نہیں سوچتا تو یا تو آپ متعصب اور منافق ہیں، یا پھر آپ کا ذہن کمزور ہے، ہر دو صورت میں صرف اردو دانی اور لفاظی کے زور پر آپ کو تجزیے جیسا سنجیدہ کام



نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے مندرجہ بالا زاویوں سے جائزہ لینے کے بعد یہ رائے بنائی ہے کہ یہ دہشتگردی، ٹی ٹی پی نے کی ہے۔ ہو سکتا ہے میرا تجزیہ غلط ہو، مگر میں نے ممکنہ قاتلوں کی ساری فہرست آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ میرا خیال ہے ایک سیکولر کا یہی انداز ہونا چاہئے۔ خیر، آگے چلیں، اب نام پتہ چل گیا تو ان کی حقیقت معلوم کی جائے۔ اس کے بعد سوال ہوگا کہ انہوں نے کیوں یہ کام کیا؟

صورتحال یہ ہے کہ ٹی ٹی پی والوں کو بھی صرف جنرل باجوہ صاحب جانتے ہیں کیونکہ یہ پاکستانی طالبان، ہر کارروائی کے بعد جنرل صاحب کو ہی فون کر کے اس کی ذمہ داری قبولتے ہیں۔ ہم بیچارے تو ابھی تک یہ نہیں جان پائے کہ کرل تارڑ کو کرل امام کیوں کہتے تھے؟

خیر کرل امام کو تو ہم نے نہیں دیکھا، لیکن مشرف دور میں لا پتہ افراد کے حق میں مظاہرے کرنے والا سفیر ریش، خواجہ خالد تو سب کو یاد ہوگا۔ ہم نے ٹی وی پر اس نیک بزرگ کو پولیس کی لاثمیاں کھاتے دیکھا پھر پتہ چلا کہ کرل امام کے ساتھ خواجہ خالد بھی وزیرستان میں مارے گئے اور دونوں حضرات ہماری ایجنسیوں کے ملازم تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دس سال بعد ہمیں پتہ چلے کہ مولوی برقعہ پوش، دراصل میجر عبدالعزیز صاحب تھے؟ اب آپ یہ نہ کہیں کہ وہ مدت دراز سے جمعہ کے خطبہ دیتا ہے۔ لارنس آف عربیا انگریز ہو کر عربوں کی امامت کر سکتا ہے تو ہماری ایجنسیاں بھی اتنی گئی گذری نہیں۔ خیر سے فلوں میں اداکاری سے لے کر، گائیکی وغیرہ نگاری تک نامور پروفیشنلوں کو مات دیتے ہیں۔

جب ریاست حقائق چھپاتی ہے تو پھر عوامی ذہن سازی میں، سینہ گزٹ خبریں ذخیل ہوا کرتی ہیں۔ افواہ تو یہ بھی ہے کہ جب افغان مجاہد راہنماؤں کا اسلام آباد آنا ضروری ہو گیا تو لال مسجد کے پہلو میں یتیم لڑکیوں کا باپردہ مدرسہ بنایا گیا جس کے زیر زمین راستے، آچارہ میں نکلتے تھے۔ شنید یہ بھی ہے کہ خود بیت اللہ محمود آپریشن سے دو ماہ پہلے اسلام آباد آیا تھا اور لال مسجد کے مولوی کے حجرے سے ہو کر آچارہ سے لنڈے کے کپڑے خریدنے گیا تھا۔ خیر جب اس مدرسے کی ضرورت نہ رہی تو اس کے انہدام کو دنیا کے میڈیا سے چھپانے کیلئے ”کثیر المقاصد“ اہداف پر مشتمل ایک حساس آپریشن کیا گیا۔

بہر کیف، مجھے سیکولر ہونے کا دعویٰ ہے تو اس طرح سنی سنائی باتوں پہ اپنے بیانیے تشکیل نہیں دیا کرتا۔ لیکن فرض کریں، واقعی مولویوں کا ایک گروپ اس خونریزی میں ملوث ہو، تب بھی پوری ایک کمیونٹی کو رگیدنا، کونسا سیکولرزم ہے؟

حیرت ہے کہ جنرل ضیاء کو گالیاں دیتے ہوئے اسکے ادارے کو گالی نہیں دی جاتی۔ حالانکہ پورا ادارہ اس کی پشت پہ کھڑا تھا (اور اب بھی ہے) مگر لال مسجد یا سانحہ پشاور کے جنونی کو بنیاد بنا کر، ہر مولوی کو گالی



دی جاتی ہے۔ اگر آپ سیکولر ہیں تو کسی طبقے پر تبصرہ کرتے وقت گھوڑے، گدھے کا فرق کیوں نہیں روا رکھتے؟ کیا اس کا سبب، فقط لاعلمی ہے یا منافقت ہے؟

میں نہیں کہتا کہ مذہبی لوگوں کو ایسی خونریزی میں استعمال نہیں کیا جاسکتا، 150 میرا سوال یہ ہے کہ آپ پورے طبقہ کو اس سے کیونکر جوڑتے ہیں؟ اگر آپ یہ بہانہ بناتے ہیں کہ مذہبی طبقہ، دہشتگردی کی کارروائیوں کی مذمت نہیں کرتا تو معاف کیجئے، آپ پھر منافق یا لاعلم ہی ہو سکتے ہیں۔

اگر مولوی عبدالعزیز جیسے لوگوں نے اسلام کے نام پر بچوں کو مروایا تو مشرف نے بھی کارگل میں ہزاروں جوانوں کو وطن کے نام پر بلا وطن کر دیا۔ مولوی عبدالعزیز سے علماء کی اکثریت نے براءت کا اعلان کیا جبکہ مشرف کے ایڈووکیٹس سے بھی 99 فیصد فوج لاعلم تھی (مشرف سے اختلاف کرنے والے افسروں کی کتابیں مارکیٹ میں ہیں) فرق یہ ہے کہ سنجیدہ علماء، مولوی برقعہ پوش سے اس کے ایڈووکیٹس کے دوران ہی براءت کا اعلان کرتے تھے، جبکہ پرویز مشرف کے دوست اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس سے اپنا اختلاف بیان کرتے ہیں۔

برسبیل تذکرہ، ملاں کے خلاف لکھے متعصبانہ تجزیوں میں کھوم گھام کے بات ملا عمر پہ ضرور لائی جاتی ہے اس خاکسار کی بد قسمتی یہ ہے کہ ہوا کا رخ دیکھ کر نہیں لکھتا۔ چنانچہ ملا عمر کے عروج میں ان کا نفاذ تھا تو اب ان کا حمایتی ہوں۔ وہ طالبان جن سے ساری دنیا بخوبی واقف ہے، وہ افغانستان نامی ہمارے پڑوسی ملک میں ملا عمر کے زیر امارت حکومت کیا کرتے تھے (یاد رہے کہ افغانستان ایک خود مختار ملک ہے، ہماری باجگزار ریاست نہیں) افغانستان کے علاوہ ایران بھی ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ مہذب دنیا ہم کو اجازت نہیں دیتی کہ کسی ملک کے داخلی معاملات میں دخل دیں اور پھر یہ تو ہمارے پڑوسی ممالک تھے، لیکن اگر دوسرے ملک پہ تبصرہ کرنا ضروری ہے تو صرف ایک پر کیوں؟ ایران اور افغانستان دونوں پر کیوں نہیں؟

ہمیں افغانستان میں ملا عمر کی سوچ اور طرز حکومت سے اختلاف تھا، اسی طرح ہمیں ایران میں امام خمینی کی سوچ اور طرز حکومت سے بھی اختلاف تھا۔ طالبان ووٹ کے ذریعے برسر اقتدار نہیں آئے تھے اور نہ ہی خمینی صاحب۔ طالبان اپنے تئیں پوری دنیا کے کفار کے دشمن تھے لیکن انہوں نے کبھی کسی کو نام لیکر گالی نہیں دی۔ خمینی صاحب نے تہران کے چوک پر ایک بڑا بل بورڈ لگوا دیا تھا جس پر جنرل ضیاء، صدام حسن اور ملک فہد کی تصاویر لگی تھیں اور نیچے ”سگان امریکہ“ یعنی امریکہ کے کتے لکھا تھا۔ آپ نے کبھی اس رویے کو بھی زیر بحث لایا؟ نہیں تو کیوں؟

امام خمینی کے برسر اقتدار آتے ہی پاکستان میں مفتی جعفر حسین کی قیادت میں ”تحریک نفاذ فقہ جعفریہ“



رجسٹر کی گئی۔ کیا طالبان نے پاکستان میں کبھی ”تحریک نفاذ فقہ طالبانی“ بنائی؟ تسلیم کہ طالبانی فقہ والے یہاں پہلے سے موجود تھے۔ تو ٹینیسی صاحب کے فقہ والے بھی روز اول سے یہاں موجود تھے اور بمشکل 10 فیصد ہونے کے باوجود ہر سال پورا ملک دو دن کے لئے ان کا ریغمال بنا دیا جاتا تھا (اور ہے) اگر میں سیکولر ہوں تو مجھے کسی کے فردی عقائد سے کام نہیں، مگر سوسائٹی کو ڈسٹرب کرنے والے افعال کو زیر بحث لانا میری ذمہ داری ہے یا نہیں؟

موازنے ہی کے لئے سہی، کبھی اس پہلو کو بھی آپ نے موضوع بنایا ہے؟ نہیں، تو کیوں؟ اگر آپ کو یہ اعتراض ہے کہ پاکستان میں طالبانی سوچ کے حامل افراد پائے جاتے ہیں، تو اس میں کوئی انہونی ہے؟ روس نہ ہمارا ہمسایہ ہے، نہ اس سے مذہبی یا نسلی تعلق ہے۔ مگر کیاروس کے نظریاتی حمایتی، جن کو ”سر خٹے“ کہا جاتا تھا، ہمارے ملک میں ایک معتد بہ تعداد میں موجود تھے، یا نہیں؟ بات نظریاتی ہم آہنگی کی نہیں ہے، مگر اولیت اس ملک کے امن کو ہونی چاہئے۔

بجا کہ پاکستان میں کچھ لوگوں نے بزدل، ایرانی یا افغانی نظریات نافذ کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ایسی ہی کوشش روسی نظریات کی خاطر چند نامور لوگ بھی تو کر چکے ہیں۔ ہمارے فوجی ذرائع نے ہمیں ”پنڈی سازش کیس“ کی کہانی سنائی تھی، جس کے مطابق فیض احمد فیض جیسے لوگ بھی اپنے نظریات کی خاطر پاکستان میں بغاوت کرانا چاہتے تھے۔ آج فوج کے نامزد دنداروں کو گالیاں دینے والوں کو چاہیے کہ اسی کٹنے کے تحت فیض صاحب کو بھی اس سعادت سے محروم نہ رکھیں۔

سیکولرزم کے علمبرداروں سے درخواست ہے کہ باچا خان اور مودودی، یا طالبان اور جمہوریت کا بیانیہ لکھنے سے پہلے خود سیکولرزم کا بیانیہ واضح کیجئے کہ یہ کس چڑیا کا نام ہے؟ اس کے کیا اصول و ضوابط ہیں؟ جاتے جاتے، ایک بات عرض کرتا چلوں، کہ آپ عوام میں ”طالبانی ذہن“ مضبوط ہونے سے شاکہ ہیں تو اس کا بڑا سبب خود پاکستان کے نام نہاد سیکولرز کا ہاتھ ہے۔

عافیہ صدیقی امریکی شہری ہے، مگر گرفتار آپ کے ملک سے ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ عافیہ صدیقی نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو، مگر عدالت میں بہر حال اس پہ یہ چارج شیٹ پیش کی گئی کہ اس نے ایک امریکی میرین پر راقفل تانی قحی۔ اس راقفل تانے کے جرم پر، امریکی عدالت نے اس کو 80 سال قید کی سزا دی۔ (وہ لوگ متوجہ ہوں جن کو اسلام میں وحشیانہ سزائیں نظر آتی ہیں)

اب پاکستان کے مشہور مولوی بھی معلوم ہیں، جیسے مولانا فضل الرحمن اور مشہور سیکولر بھی معلوم ہیں، جیسے حسن ثار۔ پاکستان کی معتدل عوام مولانا کو تو دہشت گردی کی بابت تک دہمت کرتے دیکھتے ہیں، پر حسن



نثار صاحب کو عافیہ کی سزا کی مذمت کرتے نہیں دیکھتے۔ اسی رویے کی بناء پر عوام میڈیا کو متعصب جان کر سینہ گزٹ خبروں اور تجزیوں کا شکار بننے ہیں اور بقول آپ کے طالبانی ذہنیت کا شکار ہوتے ہیں۔ آپ کو گلہ ہے کہ مولوی دہشت گردی کی مذمت تو کرتے ہیں مگر ”چونکہ، چنانچہ“ بھی ساتھ لگاتے ہیں۔ آپ طالبان مخالفین سے پوچھئے کہ عافیہ صدیقی کی سزا بارے آپ کا کیا رد عمل ہے؟ یقین کیجئے کہ وہ بھی اگر مذمت کریں گے تو ”اگر مگر“ ضرور لگائیں گے۔ پس کوئی آدمی اپنا پورا موقف بیان کرنا چاہے تو اسے ”اگر مگر“ کی پالیسی نہیں کہا جاتا۔

برسبیل تذکرہ حسن نثار صاحب اکثر ایک تجزیہ کرتے ہیں کہ پاکستانی عوام مولویوں کو گھاس بھی نہیں ڈالتے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ عوام ان کو ووٹ نہیں دیتے۔ یہ ان کا ایک اور غلط تجزیہ ہے۔ عوام کا علماء سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ ووٹ وہ اس لئے نہیں دیتے کہ وہ علماء کو حکومت چلانے کا اہل نہیں سمجھتے۔ کوئی آدمی اپنے بیٹے کو ست یا نا تجربہ کار سمجھتا ہے اور اس بناء پر اپنی دکان اس کے حوالے نہیں کرتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا رشتہ ختم ہو گیا۔

عرض یہ کرنا تھا کہ مولوی اس ملک کا بہت بڑا طبقہ ہے، جو عوام پہ ڈائیز کٹ اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک سیکولر ہونے کی حیثیت سے آپ لوگوں کی رائے پر تنقید کریں، مگر اس کا مضحکہ نہ اڑائیں۔ پھر اس تنقید میں اس عامہ خراب نہیں ہونا چاہئے اور بلا دلیل کسی طبقے کی تذلیل نہیں ہونی چاہئے۔ چونکہ ہم نے نئے سیکولر بنے ہیں تو ہم کو یہی سیکولرزم سمجھ میں آیا ہے۔ سیکولرزم کے علاموں اور مقتداؤں سے درخواست ہے کہ اگر یہ غلط ہے تو آپ سمجھادیں کہ اصل سیکولرزم کیا ہوتا ہے؟

Official Jamiat

مضمون ختم ہوا۔

امید ہے آپ کو میرا موقف پوری طرح سمجھ آ گیا ہوگا۔ سیکولرزم، ایک انسانی خوبی ہے اور ہر خوبی کا اولین داعی اسلام ہے۔ میں جمیعت علماء اسلام کو ایک سیکولر دینی جماعت سمجھتا ہوں۔ اس پر ایک دوست نے اعتراض اٹھایا تھا، جس کے جواب میں مندرجہ ذیل تحریر لکھی تھی۔

جمیعت علماء ایک سیکولر دینی جمہوری جماعت ہے:

فطری بات ہے کہ ایک ہی معاملے کو ہر انسان اپنے الگ زاویہ نظر سے دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ کسی جماعت کے کارکنوں میں فہم کا یہ اختلاف، اس وقت تک مضرت نہیں جب تک نیت ٹھیک اور منزل ایک ہو۔ پاکستان کے موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ تمام جمہوریت پسند اپنی ساری توانائیاں، پس منظر اور



پیش منظر پہ چھائی فاشٹ قوتوں کی بیخ کنی کے لئے استعمال کریں۔ نہ جانے کیوں، بعض محترم دوستوں نے ایک غیر اہم موضوع کو چھیڑ دیا، جس سے نظریاتی دھڑے بندی کا امکان ہو سکتا ہے۔ ہم سیکولر لوگ ہیں، ہمیں مختلف نقطہ نظر بخوشی گوارا ہے۔ لیکن چونکہ مذکورہ موضوع پر بڑے ”دانشور“ قسم کے دوستوں نے ہمارے موقف کو استہزاء کا نشانہ بنایا ہے، تو اپنی بات واضح کرنا ہماری ذمہ داری بن جاتی ہے۔

کہا گیا کہ ”سیکولر حکومت کسی مذہب کو نہیں مانتی جبکہ جمیعہ علماء اسلام خدا کی زمین پر خدا کا نظام چاہتی ہے“ اس جملے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ گویا سیکولرزم، اسلام کے بالمقابل ایک الگ عقیدہ ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ نہیں بلکہ ایک طریق کار ہے۔ سیکولر نظام حکومت، انگریزی اصطلاح ہے اور اس کے برعکس تھیوکرٹیک نظام حکومت ہے۔ سیکولر حکومت کی مثال انڈیا کی ہے، جبکہ تھیوکرٹیک کی مثال طالبان کی حکومت کی تھی (پاکستان کا آئین بھی اصلاً سیکولر ہے، سوائے چند مجمل عبارات کے)

اب جو لوگ سیکولرزم کو ایک عقیدہ سمجھ کر اسے جمعیت کے مانو کے خلاف سمجھتے ہیں، وہ شاید جمعیت علماء کو بدترین منافق جماعت ثابت کرنا چاہتے ہیں، جو انڈیا میں سیکولرزم کی حمایت میں سرگرداں ہے۔ کسی غیر اسلامی عقیدے کی مجبوراً حمایت محض اس لئے نہیں کی جاسکتی کہ وہاں مسلمان تھوڑے ہیں۔ ورنہ پھر تو ایران میں شیعہ تھیوکرٹیک کی بھی حمایت کرنا ضروری ہے، کیونکہ وہاں سنی تھوڑے ہیں۔ جمعیت علماء نے طالبان کی حکومت کو تسلیم کیا، اس پہ غیر ملکی تسلط کو ناجائز قرار دیا، لیکن کبھی امارت اسلامی کے طرز حکومت کی بالکل حمایت نہیں کی۔ اس کے بالمقابل مولانا رشید مدنی کے بیانات ریکارڈ پر ہیں کہ انڈیا کے سیکولر آئین کی حفاظت کے لئے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔

جناب عالی! کوئی بھی حقیقی جمہوری معاشرہ سیکولرزم کے بغیر قائم ہو نہیں سکتا۔

سیکولرزم، عدم تشدد اور دلیل کا نام ہے اور یہ دلیل قرآن و حدیث سے نہیں بلکہ معاشرے کے منفقہ دستور سے دی جائے گی۔ اسی کو سیکولرزم کہتے ہیں۔ سیرت نبوی سے دلائل جمعیت علماء کے ورکرز کیلئے ہیں، اسمبلی کے فورم پر صرف 1973 کے آئین کے تناظر ہی میں دلائل دیئے جائیں گے۔

اگر یہ طریقہ کار اصل نہ ہوتا تو مولانا فضل الرحمن کو بے نظیر کی بجائے ضیاء الحق کے شریعت بل کا ساتھ دینا چاہئے تھا۔ وہ کم از کم بے نظیر سے زیادہ دین کی باتیں کرتا تھا۔

محترم دوستو! جمعیت علماء کا امتیاز یہ ہے کہ یہ دلیل اور جمہور کو ساتھ لے کر اپنا موقف قوم کے سامنے رکھنا چاہتی ہے۔ اس معاملے میں وہ عامۃ الناس کو مذہبی بلیک میلنگ کا شکار نہیں کرتی کہ یہ سیکولرزم کے



اعمولوں کے خلاف ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کیلئے مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی ابتداء مسلم لیگ اور مسٹر جناح نے کی تھی جس نے ”مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ“ کے نعرے پر سادہ لوح عوام کو بلیک میل کیا حضرت مدنی نے تو ہندو، سکھ سب کو ساتھ لیکر وطن کو غیروں سے آزاد کرنے کی بات کی تھی، جس پر ان کو مووددی اور علامہ اقبال سمیت سب کے طعنے سننے پڑے تھے۔

ایک بات اور بھی واضح کروں، جمعیت علماء کا مانو ہے ”خدا کی زمین پر خدا کا نظام“ خدا کسی سے بذات خود رابطہ میں نہیں ہے کہ وہ بتائے کہ میرے والا اصل نظام کونسا ہے؟ ایک ہزار مولوی ہیں اور ہر ایک، اپنا اپنا خدا کا نظام لانا چاہتا ہے۔ جمعیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی نظام کو خدا کا نظام کہتی ہے جو علمائے دیوبند نے سمجھا اور بتایا ہے۔ اس میں انیس بیس کا فرق ہو سکتا ہے، پر زیادہ نہیں۔ اب اس نظام کو مسلمانان پاکستان سے دلیل کی قوت سے منوانا ہی جمعیت کا طریقہ ہے اور اسے ہی سیکولر نظریاتی جدوجہد کہتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ اسلامی نظام، لال مسجد کے مولوی یا فوجی بوٹوں کے سہارے لانا ہے تو ہم اسے جمعیت کی پالیسی کے خلاف سمجھتے ہیں۔

جمعیت کے کارکن، خدارا بات کو سمجھیں۔ جمعیت دلیل کی قوت رکھتی ہے اور پاکستان میں جب بھی حقیقی جمہوری پارلیمان قائم ہوا تو اسے جمعیت کے دلائل کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔ جب تک پارلیمنٹ کی قوت مضبوط نہیں ہوتی، اعلیٰ بات نہیں ہو سکتی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ریاست اور چیز ہے، حکومت اور چیز۔ ریاست قائم رہتی ہے، حکومتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ مگر جب حکومت کو غیر آئینی طریقے سے ہر اسال کیا جائے تو ریاست کمزور ہوتی اور اس کے بعد آپ کے ”مانو“ وغیرہ ہوا ہو جاتے ہیں۔ لولی لنگڑی، جیسی بھی ہو، پہلے حکومت کو طاقت دیں کہ ادارے اس کے کنٹرول میں آجائیں، اس کے بعد جمہوری حکومت کو بھی آئین کے دائرے میں لانا آسان ہے اور آئین میں ترامیم کرنا بھی آسان ہے۔

موجودہ جمہوریت کمزور ہے، بد مزہ ہے۔ مگر اسکا علاج یہ نہیں کہ اس جمہوریت کا بوریا بستر لپیٹ دیا جائے۔ نو آموز مصور سے اگر کتاب کی تصویر اچھی نہیں بنی تو دس بار یہی تصویر بنائے، بالآخر اچھی تصویر بن جائے گی۔ لیکن کتاب کی تصویر اچھی نہ بنے تو شلغم کی بنائے، وہ نہ بنے تو گھوڑے کی بنالے۔ تو قیامت تک ایک بھی اچھی تصویر نہیں بن سکتی۔ المختصر ہر وہ نظریاتی جماعت دینی نظریہ کی ہو یا دنیاوی، اگر وہ موجودہ جمہوری پارلیمانی نظام میں حصہ لے رہی ہے تو وہ سیکولر سیاست کر رہی ہے۔ ہم نے جمعیت علماء کی حمایت اسے ایک سیکولر دینی جمہوری سیاسی جماعت مان کر کی ہے، بلکہ ہم دین اسلام کو بہترین سیکولر دین سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی کارکن، جمعیت کو انقلابی خلافت والی جماعت سمجھ کر شامل ہے تو ہمیں اس کے موقف سے کوئی



مسئلہ نہیں لیکن ہمیں بہر حال اپنے موقف پہ شرح صدر حاصل ہے۔

## کیا آپ نظریاتی جمہوری جماعتوں کی جدوجہد سمجھتے ہیں؟

پاکستان میں نظریاتی جمہوری جماعتیں صرف دو ہیں۔ ملکی انتظام میں دین کا نفوذ چاہنے والی جمعیت علماء اسلام اور دین کو ملکی انتظام سے الگ کرنے کی داعی اے این پی (خوش قسمتی سے دونوں جماعتیں، اپنی ہیئت میں سیکولر ہیں، میرے نزدیک سیکولر کا معنی عدم تشدد ہے) باقی سیاسی جماعتیں یا توروثی، کپڑا اور مکان کے سلوگن پہ سیاست کرتی ہیں، یا میگا پراجیکٹس، یا روزگار وغیرہ کے نعرے پر۔ تو ظاہر ہے کہ ان کاموں کا کسی خاص نظریے سے تعلق نہیں ہوتا۔ یہ عام انسانی ضروریات ہیں، جو ہندو مسلم سب کیلئے ہیں اور اس پہ کسی بھی نظریاتی جماعت کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟۔

(معاف کیجئے، 40 جماعتوں کا وہ ٹولہ، جو خانقاہ آپارہ کے حکم پہ وقتاً فوقتاً کٹھے ہو کر دنگل سجایا کرتا ہے، ان کو میں نظریاتی جمہوری فہرست میں شمار نہیں کرتا)

اسلامی نظریاتی جماعت کا مسئلہ وہاں شروع ہوتا ہے جب وہ قرآن و حدیث کے نظام کو قومی فلاح کا اصل نظام گردان کر اس کے نفاذ کی کوشش شروع کرے۔ مثلاً پاکستان میں سودی نظام کی مثال لیں۔ سود، نہ صرف سب سے بڑا گناہ ہے بلکہ اسی سے غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر ہوتا ہے۔ ضمناً اسی سے فحاشی، ڈاکے اور انتہا پسندی پھیلتی ہے۔

اب صورتحال یوں ہے کہ پوری دنیا سودی نظام میں جکڑی ہوئی ہے، مثلاً آج ایک آدمی جج پہ جانا چاہے تو وہ زمانہ نہیں کہ اپنا بستر اٹھائے اور پیدل مکہ کو چل دے۔ ویزے، ٹکٹ، بینک سے ہو کر جانا پڑے گا اور گویا جج کرنے میں بھی سودی نظام سے تلوٹ کرنا پڑتا ہے (یہ الگ بات ہے کہ سعودی عرب میں اس کو کوئی اور خوش کن نام دے دیا جائے)

عوام بچوں کی طرح کم فہم ہوتے ہیں، ان کی اکثریت کو سود کی دنیاوی قباحت کا بھی علم نہیں ہوتا اور نہ انہیں اس نظام کے بدلنے سے کوئی غرض ہوتی ہے۔ مگر اہل دانش، والدین سماں ہوتے ہیں، وہ بچوں کی چاہت کو نہیں، ان کے مستقبل کو سوچ کر، ان کی رہبری کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

سوچنے سمجھنے والے دینی حلقے، پاکستان میں اس سودی نظام بارے کیا سٹریٹیجی رکھتے ہیں.....؟

آئیے ذیل میں اس کا ایک جائزہ لیتے ہیں:

1: ایک وہ دینی طبقہ ہے جو سود کی قباحت کو واضح کرنے، بڑے بلند پایہ علمی مضامین لکھ کر سمجھتا ہے



انہوں نے اپنا حق ادا کر دیا۔

2: ایک وہ طبقہ ہے کہ جو عوام میں دینی جذبات بیدار کرنے کی محنت میں لگن ہے کہ عوام میں ایمان جاگے گا تو وہ خود ہی سود چھوڑ دیں گے۔

3: ایک وہ دینی طبقہ ہے جو سمجھتا ہے کہ جب تک حکومتی سطح پر سودی نظام ختم نہیں ہوگا، لوگ پتے رہیں گے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو اقتدار پر گرفت چاہتا ہے، مگر اس میں پھر تین قسم کی سوچ ہے:

1: ایک وہ جو بزرگ و حکومت پہ قبضہ کر کے سودی نظام کا خاتمہ چاہتے ہیں یہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں۔

2: کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو حکومت میں آنے کیلئے متفقہ آئینی طریق کار کے ساتھ ساتھ پس پردہ سازشیں یا فوج کی مدد سے بھی عارضی۔ ان کی نیت چاہے اچھی بھی ہو، پر ہمارے نزدیک یہ رویہ غلط ہے۔

3: تیسرا طبقہ ہمارا ہم فکر ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ ہم عوام کی نمائندہ پارلیمنٹ کے ذریعے، سود کے خاتمے کا دیر پا حل ڈھونڈیں گے۔ مگر اس طبقہ کو بھی "تدریج" کے سنت طریقے کا فہم ہونا ضروری ہے کہ انسانی

معاشرے بن دبانے سے نہیں بدلا کرتے بلکہ پودوں کی طرح گوڑی، پھیری کرنا پڑتی ہے۔ رسول پاک

نے حجۃ الوداع پہ ہی سود ختم کرنے کا اعلان کیا تھا، حالانکہ اللہ اور رسول کو پہلے سے اس کی حرمت کا علم تھا۔

(مذکورہ بالا ساری بحث میں صرف "سود" کے مسئلے کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ علیٰ حد القیاس، باقی معاشرتی

مسائل پہ بحث ہوگی)

اب آپ پہلے یہ فیصلہ کریں کہ کیا آپ اجتماعی معاشرتی جدوجہد جسے سیاسی جدوجہد کہتے ہیں، اس

کے حامی ہیں بھی یا نہیں؟ اور کیا آپ "رونی، کپڑا، مکان" کیلئے جدوجہد پر ہی قناعت کریں گے یا اس

کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد بھی کرنا چاہتے ہیں؟

اور اگر آپ ملک میں اسلامی نظام لانا چاہتے ہیں، مثلاً سود ختم کرنا چاہتے ہیں تو ملکی اختیار تک پہنچنے

کیلئے کون سے طریقہ کار سے ڈپٹی ہم آہنگی رکھتے ہیں؟ آپ پیشک اپنے ہم ذہن گروپ سے تعلق رکھیں،

مگر جمعیت علماء کا طریقہ وہ ہے جو آخر میں بیان کیا گیا اور اسے اپنا کام کرنے دیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پارلیمانی نظام کے ذریعے ہدف تک پہنچنا آسان ہے بشرطیکہ اس نظام کو کچھ عرصہ

اطمینان سے چلنے دیا جائے۔ کتنا عرصہ.....؟ میرا خیال ہے اگر غیر جمہوری سازشوں کے وار نہ ہوں تو

صرف تین مکمل جمہوری اور اداری دینی نظام لاگو کرنے کو کافی ہیں۔ کیونکہ اس نظام میں آپ کو پارلیمنٹ کی

300 سیٹوں میں سے ایک ہی سیٹ کافی ہے، بشرطیکہ آپ کا وکیل (ممبر پارلیمنٹ) مولانا فضل الرحمن



جیسا آدمی ہو۔ جو نہ صرف اپنی بات دلیل سے کر سکتا ہو، بلکہ اپنی خوئے دلتوازی سے ممبران پارلیمنٹ کو اپنا گرویدہ بنا چکا ہو اور ممبران اس پہ اعتماد کرتے ہوں۔

کیوں.....؟

اس لئے کہ ممبران پارلیمنٹ چاہے جاہل ہیں یا مفاد پرست، ہیں تو بہر حال مسلمان۔ ان کو اسلامی قوانین سے صرف چار وجہ سے پرابلم ہو سکتا ہے ورنہ کوئی بھی اسلامی قانون منظور ہو جائے، ان کو کوئی ذاتی مسئلہ ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ چار وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

1: کوئی ایسا اسلامی قانون منظور نہ ہو جائے جو ان کو مالی نقصان پہنچائے، جیسے ان سے پچھلے حسابات کی وصولی یا ان کے ماضی پہ پکڑ دھکڑ وغیرہ۔

2: کوئی ایسا اسلامی قانون منظور نہ ہو جائے جو ان کے "دی آئی پی کلچر" کو نقصان دے یا ان کی اولاد کو اسمبلی میں آنے سے محروم کر دے۔

3: کوئی ایسا اسلامی قانون منظور نہ ہو جائے جس کی رو سے وہ خود حکمرانی کرنے کیلئے نا اہل ہو جائیں۔

4: بعض سنجیدہ محب وطن مگر صرف دنیاوی نگاہ رکھنے والے ممبران اسمبلی کو اسلامی قوانین سے اس بنیاد پر اختلاف ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا اسلامی قانون منظور نہ ہو جائے جس سے پاکستان اقوام عالم میں تہارہ جائے ان مندرجہ بالا وجوہات کے علاوہ، پاکستان کے ممبران اسمبلی کو اسلامی قوانین سے کوئی پرابلم نہیں ہے، چاہے آپ پاکستان میں شراب پہ پابندی لگا دیں (وہ باہر جا کر پی لیں گے) یا تراویح کی نماز ہی عوام پہ فرض کریں (وہ رمضان یورپ میں گزار آئیں گے)

اب دینی جمہوری رہنما کو ان وجوہات کا لحاظ رکھتے ہوئے حکمت کیساتھ اپنے کچھ مطالبات کو موخر یا مقدم کر کے "کچھ لو، کچھ دو" کے اصول تحت اپنے نظریے کو لاگو کروانا ہوتا ہے۔ اس ہدف کو سامنے رکھ کر پہلا قدم اٹھ جائے تو رفتہ رفتہ ممبران اسمبلی خود ہی دینی قوانین میں اپنا دنیا و آخرت کا مفاد سمجھ جائیں گے۔

بعینہ جیسے صوفیائے کرام، ایک پکے شرابی کو ایکدم شراب سے نہیں ہٹاتے، بلکہ اس کی توفیق کے مطابق، دین کی آسان باتوں پہ لایا کرتے ہیں اور تا وقتیکہ وہ ماحول سے مانوس نہ ہو، اس کی اس بڑی برائی سے صرف نظر کیا کرتے ہیں۔



## باب چہارم: جمعیت علماء اسلام کی سیاست

دینی دوستوں کو عالم دین، صوفی، مجاہد اور سیاستدان میں فرق سمجھنا چاہئے۔ چاروں کا طریق کار اور مزاج الگ الگ ہوتا ہے۔ اگر آپ ایک کو، دوسرے کے آئینے میں دیکھیں گے تو خود بھی کنفیوز ہو گئے اور قوم کو بھی اسی تذبذب میں ڈالیں گے۔

میں ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک کمرے میں یہ چاروں حضرات بیٹھے ہیں۔ کچھ لوگ کلاشکوف اٹھا کر قتل کرنے چلے آئے۔ عالم دین، ان قاتلوں کو قتل کی وعیدیں سنائے گا، صوفی صاحب شاید اپنے اخلاق اور محبت سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرے، مجاہد تو اپنا گریبان کھول کر لٹکائے گا کہ بے عزتی کی زندگی سے موت اچھی۔ مگر سیاستدان سیاسی داؤ پیچ کرے گا۔ پہلے ان سے یہ کہے گا کہ مال چاہئے تو وہ لے لو، مگر قتل نہ کرو۔ پھر یہ کہے گا کہ فائرنگ کرنے سے تم بچس سکتے ہو، قتل ہی کرنا ہے تو چاقو چھری سے خاموشی سے کرلو۔ غرض، ان کو بندوق سے چاقو تک اور وہاں سے ڈنڈے تک لاکر، قابو میں لائے گا۔ یہ عین منطقی بھی ہے اور دینی بھی۔

مہتمم دارالعلوم دیوبند قاری محمد طیبؒ کے فرمودات کا مفہوم ہے کہ: اسلام کی تین باتیں ہیں۔

1- شریعت 2- طریقت 3- سیاست۔ یہ تینوں اکٹھی ہوں گی تو اسلام کی کامل عمارت بنے گی۔

شریعت: یہ راستہ ہے، راستہ ہی نہ ہو، تو چلو گے کس پر؟

طریقت: یہ راستے پہ چلنے کے اصول سکھاتا ہے، راستہ ہوا اور چلنے کا ڈھنگ نہ آئے تو سفر کیسے کرو گے؟ سیاست: راستے میں جو مشکلات آتی ہیں ان کو دور کرنے کا نام سیاست ہے۔ ظاہری بات ہے کہ آپ ایک راستے پہ چل رہے ہیں، مشکل مرحلہ آ گیا، پھریلی زمین آ گئی، جھاڑیاں آ گئیں۔ تو وہاں ڈنڈا اور ہتھوڑا وغیرہ لینا پڑتا ہے۔ جب آپ یہ استعمال کریں گے تو شور بھی آئے گا۔ اسی لئے سیاست کے میدان میں ذرا شور و غوغا رہتا ہے، یہ تینوں چیزیں ہوں گی تو اعتدال ہوگا۔

اگر صرف شریعت ہے اور طریقت و سیاست معاون نہیں ہیں۔ تو نفس شریعت سے وابستہ ہو جانے والا شخص تنگ نظر ہوا کرتا ہے۔ وہ پھر بند حجرے کا ملاں ہوتا ہے اور دوسری بات ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ اگر صرف طریقت ہو اور طریقت و سیاست معاون نہ ہوں، تو پھر یہ (صوفی نما) لوگ دوسروں کو بند حجروں کی طرف کھینچتے ہیں۔ مریدوں کو بند کمروں میں کھینچنا اور قید کر دینا اسلام کا مزاج ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ رہبانیت ہے۔



اسلام کا مزاج گھروں سے نکل کر محلوں، شہروں، صحراؤں، دریاؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں جا کر انہیں مسخر کرنا ہے۔ ولقد کرمنا بنی آدم وحملناہم فی البر والبحر ورفقناہم من الطیبات وفضلناہم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاً (اور بیشک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور سمندر میں سواری دی اور ان کو پاکیزہ چیزیں عطا کیں اور ہم نے اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت بخشی) (الاسراء: 70)

لہذا صرف طریقت اور پیری مریدی آپ کو رہبانیت کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ اسلام کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح اگر صرف سیاست ہو اور شریعت و طریقت اس کے ہمراہ نہ ہوں، تو پھر تکبر اور نخوت پیدا ہوتی ہے۔ نرے سیاستدانوں کو دیکھ لیں، سب متکبر ہوتے ہیں۔ مزاج میں تکبر آ جاتا ہے۔ اس اصول کی بنیاد پر ہمیں اپنے اندر جامعیت پیدا کرنی ہے۔ لہذا مدرسہ ہو، جماعت ہو، یا خانقاہ ہو، ان میں یکجائی ہوگی تو تحریک مکمل ہوگی۔

پاکستان کی جمعیت علماء اسلام ایک مستقل مزاج سیاسی جماعت ہے جو ہر موسم اور ہر قسم کے حالات میں، پارلیمانی میدان میں موجود رہی ہے۔ میدان سے نہ خود بھاگی ہے اور نہ عوام نے اسے بالکل رد کیا ہے۔ میں ایک چھوٹی سی رپورٹ آپ کے سامنے رکھتا ہوں:

پاکستان کے صحیح طور پر پارلیمانی نظام کی ابتداء 1970ء کے جنرل الیکشن سے ہوتی ہے جس کے بعد 2013ء تک کل دس بار عام انتخابات منعقد ہو چکے ہیں۔ ان میں سے 1985ء کے غیر جماعتی الیکشن کو نکال لیں کیونکہ 1973ء کے آئین کے تحت صرف جماعتی بنیاد پہ ہی الیکشن ہو سکتے تھے، اس بناء پر پاکستان کی کسی جمہوری پارٹی نے اس میں حصہ نہیں لیا تھا، سوائے جماعت اسلامی کے۔

یہاں جماعت اسلامی کے دو غلے کردار کا ایک اور ثبوت سامنے آتا ہے۔ 1973ء کے متفقہ آئین پر جماعت اسلامی نے بھی دستخط کئے تھے، مگر جماعت اسلامی نے جس میثاق پر خود دستخط کئے تھے، اب وزارتوں کو سامنے دیکھ کر خود ہی اس سے پھر گئی تو یہ ناقابل معافی بات ہے۔

بہر حال، آپ 9 عام انتخابات کا خلاصہ دیکھ لیں۔ آپ دیکھیں گے کہ 1970 تا 2013ء کے 45 سال میں، صرف تین پارٹیاں ایسی رہی ہیں جو ہر انتخابات میں حصہ لیتی رہی ہیں۔ یعنی پیپلز پارٹی، جمعیت علماء اسلام اور اے این پی۔ باقی سب پارٹیاں یا تو کم عمر ہیں، یا ختم ہو چکی ہیں۔ مزید تفصیل یوں ہے:

☆..... کوئی سیاسی پارٹیاں ہیں جو ان سب 9 الیکشنز میں قومی اسمبلی میں اپنی نمایندگی رکھتی رہی ہیں؟ جواب ہوگا، صرف دو پارٹیاں یعنی پیپلز پارٹی اور جمعیت علماء اسلام۔



☆..... کوئی سیاسی پارٹیاں ہیں جو باقی 8 الیکشنز میں قومی اسمبلی میں اپنی نمائندگی رکھتی رہی ہیں؟  
آپ ان دو کے ساتھ اب ایک پارٹی یعنی اے این پی کو جوڑ لیں۔ کیونکہ 1993ء میں اے این پی قومی اسمبلی کی کوئی سیٹ نہ جیت سکی۔

☆..... کوئی سیاسی پارٹیاں ہیں جو باقی 17 الیکشنز میں قومی اسمبلی میں اپنی نمائندگی رکھتی رہی ہیں؟  
اب آپ، اس میں نون لیگ اور ایم کیو ایم کو بھی شامل کریں۔ کیونکہ یہ دونوں پارٹیاں 1970 اور 1977 کے الیکشن میں وجود ہی نہ رکھتی تھیں۔

☆..... کوئی سیاسی پارٹیاں ہیں جو باقی 16 الیکشنز میں قومی اسمبلی میں اپنی نمائندگی رکھتی رہی ہیں؟  
اب اس میں آپ جماعت اسلامی کو شامل کریں کیونکہ اس نے 1997 اور 2008 کے انتخابات کا بایکٹ کیا تھا۔

☆..... کوئی سیاسی پارٹیاں ہیں جو صرف 5 الیکشنز میں قومی اسمبلی میں اپنی نمائندگی رکھتی رہی ہیں؟  
اس کا جواب ہوگا، ایک پارٹی یعنی مولانا نوابزئی کی پارٹی جو اب اپنا وجود دکھو بیٹھی ہے۔

اوپر کے جائزے میں جمعیت علماء اسلام اور پیپلز پارٹی پہلے نمبر پہ آئے ہیں۔ 1970ء سے پہلے چلے جائیں تو پیپلز پارٹی بھی منہا ہو جائے گی، کیونکہ اس وقت، اس کا وجود بھی نہیں تھا۔

باقی پارٹیاں جیسے تحریک انصاف، قاف لیگ وغیرہ ہیں۔ تو جب وہ کم از کم تین بار قومی اسمبلی میں اپنی نمائندگی ثابت کریں گی تو ہم ان کو پاکستان کے قابل اعتماد نمائندگان کی فہرست میں شامل کریں گے۔

ہمارے ایک انصافی دوست نے اس پہ تبصرہ کیا کہ جمعیت علماء اور تحریک انصاف کا کیا مقابلہ؟ تمہاری جماعت سو سال سے چھ سیٹوں پہ کھڑی ہے جبکہ تحریک انصاف، پہلی بار میں 35 سیٹیں لے اڑی ("پہلی بار" کہتے وقت وہ عمران خان کی یکمشت آٹھ سیٹوں پہ شکست کو بھول گیا)

مجھے اس کی بات سن کر سبز پگڑی والے دعوت اسلامی کے کارکنان کی ڈھینگ یاد آئی۔ انہوں نے جب پہلی بار ملتان میں اپنا عالمی تبلیغی اجتماع کیا تو واقعی رائے ونڈ والے اجتماع سے زیادہ بڑا مجمع تھا۔ اس پر ایک سبز قدم نے فرمایا کہ رائے ونڈ کی جماعت ستر سال سے اجتماع کر رہی ہے، لیکن ہم نے پہلی بار میں ہی اس کو مات دے دی۔ آج، نہ دعوت اسلامی کا سالانہ اجتماع رہا، نہ ڈھینگیں۔

نواز شریف کو صرف ایک ایجنسی چیف کی سرپرستی حاصل تھی مگر عمران خان کو تو جرنل حمید گل کے علاوہ، جرنل پاشا کی آشیر باد بھی حاصل رہی۔ تو اچانک اتنے زیادہ ووٹ دیکھ کر موصوف آپے میں نہ رہے۔



سرائیکی لوگوں میں جب کسی کم اصل آدمی کے پاس یکدم زیادہ دولت آ جائے اور وہ پرانے شریف انفس لوگوں کو طعنے دیا کرے تو اسے وہ "دیگر دار جا" پکارا کرتے ہیں۔ میں نے کہا: "میرے پیارے! کسی کی انگلی کے سہارے تاریخ میں پہلی اور آخری بار تم کو ایک صوبے کی حکومت ملی ہے، تو تم اس جماعت سے مقابلہ کرنے لگے ہو جس نے دو صوبوں (خیبر پختونخوا، بلوچستان) میں کئی بار حکومت میں رہے اور آج بھی تین صوبوں میں متبادل حکومت اس کے پاس ہے۔

نوٹ کیجئے کہ اپوزیشن پارٹی کو متبادل حکومت کہا جاتا ہے۔ اس وقت خیبر پختونخوا، بلوچستان اور گلگت بلتستان کا اپوزیشن لیڈر جمعیت علماء سے ہے۔

### جمعیت علماء اسلام کی سیاسی پالیسیاں:

جمعیت علماء اسلام کیلئے سب سے مقدم، اپنے نظریات اور اپنی نظریاتی کمیٹی کی حفاظت ہے۔ جب ہر طرف نیکی کا چلن عام ہو، تو سب سے بہتر آدمی کا ساتھ دینا ضروری ہوتا ہے اور جب ہر طرف برائی کا دور دورہ ہو تو پھر کم تر برائی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

انڈیا میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا نعرہ غیر حقیقی ہے، جبکہ وہاں تیزی سے، ہندو تو، یعنی ہندو ازم کے نفاذ کی ریاستی کوششیں ہو رہی ہیں۔ پس وہاں جمعیت سیکولرزم کو سپورٹ کرے گی، تاکہ ریاستی امور کسی خاص گروہ کی فکری مذہبیت مسلط نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ وہاں ان کا جمہوری حق ہے اور وہ جمہوری طریقے سے ہی اپنا موقف کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ Official /

پاکستان میں جمعیت اسلامی قوانین کے نفاذ کا نعرہ لگائے گی کہ یہاں کفر کے نظام کا خدشہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں یہ ان کا جمہوری حق ہے اور وہ جمہوری طریقے سے ہی اپنے موقف کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

جمعیت علماء اسلام کی پالیسیوں پر ناقدین کی طرف سے جو بڑے اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان میں سے کچھ کا تذکرہ مین نے اس کتاب کے پہلے حصہ میں کر چکا ہوں، دیگر چند اعتراضات مندرجہ ذیل ہیں:

- 1: عورت کی حکمرانی
  - 2: طالبان کی حمایت
  - 3: کشمیر کمیٹی کی ناقص کارکردگی
  - 4: خواتین حقوق کی مخالفت
  - 5: پانامہ لیکس پر نواز شریف کا ساتھ دینا
  - 6: لال مسجد سانحہ
  - 7: لیبیا حکومت سے تعلقات
  - 8: وارشٹی قیادت۔ 9 اہل تشیع اور متحدہ مجلس عمل
- ہم نمبر داران موضوعات پہ گفتگو کریں گے۔



## عورت کی حکمرانی:

مولانا فضل الرحمن کی سیاست کی ابتداء 1981ء سے ہوتی ہے جہاں انہوں نے جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے خلاف ایم آر ڈی میں شمولیت اختیار کی، جس میں بے نظیر کی قیادت میں پیپلز پارٹی بھی شریک تھی۔ جمعیت علماء اسلام کا موقف ہے کہ عورت کی حکمرانی شرعاً درست نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ بے نظیر کے ساتھ مل کر جمہوری جدوجہد کر کے گویا اس کی حکمرانی کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ اس پر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مولوی پہلے عورت کی حکمرانی کو ناجائز کہتے تھے، پھر اسی عورت کی حکمرانی میں وائز تیں لے لیں۔ اس کا جواب میں عرض کرتا ہوں، مگر پہلے آپ عورت کی حکمرانی بارے میرا مضمون پڑھ لیں۔

## اداکارہ ایان علی اور فقہ اسلامی:

جائے ماتم ہے کہ اب فقہ اسلامی کو اداکارہ ایان علی کے کیس سے سمجھا جائے مگر یہ کہ نیرنگی دوراں! ماڈل ایان علی کے منی لائڈ رنگ کیس کی جزئیات تو احباب کو ازبر ہوں گی کہ یہ کوئی تبلیغی بیان تھوڑی ہے۔ ہیں جی! مگر مذاکرے (اور نشاط طبع) کیلئے خلاصہ دہرا دیتا ہوں۔

آنسہ ایان علی اسلام آباد ایئر پورٹ پر پاکستان سے اڑنے کیلئے ”بیک“ تول ہی رہی تھیں کہ ان کو ”سکین مشین“ کی نظر لگ گئی۔ بیک سے 6 لاکھ ڈالر کی رش رقم برآمد ہو گئی۔ اس منظر کو کیرے نے اور رقم کی گنتی کو افسران نے محفوظ کر لیا (یعنی ایک دو لاکھ ڈالر کا منطقی اضافہ کر لیا جائے) سول ایوی ایشن کا قانون یہ کہتا ہے کہ کسی مسافر کیلئے 10 ہزار ڈالر سے زیادہ کیش باہر لیجانا جرم ہے۔ اس جرم کی سزا، اگر صرف چند ماہ جیل ہوتی تو محترمہ برائے چند ایام (بہ عشرت تمام) ”اندر“ ہو کر ”باہر“ جاسکتی تھیں۔ قیامت مگر یہ کہ یہ کیش رقم بحق سرکار ضبط ہو جاتی ہے۔ جسے بچانے کیلئے ایک چوٹی کا فارغ البال وکیل کیا گیا جس نے ایسا فقہی نکتہ اٹھایا کہ قانون بنانے والے بھی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

وکیل نے لفظ ”مسافر“ کو پکڑا اور نکتہ اٹھایا کہ ”ٹیکنیکی“ مسافر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس نے بورڈنگ پاس وصول کر لیا ہو۔ چونکہ ایان علی صاحبہ کو ابھی بورڈنگ پاس الیشو ہی نہیں ہوا تو وہ ایئر پورٹ میں داخل ہونے والی ایک عام پاکستانی شہری ہے، نہ کہ مسافر۔ پس اس پہ مسافر کی شق لاگو ہی نہیں ہوتی۔ آپ کو اس وکیل کی شاطرانہ مہارت زہر لگی ہوگی کہ ایک مجرم بچ نکلا، مگر اس خرابی میں خوبی یہ ہوئی کہ قانون مزید واضح ہو کر بہتر ہو گیا۔ دوسرے اسی منطق سے شاید کسی واقعی معصوم مجرم کی جان بخشی بھی ہوئی ہو اب میں اپنے موضوع پہ آتا ہوں:



دیکھئے! شارع علیہ السلام نے اسلامی قوانین دیئے جو کہ احادیث کی صورت میں موجود ہیں، جنہیں محدثین نے رپورٹ کیا ہے۔ ان قوانین کو زمانے اور موقع کے لحاظ سے منطبق کرنا، فقہاء کا کام ہوتا ہے۔ محدثین نے یہ کیا کہ حضور ﷺ کے الفاظ کو من و عن نقل کرنے کی ذمہ داری نبھائی۔ صحیح الفاظ کو رپورٹ کیا۔ راوی کے حافظہ و کردار تک کی چھان پھٹک کی، مگر ان الفاظ کے پردے میں شریعت کی اصل منشا کیا ہے؟ اس کو "فرسٹ آرڈر کور" یعنی صحابہؓ نے سمجھا اور جب تک صحابہؓ کے عمل کی روشنی میں اسے نہ دیکھا جائے تو پھر شریعت تا قیامت عالم انسانیت کی راہبری سے قاصر ہوگی۔

میں اپنی بات کی وضاحت کے لئے صرف دو احادیث بطور دلیل پیش کروں گا۔ ایک پرانے زمانے کی بابت اور ایک نئے دور کی صورتحال کے تناظر میں۔

ایک صحیح حدیث میں ہے، حضور ﷺ ایک صحابی کو نصیحت کرتے ہیں کہ: لڑائی میں نہ بھاگنا، چاہے سب ساتھی مارے جائیں، اگر صرف الفاظ کو دیکھا جائے تو یہ پریشان کن نہیں رہتی۔ حضور ﷺ نے اس صحابی کو کس خاص تناظر میں بات کی؟ اس کو سمجھنا جمہور صحابہؓ کے عمل سے ہی ممکن ہوگا۔

دور صحابہؓ میں ایسی صورت حال پیش آئی کہ سارا لشکر گھیرے میں آگیا اور اگر میدان نہیں چھوڑتے تو بے موت مارا جاتا تھا، جو عقل کے کسی زاویے سے مناسب نہیں۔ چہ جائیکہ اسلام جیسے منطقی مذہب کے نزدیک۔ یہاں ایک طرف حدیث کی صورت قانون موجود ہے (میدان نہ چھوڑو) تو دوسری طرف بظاہر اس کے الٹ صحابہؓ کا طرز عمل (کہ میدان چھوڑ دیا) اب اس کیس کو حل کرنے وکیل صاحب کی طرح فقہاء کی ضرورت پڑتی ہے (اس وقت مجھے اپنے اس تصور سے ہی ہنسی آرہی کہ جب میں لطیف کھوسہ ایڈوکیٹ کو امام ابوحنیفہ سے میٹج کر رہا ہوں)۔

بہر حال فقہاء نے حدیث کے لفظ "بھاگنا" کی تشریح کی جس سے دو اصطلاحات وجود میں آئیں ایک "فرار" اور دوسرے "پسپائی" یعنی اگر کمانڈر کا حکم میدان چھوڑنے کا ہو، تو اس کو پسپائی کہیں گے اور کمانڈر کے حکم کے بغیر سپاہی نے خود ہی میدان چھوڑا تو اسے فرار کہیں گے۔ پہلی صورت کو جنگی حکمت عملی جبکہ دوسری کو جرم کہا جائے گا۔

اس بات سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ قرآن و حدیث کے الفاظ میں تفقہ (غور) نہ کیا جائے تو من و عن الفاظ فالو کرنے سے، آپ دنیا کے ساتھ چلنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔

اب فقہ اسلامی کی دوسری مثال، زمانہ جدید کے ایک اہم ایٹھ کے تناظر میں لیتے ہیں۔ جو ہے "عورت کی حکمرانی" بخاری شریف کی حدیث ہے کہ: "وہ قوم فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنا حکمران، کسی



عورت کو بنالیا، مگر زمانہ جدید میں یہ بات پریکٹیکل نہیں۔

اس بات کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہ عورت ذات کی فطری جذباتیت کی بناء پر اسے فیصلہ سازی کا کلی اختیار دینا، احسن ہے یا نہیں؟ فی الحال، اس حدیث پر فقہاء کا کام دیکھئے:

یادش بخیر! عالم اسلام کے کسی خطے کے مسلمانوں کو پاکستانیوں سے زیادہ یہ حدیث ازبر نہیں ہوگی۔ اس کا سہرا جماعت اسلامی کے سر ہے۔ 1988ء میں ”فرشتوں“ نے بینظیر بھٹو کا راستہ روکنے، اسلامی جمہوری اتحاد کے نام سے بھان متی کا جو کنبہ تشکیل دیا تھا، اس کی پروپیگنڈہ مشینری، جماعت اسلامی کے ہاتھ تھی۔ پس نہ صرف اس حدیث کو پاکستان کے طول و عرض میں پھیلا یا گیا بلکہ بینظیر بھٹو کی کردار کشی کے لئے اس کی آکسفورڈ میں رقص کنائیں تصویروں کو بھی ہیلی کاپٹر سے پھینکوا یا گیا۔

لیکن نہ صرف یہ کہ مسلمانان پاکستان نے اسے بری طرح رد کیا بلکہ چند سال بعد حالات کے جبر کے تحت خود جماعت اسلامی، بنگلہ دیش میں خالدہ ضیا کی حکومت کا حصہ بنی۔ سعودی عرب میں بخاری پرست علماء کی قوت کا عالم یہ ہے کہ آج تک وہاں عورت کو ڈرائیونگ کی اجازت نہیں ملی۔ مگر بدلتی دنیا میں، اقوام عالم میں اپنا امیج بنانے، جب شاہ عبداللہ نے 2009ء میں پہلی بار نورہ الفاز کو وزیر تعلیم بنایا تو سعودی ریالوں کے خوشہ چین، پاکستانی بخاری دانوں کو سکتے کا بخار ہو گیا۔ کہنا یہ ہے کہ آج کی پارلیمانی دنیا میں عورت کی حکمرانی والی حدیث ظاہری الفاظ کی بناء پر قابل عمل نہیں ہو سکتی۔

اب اس موضوع پر بھی حنفی فقہاء برسر کار آئے جو زمانے سے پہلے زمانے کی چال بھانپ لیا کرتے ہیں حنفی فقہانے اس حدیث میں لفظ حکمران ”امیر“ کی تشریح کی۔ حکمران یا امیر کون ہوتا ہے؟ جس کے پاس ”امریا“ حکم کا آخری اختیار ہوگا۔ یہاں سے دو مختلف اصطلاحات وجود میں آئیں۔ ایک حکمران اور دوسرا منتظم۔ ہوا یوں کہ متحدہ ہندوستان میں، بھوپال کی ریاست، امیر ترین مسلم ریاست ہوا کرتی تھی، جس میں اصل وژن، راجہ کی نیک نام و پرہیزگار بیوی بیگم صولت جہاں کا رائج تھا (انہی بیگم نے مکہ مکرمہ میں پہلا دینی علوم کا مدرسہ کھولا، جسے مدرسہ صولتیہ کہا جاتا ہے اور آج تک قائم ہے) راجہ کے انتقال کے بعد اس کا نائب الخ (یا نا سمجھ) بیٹا حکومت کے معاملات کو چلانے کا اہل نہیں تھا، مگر مذکورہ حدیث شریف خود بیگم صاحبہ کی حکمرانی میں رکاوٹ تھی۔ پس اگرچہ امور سلطنت بیگم صاحبہ چلاتی تھیں تاہم قانونی طور پر بیٹے کو حکمران اور ماں کو منتظم یا سینئرز (یا وزیراعظم) قرار دیا گیا۔

جدید جمہوری نظام حکومت، چاہے وہ صدراتی نظام ہو یا پارلیمانی نظام، اس میں قرون اولیٰ جیسے بادشاہوں اور حکمرانوں کا وجود نہیں رہا۔ امریکہ کا صدر بھی ایک حد سے آگے کانگریس کو باقی پاس نہیں



کر سکتا۔ پس آج کے دور میں اگر عورت، صدر یا وزیر اعظم بنے تو حقیقت میں وہ ملک کی کلی صاحب امر نہیں ہوا کرتی۔ اور یوں یہ حدیث، آج کل کی جمہوری حکمرانی کے تناظر میں لاگو نہیں رہتی۔

مگر اس کے باوجود جب پاکستان کی صدارت کے لئے ایوب خان اور محترمہ فاطمہ جناح کا مقابلہ ہوا تو اپوزیشن میں ہونے کے باوجود مفتی محمود نے فاطمہ جناح کا ساتھ دینے کی بجائے اپنا الگ مرد امیدوار نامزد کیا۔ دلچسپ بات یہ کہ محترمہ بے نظیر کی حکمرانی پر شرعی تنقید کرنے والے، جماعت اسلامی کے پروفیسر عبدالغفور صاحب سے جب صحافی نے سوال کیا کہ آپ نے فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی جبکہ وہ بھی عورت تھیں؟ تو پروفیسر صاحب کا جواب تھا کہ: وہ بوڑھی تھیں، یہ جوان ہے۔ خیر، شاید اسی تجربے کے پیش نظر جب مفتی محمود اور بھٹو وغیرہ نے 1973 کا آئین بنایا تو پاکستان کا آئینی سربراہ صدر کا عہدہ رکھا جبکہ منتظم کو وزیر اعظم کہا گیا۔ اب پاکستان کا قانونی حکمران صدر ہوا کرتا ہے، جس کے دستخط کے بغیر اسمبلی کا کوئی قانون نافذ عمل نہیں ہو سکتا اور جسے کئی معاملات میں استثناء حاصل ہے۔

پس عورت چاہے ملک کی وزیر اعظم یا کسی ادارے کی منتظم بن جائے، وہ شرعی طور پر صاحب امر کی حدیث سے باہر ہو جاتی ہے۔

برسبیل تذکرہ، ریکارڈ کی درنگ کیلئے عرض ہے کہ مولانا فضل الرحمن پر یہ تہمت لگا دی گئی ہے کہ انہوں نے پہلے بے نظیر کی حکمرانی کو خدا کا عذاب قرار دیا اور بعد میں اس سے وزارت لے لی۔ مولانا، نہ صرف اس وقت کی متحدہ اپوزیشن یعنی ایم آر ڈی میں پیپلز پارٹی کے اتحادی تھے بلکہ 1988 کے الیکشن میں باہمی مفاہمت کے تحت ڈیرہ میں پیپلز پارٹی نے اور جواہرپاشا اور میں جمعیت نے ایک دوسرے کیلئے سیٹ خالی چھوڑی تھی۔ تو جب بے نظیر سے سیاسی مفاہمت تھی تو اسے عذاب کیونکر کہتے؟ بے نظیر کی حکمرانی بارے، عذاب وغیرہ کے فتوے جماعت اسلامی کی مہم تھی بلکہ اپنے مخالفین کی مذہبی کردار کشی کی بنیاد ہی جماعت اسلامی نے رکھی تھی (مسٹر جناح کو کافر اعظم کہا تھا) یہ بھی خیال رہے کہ جماعت اسلامی کا اپنے ہی کہے سے لائق ظاہر کرنا بھی اس کے کردار کا خاصہ ہے۔

آدم برسر مطلب: فقہائے اسلام جب قرآن و حدیث پہ جرح کرتے ہیں یا تاویلات کرتے ہیں تو دراصل یہ روح شریعت تک پہنچنے کا عمل ہوتا ہے کیونکہ اسلام ہر زمان رہبر ہے۔ اس سلسلے میں تین قسم کے علماء پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ علمائے ظاہر ہیں جو احادیث کے الفاظ کو ہی اصل گردانتے ہیں اور زمانے کی کروٹ کو رد کرتے ہوئے خود تحلیل ہوئے جارہے ہیں۔ دوسرے وہ جدید سکالر ہیں جو احادیث کی عبارات کو جدید زمانے سے ہم آہنگ نہ پا کر احادیث کو ہی رد کرتے چلے جاتے ہیں۔ تیسرے وہ روایتی



حنفی علما ہیں جو جدید زمانے کا ادراک کرتے ہوئے، الفاظ حدیث کی ایسی شرح کرتے ہیں کہ دونوں باتیں ہم آہنگ ہو جائیں۔ پس فقہ اسلامی کے موضوع پر اس مختصر مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ زمانہ جدید کے پرچم مسائل میں قوم کی رہبری وہی سکھ بند اہل بصیرت علماء ہی کر سکتے ہیں جو فقہ اسلامی پر غمق نگاہ رکھتے ہیں۔ جو قدیم اور جدید کی تطبیق کر سکتے ہیں۔ مضمون ختم ہوا۔

اس کے بعد عرض ہے کہ مولانا فضل الرحمن کی جماعت نے کبھی بے نظیر سے وزارتیں نہیں لیں، کیونکہ منشر حکومتی ٹیم کا حصہ ہوتے ہیں جن کا ڈائریکٹ باس وزیر اعظم ہوتا ہے۔ قومی اسمبلی میں حکومتی اور پارلیمانی ارکان پر مشتمل مختلف کمیٹیاں تشکیل دی جاتی ہیں، یہ آئینی کمیٹیاں ہوا کرتی ہیں، ان میں شامل ہونا نہ صرف اپوزیشن کا آئینی حق ہے بلکہ اچھے پارلیمانی نظام میں یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ ایسی کمیٹیوں کو مکمل طور پر حکومتی ارکان کے حوالے نہ ہونے دیں۔ انہی میں سے ایک امور خارجہ کمیٹی بھی ہے جس کا چیئر مین مولانا کو بنایا گیا۔ اس پوزیشن میں وہ وزیر اعظم کے ماتحت نہیں ہوتا، نہ ہی وزیر اعظم اسے ہٹا سکتا ہے۔ یوں ہر کمیٹی کا اصلی باس وزیر اعظم ہی ہوتا ہے، بلکہ پوری قومی اسمبلی کا قائد ایوان، وزیر اعظم ہی ہوتا ہے۔ پس جن لوگوں کو عورت کی قیادت بالکل قبول نہیں تھی تو ان کو بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں کم از کم قومی اسمبلی سے استعفی دے دینا چاہئے تھا کہ ہم عورت کی قیادت کے تحت ایوان میں نہیں بیٹھ سکتے۔

Rights of e-Publications reserved  
by  
Team OFFICIAL JAMIA

### طالبان کی حمایت:

مولانا فضل الرحمن کا کوئی ایک بیان بھی ایسا نہیں کہ وہ طالبان کے نظام حکومت کی تائید کرتے ہوں۔ انہوں نے طالبان حکومت کو ویسے ہی تسلیم کیا تھا جیسا کہ پاکستان، سعودی عرب نے تسلیم کیا تھا اور پاکستان کی دیگر بڑی سیاسی جماعتوں نے تسلیم کیا تھا۔

کہتے ہیں تصویر الفاظ سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ گلبدین حکمت یار اور طالبان کو جس سخت جان دشمن سے سامنا تھا، اس کا نام احمد شاہ مسعود تھا۔ ملا عمر کی تو کوئی تصویر کسی کو میسر نہیں۔ باقی افغان لیڈروں کیساتھ کھینچی گئی تصاویر کو ہمارے بعض مقامی دانشور اپنا زندگی بھر کا اثاثہ بتاتے ہیں (جن مجاہدین کا اثاثہ، وائٹ ہاس میں صدر ریگن کے ساتھ تصاویر ہیں) مولانا فضل الرحمن کی احمد شاہ مسعود کیساتھ زیر نظر تصویر کیا یہ واضح نہیں کرتی کہ پاکستان کا ایک ہی لیڈر تھا جو مختار بفریقین کے ہاں یکساں محترم تھا، اسلئے کہ ہر فریق یہ جانتا تھا کہ یہ آدمی ہمارے متعلق جو بھی پالیسی بنائے گا، وہ اس کا اپنا موقف ہوگا کسی اور کا ایجنڈا نہیں ہوگا۔ رہ گئی افغان جہاد کی بات تو جمعیت علماء اسلام اس جہاد کی بھرپور حمایت کرتی رہی اور اس پہ فخر کرتی



ہے۔ واضح ہو کہ اس جہاد کی حمایت کرنے والے، چاہے وہ خود افغان لوگ ہوں یا پاکستان کی فوج ہو، یا امریکہ کی۔ ہر ایک کا اپنا اپنا ہدف تھا، اپنے مقاصد تھے، اپنے زاویہ نظر سے اس جہاد کی حمایت کرتا تھا اور ہر ایک کا اپنا طریقہ کار تھا۔ ویسے ہی جمعیت علماء اسلام کا اپنا نظریہ اور اپنا طریقہ کار تھا۔ یہ بھی واضح ہو کہ افغان جہاد کے شروع کے ایام میں جب مذکورہ تینوں فریق اور پاکستانی فوج کی ذیلی پارٹیاں جیسے جماعت اسلامی اور مسیح الحق صاحب وغیرہ، سب ایک دوسرے کے ساتھ رابطے میں تھے، تو اس وقت جمعیت علماء اسلام ان سے الگ تھلک رہی۔ ملا عمر کے دور میں جب امریکہ طالبان کا سب سے بڑا مخالف بن کر سامنے آیا تو جمعیت نے بھی امریکہ دشمنی میں، طالبان کی علی الاعلان اخلاقی حمایت کی۔

افغان جہاد بارے لبرلز کے پراپیگنڈے کا جواب میرے مندرجہ ذیل مضمون میں ضرور ملاحظہ فرمائیں:

### مولویوں کا ڈالری جہاد:

کس بے پردہی سے ایک دوست نے جملہ اچھال دیا: "امریکی ڈالروں کی خاطر، مولویوں نے افغان جہاد کے نام پر ہمیں تباہ کر دیا"

دکھ سے میں نے سوچا کہ پاکستان کے دجالی میڈیا نے علماء بارے کتنی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔ گویا اس دنیا میں صرف جی گویا، ناز، تنگ یا نٹن مینڈیا ہی اپنے ضمیر کے مطابق کوئی تحریک چلا سکتے ہیں اور ایسی لوگ بالخصوص علماء کا تو اپنا کوئی موقف ہو ہی نہیں سکتا؟ مزید حیرت یہ ہوئی کہ جہاد افغانستان تو ابھی کل کی بات ہے جس کے معتد بہ کردار ابھی زندہ ہیں۔ تاریخ اسلام کی ہڈیاں میں کذب و افتراء کے مصالحوں پہلے ہی کافی زیادہ تھے۔ مرے کو مارنے شاہ مدار، ابھی کل کے واقعات کو بھی افسانہ بنا دیا گیا۔ خاکسار نئی نسل کو اس بارے کچھ اصولی حقائق سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔

پہلی غلط فہمی تو یہ دور کر لیجئے کہ مولوی، دوسروں کے ہاتھ کھ پتی ہوتے ہیں۔ جعلی مال تو ہر پراڈکٹ میں ہوتا ہے مگر اور بجٹل مولوی ہمیشہ اپنے ضمیر پر فیصلہ کرتا ہے۔ منشور کے فرق کی بناء پر سیاسی پارٹیوں کی طرح مولویوں میں بھی طبقات یا فرقے ہیں۔ پاکستان کے مولویوں کا ایک بڑا طبقہ بریلوی علماء پر مشتمل ہے جنہوں نے اس جہاد میں اس بناء پر حصہ نہیں لیا کہ وہ اسے دوسرے مکتب فکر کی جنگ سمجھتے تھے (جیسا کہ نورانی میاں نے فرمایا تھا) اگر مولوی اپنے فیصلے ڈالر دیکھ کر کرتے ہیں تو کیا بریلوی علماء کو ڈالر کاٹتے تھے؟ اسی طرح، روس کے خلاف، اہل تشیع نے بھی کریم غلیلی کی زیر قیادت مسلح جتھہ ترغیب دیا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ غلیلی، امام خمینی کا متبع تھا جو امریکہ مخالف گردانے جاتے تھے تو ڈالر کہاں ہوئے؟



تیسرا طبقہ الحمدیٹ مولوی ہیں جو اس جہاد کے آخری دور میں منظر عام پر آئے (علامہ احسان الہی ظہیر سے پہلے الحمدیٹ مولوی، سعودی دہائیوں کے ہم عقیدہ ہونے کے باوجود اس سعودی امداد سے محروم تھے جس سے جماعت اسلامی مجتمع ہوتی تھی) لشکر طیبہ (جس کے امیر کی جان کی حفاظت کے لئے جنرل پرویز مشرف مضطرب ہو جاتا ہے) کا اس زمانے میں وجود نہیں تھا۔ کہنے کا مطلب یہ سکہ بند چٹائی نشین علماء چاہے جس فرقے سے ہوں، ان پہ برائے فروخت کا الزام نری تہمت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ "اور" لوگ جو فائلوں کا پیٹ بھرتے تھے، انہیں ڈالروں کا ہوکا رہا ہو۔

افغان جہاد میں عملی حصہ لینے والے یا تو علمائے دیوبند تھے یا جماعت اسلامی۔ میں یہاں، افغان جہاد کے دور میں صرف دیوبندی علماء کے کردار پر روشنی ڈالوں گا، اس لئے ہم جماعت اسلامی کو بوجہ سکہ بند علماء سے الگ کر دیتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ جہاد (قتال) مسلمانوں کا ایسے ہی مذہبی فریضہ ہے جیسے حج وغیرہ۔ یہ فریضہ فرد پر بھی ہے اور ریاست پر بھی۔ مگر ریاست، بین الاقوامی برادری کے معاہدوں کی بھی شرعاً پابند ہے۔ 1979ء میں روس کے افغانستان پر فوجی قبضہ کرنے کے کارن صورتحال یوں تھی کہ ایک مسلمان ملک پر غیر مسلم ملک نے قبضہ کیا تھا۔ یہ ایک شرعی مسئلہ تھا۔ دوسری طرف افغانستان کے حکمران نے خود روس کو دعوت دی تھی تو یہ ایک قانونی مسئلہ بھی تھا۔ کسی مسلم ملک پر، ایک غیر مسلم ملک قبضہ کرے تو ہر مسلمان پر جہاد فرض ہوگا (چاہے اس قبضہ کی سازش میں متعلقہ مسلمان ملک کا حکمران خود بھی شامل ہو) مگر ریاست پاکستان پر بطور ریاست فرض نہیں ہوا تھا کہ مدنی ریاست ابو جندل کے زعموں کے باوجود قریش سے معاہدہ پر کاربند تھی (البتہ ابو جندل کے کسی فردی اقدام کی ذمہ داری نہیں تھی)

مذکورہ صورتحال میں علمائے دیوبند نے افغان جہاد کی حمایت کر کے اپنا فرض منصبی ادا کیا تھا۔ یہاں علمائے دیوبند کی تنظیمی ہیئت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ آج کی متدن دنیا کے روزمرہ امور پر علمائے دیوبند کی کیا رائے ہے؟ اس کے لئے ان کی ایک ہی نمائندہ سیاسی جماعت ہے، جسے جمعیت علماء اسلام کہا جاتا ہے۔ جہاد افغانستان کے دوران علمائے دیوبند کی نمائندہ تنظیم حرکت المجاہدین تھی اور اس کے جرنیل مولوی فضل الرحمان خلیل ابھی حیات ہیں۔ مولویوں پر ڈالروں کی تہمت دھرنے والوں کو خبر ہو کہ مذکورہ کمانڈر خیابان سرسید پنڈی میں ایک اوسط سے گھر میں رہتا ہے، البتہ ان دنوں میں کچھ "غیر مولوی جرنیل" بھی ہوا کرتے تھے، جن کے بچے آج الیکشن الیکشن کھیلتے ہیں، ڈالر ضرور چلے ہوں گے مگر علماء دیوبند میں نہیں۔ اتنی سی بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر علمائے دیوبند، امریکی ڈالروں پہ پک جاتے ہیں تو آج



امریکہ، طالبان کو مذاکرات میں لانے کیلئے ان کی کیوں متیں ترلے کر رہا ہے اور کیوں مولانا فضل الرحمن اس پہ کان نہیں دھرتے؟ سب جانتے ہیں کہ ڈالر خور پالیسی سازوں نے افغان سٹریٹیجی بارے کتنا بڑا "پوٹرن" لیا، مگر کیا علمائے دیوبند نے کسی موڑ پر افغان جہاد کو غلط کہا؟ حالانکہ ان کو "بوٹوں" سے دبانے کی کوشش کی گئی، کئی نمایاں علماء کی ٹارگٹ کلنگ ہوئی، مگر وہ اپنے موقف سے نہ ہٹے۔ یہ بھی ان کے آزاد موقف کی دلیل ہے کہ انہوں نے پاکستان میں خود کش حملوں کو حرام قرار دینے کا از خود فتویٰ دیا جس کی پاداش میں مولانا حسن جان جیسے علماء کو شہید کر دیا گیا۔ یہ بھی خیال رہے کہ لبرل صحافیوں کی اس جج و پکار کے باوجود کہ مولوی پاکستانی طالبان کی نام لے کر مذمت کیوں نہیں کرتے؟ علمائے دیوبند نے "اسٹبلشمنٹ" کے مہیا کردہ ناموں کی مذمت نہ کر کے اپنی روایتی حریت برقرار رکھی۔

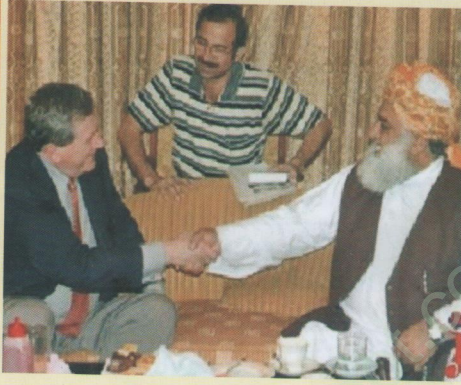
معلوم رہے، افغان جہاد امریکہ نے نہیں شروع کیا تھا البتہ شروع ایام میں ہی ایسا موڑ آ گیا تھا، جب پاک آرمی کو شاید ملک کی خاطر اور امریکہ کو اپنے مفادات کی خاطر اس جنگ میں ڈالر، اسلحہ و تکنیکی امداد دے کر کودنا پڑا۔ جی ہاں، اس موقع پر مجاہدین نے اس امداد کا خیر مقدم کیا اس لئے کہ دشمن کا دشمن، دوست ہی ہوتا ہے۔ چین بھی تو کافر ملک ہے لیکن وہ اپنے مفاد کے تحت جب انڈیا کے مقابل ہماری امداد کرتا ہے تو ہماری "ایمان، یقین، اتحاد" والی فوج اس دوستی کو ہمالیہ سے بلند قرار دیتی ہے۔

بہر حال اس امداد کے دشمن میں دیوبندی تنظیمیں، صرف معسکر کی تکنیکی امداد تک محدود رہیں۔ امریکی صدر ریگن کے ساتھ وائٹ ہاؤس میں مجاہدین لیڈروں کی ملاقات کی ٹوٹو موجود ہیں۔ ان میں کون سا پاکستانی دیوبندی عالم موجود ہے؟ بجا کہ ہر طبقے کی طرح علماء میں کچھ فردی مثالیں ہوں گی جو پک گئے یا جھک گئے یا اپنے فریضے سے غافل رہے۔ مگر علمائے دیوبند، بطور جماعت کبھی نہیں جھکے، نہ پکے۔ ہمارے بعض اداروں کے سرخیل قہقہے لگاتے، دشمن کے سامنے ہتھیار پھینک آئے، مگر علمائے دیوبند کی پہلی صف میں سے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے۔ امریکہ سے تعلق تو دور کی بات ہے، کسی دیوبندی عالم پر اپنی ملکی ایجنسیوں سے تعلق کا بھی شبہ ہو جائے تو جمعیت علمائے اسلام اس سے کنارہ کرتی ہے۔ اس بناء پر جیش محمد، لشکر جھنگوی یا لال مسجد پارٹی کو کبھی دیوبندی نمائندگی حاصل نہیں رہی۔

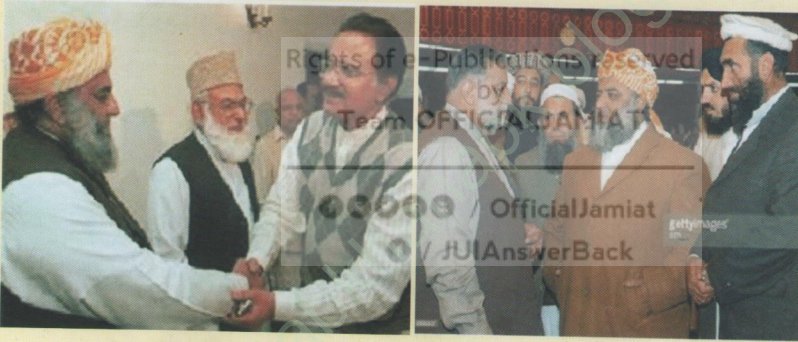
یہ مضمون ابھی تشنہ ہے مگر طوالت کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ عرض یہ کرنا تھی کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علماء دیوبند ڈالر کی چمک یا چھڑی کی لٹک سے متاثر ہو کر فتوے دیتے ہیں، انہیں دیوبندیت کی تاریخ یا مزاج کا پتہ ہی نہیں ہے۔ واضح رہے کہ علماء دیوبند کا سیاسی پلیٹ فارم یعنی جمعیت علمائے اسلام کبھی سعودی یا امریکی خوشہ چین نہیں رہی۔ ان کے لیبا سے تعلقات ضرور تھے مگر اس ایکٹا کا نکتہ، "مذہب" نہیں تھا بلکہ "امریکہ



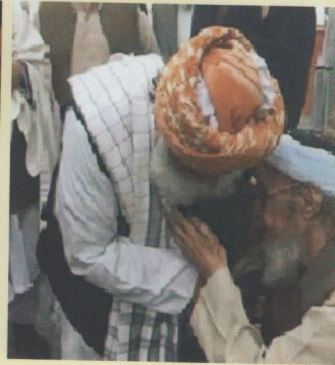
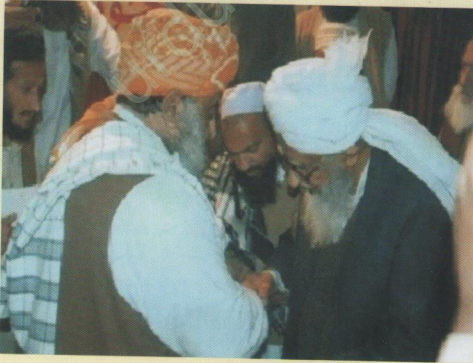
ایک چیز ہوتی ہے باڈی لینگویج  
نوجوان علماء کو چاہیے کہ اپنے اسلاف سے سیکھیں، دنیا دار اور دین دار سے کیسے ملا جلاتا ہے



اخلاق برحق ہیں پر عرب و عجم کے امراء ہوں یا سندھ و بلوچستان کے زعماء کسی کے سامنے سرنگوں نہیں ہونا

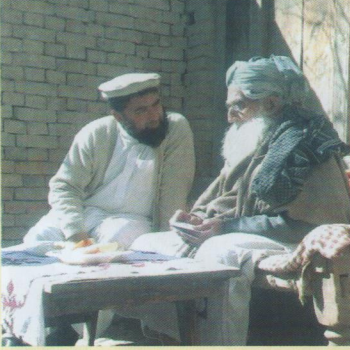


البتہ اللہ والوں کے سامنے کندھے جھکا دینا چاہئیں





## ذاتی واردات و تاثرات



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### قاضی حسین احمد

امیر جماعت اسلامی پاکستان

حوالہ: 2763  
تاریخ: ۱۹.۰۹.۹۷

برادر امیر انجینئر سلیم جاوید صاحب

Rights of e-Publications reserved by  
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

دینی تحریکوں (خصوصاً تحریکی جماعت اور جماعت اسلامی کے ایک دوسرے کے قریب آنے کی خواہش بڑی مبارک ہے، انشاء اللہ ہماری طرف سے اس سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ دینی تحریکیں اگر ایک دوسرے کو حریف سمجھنے کی بجائے حلیف سمجھنے لگیں تو تعاون کے راستے کھلیں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی زیادہ توفیق ملے گی۔

میں نے آپ کا لکھا ہوا کتابچہ پڑھا ہے۔ ہمیں اپنی ترجیحات طے کرنی چاہیں۔ دین کا کام کرنے والوں کے لیے الہامِ بالاہم کے اصول کے مطابق مشترکات کی بنیاد پر مت سے ایسے گروہوں کے ساتھ بھی تعاون کے راستے تلاش کرنے چاہیں جن کے ساتھ کئی امتیازی کرہ ممکن نہیں ہے۔ اس اعلیٰ مقصد کی خاطر آپ بعض باتوں کو ٹائلنڈ چھوڑ دیتے تو بہتر تھا۔

والسلام

خاکسار

سید

(قاضی حسین احمد)

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور 18 فون 24-28 | 7570 | 5419520-24 فیکس 7832194  
E.MAIL : amir @ thr. erum.com. Pk.



دشمنی "تھا (اور وقت نے ثابت کیا کہ قذافی ہی اصل امریکہ دشمن لیڈر تھا) امریکہ تو خیر کیا علمائے دیوبند کو دبائے گا؟ اپنے "کرمفرما" کو بھی اتنی جرات نہیں ہو سکی۔ نکتہ وروں کے لئے عرض ہے کہ علمائے دیوبند کشمیری مزاحمت کو جنگ آزادی کے طور پر سراہنے کے باوجود اسے شرعی جہاد کا درجہ نہیں دیتے اور بڑے "زور آور لوگ" اپنی پوری کوشش کے باوجود بھی ان سے یہ فتویٰ حاصل نہیں کر سکے۔

آدم برسر مطلب: کم از کم دیوبندی مولویوں نے افغان جہاد خدا کے سوا کسی کی خاطر نہیں کیا۔ رہا یہ سوال کہ ہم کو تباہ کس نے کیا؟ تو وہ بھی مولوی نہیں کوئی "اور" تھے۔ پہلے بھی ایسا وقت آیا تھا کہ مسلمان حکمرانوں کی بد اعمالیوں کے طفیل، مرہٹے آپ کو نیست و نابود کر نیوالے تھے تو مولوی شاہ ولی اللہؒ نے اپنے مرید احمد شاہ ابدالی کو بلا کر آپ کو بچایا اور جب آپ کا تخت بچ گیا تو وہ مولوی دوبارہ اپنے حجرے میں تفسیر لکھنے بیٹھ گیا جبکہ آپ کے درباری شاعر اپنے اشعار میں مولوی پر جگت بازی کر کے داد وصول کرتے رہے "امت" کی محبت میں ہم آشفہ سروس نے وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

مضمون ختم ہوا۔

جہاں تک ایسی باتوں کا تعلق ہے کہ نصیر اللہ بابر نے مولانا فضل الرحمن کے ذریعے طالبان کے ٹینکوں کو ڈیزل سپلائی کی، تو بھائی اس بات کو ابھی تک کسی نے ثابت کیا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی حوالہ ہے۔ اور اگر ایسا ہے بھی تو ہمارے لئے یہ معیوب نہیں بلکہ مستحسن بات ہے۔ ایک جمہوری جماعت نے اگر کسی دوسرے ملک میں اپنے ہم نظریہ لوگوں کو اخلاقی یا مالی مدد دی ہو تو یہ معیوب نہیں۔ معیوب یہ ہے کہ کسی جمہوری پارٹی کا ایک حصہ الذوق فقار جیسی تنظیم بنا کر اپنے ملک کا طیارہ ہائی جیک کر لے، یا کسی جمہوری پارٹی کے کارکن سپریم کورٹ پر حملہ کر دیں یا کسی جمہوری پارٹی کا لیڈر "ایمپائر" کو پارلیمنٹ پہ دھاوا دینے کی دعوت دے۔

**سانحہ لال مسجد:** جولائی 2007ء میں پاک آرمی نے لال مسجد پہ چڑھائی کر دی۔ لال

مسجد، اسلام آباد میں مشہور مقام "آپارہ" کے پڑوس میں واقع ہے۔ بعد میں اس کے ساتھ ملحقہ، بیچوں کا مدرسہ جامعہ حصہ کے نام سے بنایا گیا جو کہ حکومتی زمین پر غیر قانونی طور پر بنایا گیا تھا مگر بوجہ اس سے صرف نظر کیا جاتا رہا۔ اس کے بانی خطیب مولانا عبداللہ تھے جو کہ دیوبندی عالم دین تھے۔ ان کا مدرسہ، مجاہدین اور سپاہ صحابہ کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔

ان کی شہادت کے بعد ان کے بڑے بیٹے مولوی عبدالعزیز خطیب بنے جبکہ چھوٹے بیٹے وفاق میں



گریڈ اٹھارہ کے افسر تھے۔ پرویز مشرف دور میں اسلام آباد کی ان 11 مساجد کو جن کی تعمیر غیر قانونی زمین پر ہوئی تھی، حکومت نے نوٹس ارسال کئے۔ پہلی مسجد (امیر حمزہ مسجد) کو نوٹس کے ساتھ تحریک تحفظ مساجد نمودار ہوئی جو رفتہ رفتہ، تحریک نفاذ شریعت میں تبدیل ہو گئی۔ 6 ماہ تک دارالحکومت میں یہ تماشا لگا رہا کہ مدرسہ کی سینکڑوں طالبات، لاوڈ سپیکر اٹھائے، باہر آ کر جلوس نکالتیں۔ پولیس والے محبوس کئے گئے، بچوں کی لائبریری پہ قبضہ کیا گیا۔ چینی لڑکیوں کے مساجد سینٹر سے لڑکیاں اٹھا کر مدرسہ لائی گئیں، غرض ہر وہ کام کیا گیا جس سے مولویوں کی بجلی ہو سکے اور اتمام اس کا یہ ہوا کہ مولانا عبدالعزیز کو برقعے میں گرفتار کر کے میڈیا پہ پیش کیا گیا۔

اس دوران علمائے دیوبند اپنے تئیں، مولوی عبدالعزیز کو سمجھاتے رہے لیکن مولوی صاحب نے اپنے شیخ مولانا مفتی تقی عثمانی کی بھی سن کر نہ دی۔ امام کعبہ کو بلوایا گیا مگر مولوی صاحب تو کسی خاص ایجنڈے پر تھے۔ الغرض یکا یک اور بغیر کسی کی توقع کے لال مسجد پہ فوجی آپریشن کیا گیا جس میں مولانا عبدالعزیز فرار ہوتے پکڑے گئے مگر اس کا چھوٹا بھائی شہید ہو گیا۔ یہ سارا معاملہ عجیب پر اسراریت میں الجھا ہوا ہے۔ مثلاً کہا گیا کہ 2 ہزار بچیاں زندہ جلا دی گئیں۔ آج تک ان کے وارث سامنے نہیں آ سکے۔ کہا گیا کہ ان کو زندہ نکال لیا گیا تھا۔ اس صورت میں بھی ان کا کوئی سراغ نہیں۔ کہا گیا لال مسجد میں دہشت گرد موجود تھے جن کو مار کر بھاری اسلحہ برآمد کیا گیا، ان دہشت گردوں کی بھی کوئی لاش یا شناخت نہیں۔ جو اسلحہ میڈیا کو دکھایا گیا وہ نیا کورا اسلحہ تھا جس پہ اتنی بھاری فائرنگ کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

لال مسجد کے احتجاجی مظاہروں میں ایک سفید ریش بزرگ، خالد خواجہ، پولیس کی لاٹھیاں کھاتے ٹی وی پہ دیکھے جاسکتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کرنل امام کی طرح وہ بھی ایجنسیوں کے ملازم تھے۔ مولوی عبدالعزیز فرار ہوتے برقعہ میں پکڑے گئے۔

اس ابہام سے بعض افواہوں کو تقویت ملتی ہے۔ مثلاً لال مسجد کے زیر زمین راستے آپہارہ جاتے تھے جس کے ذریعے اچھے طالبان سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ مولوی عبدالعزیز کو جس طرح حفاظت میں رکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی "ملازم" تھے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پرویز مشرف کا اصل منصوبہ بہت گھٹاؤ تھا، یہ کئی انگلیاں، جلتے دوپٹے والے مرہے اسلحہ میڈیا پر عام کر دائے گئے کہ مدرسوں کے طلباء مشتعل ہو کر سرخوں پر توڑ پھوڑ کریں اور ایک بڑی خونریزی کے بعد سارے اسلامی مدارس پر پابندی لگا دی جائے۔



جو کچھ بھی ہو، مولانا فضل الرحمن نہ صرف اس سارے قضیے کا تانا بانا سمجھ رہے تھے بلکہ شروع دن سے حکومت سے پوچھتے رہے کہ ایک مسجد کے چھوٹے سے معاملے کو جسے ایک تھانیدار ہینڈل کر سکتا ہے، آخر کن مقاصد کے تحت طول دیا جا رہا ہے؟ لیکن آج مولانا فضل الرحمن سے سوال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مولوی عبدالعزیز کا ساتھ کیوں نہ دیا؟ حالانکہ سوال تو یہ بنتا ہے مولانا فضل الرحمن لال مسجد والوں کی حمایت کیوں کرتا؟۔ عجیب بات ہے، یعنی مولانا سے پوچھا جا رہا ہے کہ مولوی عبدالعزیز کی بات کیوں نہیں مانی؟ حالانکہ سوال مولوی عبدالعزیز سے ہونا چاہئے تھا کہ اس نے مولانا سمیت اپنے مرشدین کی بات کیوں نہیں مانی؟ اور یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس سانحہ کے بعد مولانا فضل الرحمن نے ہی ان کے حالات سنبھالے۔ واپس جامعہ فریدیہ اور لال مسجد فعال ہوئی اور مولانا عبدالعزیز کے بھانجے کو ہی خطیب بنایا گیا جو مولانا کی اندر خانہ کاوشوں کے معترف ہیں۔

اس سب کے باوجود عین ان دنوں جب لال مسجد کے غم کو کیش کرنے جماعت اسلامی نے اظہار یکجہتی کیلئے لال مسجد کے باہر مظاہروں کا پروگرام بنایا، مولانا فضل الرحمن بھاگت دہل لال مسجد والوں کی سڑک چلی کو غلط کہتے رہے اور کسی وقتی مصلحت کی خاطر اپنے موقف کو نہیں چھپایا۔

### پانامہ لیکس سکیئنڈل پر نواز شریف کا ساتھ دینا:

پانامہ لیکس کا سکیئنڈل سامنے آیا۔ جس میں پاکستان کے چند سیاستدانوں کے نام بھی آئے، جس میں نون لیگ، پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف کے لوگوں کے نام شامل تھے۔ مگر ایم کیو ایم اور دینی سیاسی جماعتوں کے کسی بندے کا نام اس میں نہیں آیا۔ چونکہ نواز شریف کے بچوں کا نام اس میں آیا تھا تو اپوزیشن نے بالواسطہ طور پر، نواز شریف کو اس میں ملوث قرار دے کر وزیراعظم سے استعفیٰ کا مطالبہ کر دیا۔ مولانا فضل الرحمن نے وزیراعظم کی حمایت کا فیصلہ کیا۔

اب یہاں جذبات سے ہٹ کر میں اپنے دوستوں سے پوچھتا ہوں کہ میں آخر مولانا کی سیاسی بصیرت پر اعتماد کیوں نہ کروں؟ پانامہ لیکس کی وہ پہلی شام یاد کیجئے اس میں سوائے نواز شریف کے کسی کا نام نہیں آیا تھا۔ ترین، علیم کا نام تو چھوڑیں، مریم نواز کا نام بھی نہیں تھا۔ اس پہلے دھماکے کی شام ہی مولانا نے 4 باتیں کہی تھیں اور کتنی جلدی وقت نے سچ ثابت کر دیں۔

میں ان کو دہراتا ہوں اور ساتھ ہی ایک مختصر تبصرہ بھی عرض کرتا ہوں۔

1: مولانا نے کہا تھا کہ ہم پانامہ لیکس کو پاکستان کے خلاف عالمی سازش سمجھتے ہیں اور اس طوفان سے



کچھ نہیں ہوگا۔ جبکہ میڈیا اور سیاسی قیادت پیشین گوئیاں کر رہی تھی کہ پانامہ لیکس کے بعد، نواز شریف ایک ہفتہ کے اندر جیل میں ہوگا۔

اب مذکورہ بیان میں پہلی بات کو فی الحال چھوڑ دیں کہ وقت مزید ثابت کرے گا مگر دوسری پیش گوئی تو اب تک کافی حد تک سب کو نظر آگئی ہے کہ کچھ نہیں ہونے لگا (اگرچہ مجھے بھی دکھ ہے کہ چوروں کا حقیقی احتساب کب ہوگا؟)

2: مولانا نے کہا تھا کہ ہم پانامہ لیکس کے معاملے پر عدالتی فیصلہ آنے سے قبل میاں نواز شریف کے ساتھ ہیں۔ جبکہ عمران خان اور میڈیا کہہ رہے تھے کہ آف شور کمپنی بنانے والے چور ہوتے ہیں اور مولانا چور کا ساتھ دے رہا ہے۔ اب اتنے دنوں بعد جبکہ ہر پارٹی کے چور ظاہر ہو گئے ہیں تو یار لوگوں نے موقف بدل لیا کہ آف شور کمپنی کا ہونا چوری نہیں، بلکہ ذرائع آمدن کا پتہ چلنا چاہئے۔ تو جناب پہلے موقف کے لحاظ سے اگر آف شور کمپنی کا مالک ہونا چوری تھا، تو مولانا بھی ایک چور کے ساتھ تھا اور باقی سب بھی چور ہی اکٹھے تھے تو فرق کیا ہوا؟ اور اگر دوسرے موقف کے لحاظ سے آف شور کمپنی بنانا چوری نہیں تو ظاہر ہے کہ پھر مولانا چور کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ گئی ذرائع آمدنی کی تحقیق تو اس کے لئے کس نے منع کیا ہے؟

3: مولانا نے کہا تھا کہ جن لوگوں کا پیسہ باہر بڑا ہے، اگر وہ جائز بھی ہے تو ملک کے اندر لگنا چاہئے تھا۔ صاف ظاہر کہ یہ بات مولانا نے اس وقت اپنے اتحادی، یعنی صرف نواز شریف کے لئے کہی تھی کیونکہ اس وقت صرف اسی کا نام اچھالا جا رہا تھا۔ کیا یہی جرات عمران خان بھی اپنے ان دوستوں کے متعلق کر سکتا ہے جن کی آف شور کمپنیاں ظاہر ہو گئی ہیں کہ اگر تمہارا پیسہ جائز بھی ہے تو اسی ملک میں کیوں نہیں لگایا؟ وہ تو صرف نواز شریف کا ہی نام لیتا ہے، انصاف کہاں گیا؟

4: مولانا نے کہا تھا کہ پاکستان کے عوام کو پانامہ لیکس سے سبق لینا چاہئے کہ کسی مذہبی شخصیت کا نام ایسے سکینڈلز میں نہیں آتا تو وہ کن لوگوں کو ووٹ دیا کرتے ہیں؟

اس پر میں یہ کہتا ہوں کہ پانامہ لیکس تو کسی غیر ملکی صحافی نے لیک کی تھی جس میں مولانا صاحبان کا نام نہیں۔ اب تو اپنے ملکی صحافی، روف کلاسرا نے دی لیکس بھی کر دی ہیں جس کے مطابق اسٹیٹ ڈار، علیمہ خان وغیرہ کی غیر ڈیکلیر شدہ پراپرٹی دی میں ہے جبکہ یہاں بھی مولانا یا اس کے قریبی کا نام نہیں تو میں کیوں اس کو ووٹ نہ دوں اور دوسری پارٹیوں کو دوں؟

یہ جو باتیں میں نے اوپر لکھی ہیں، یہ تو آج ہر دانشور یا غیر دانشور کر سکتا ہے لیکن اس پہلی شام جب



طوفان آیا تھا، حالات کی اتنی مضبوط پیشگوئی صرف سیاسی بصیرت سے ہی ممکن تھی۔  
میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ نواز شریف نے کوئی چوری نہیں کی ہوگی۔ حکومت اور اپوزیشن دونوں میں چور ہیں۔ پانامہ لیکس میں دینی جماعتوں کی قیادت کا کا نام نہیں ہے، باقی سب ملوث ہیں۔ پس اس ڈرامہ بازی کو میں چور چائے شور والی بات سمجھتا ہوں۔

### چور چائے شور:

میں نے حکومت سے کہا "اپوزیشن آپ کو چور کہتی ہے اور اس کے پاس ثبوت موجود ہیں" حکومت نے قہقہہ لگایا "اگر ان کے پاس ثبوت موجود ہیں تو سپریم کورٹ میں پیش کریں، نیب کو دیں، کم از کم اس ایم آر کو ہی مہیا کر دیں جس کی انگلی پہ اعتبار تھا۔ ہم نہیں، یہ خود چور ہیں" بات تو درست لگتی تھی۔

میں نے اپوزیشن سے کہا "حکومت آپ کو چور کہتی ہے اور اس کے پاس ثبوت موجود ہیں" اپوزیشن نے قہقہہ لگایا "اگر ان کے پاس ثبوت ہیں تو ہم کو پکڑ لے کیوں نہیں؟ حکومت کا کام ہے چور پکڑنا۔ ایف بی آر سے کہیں پولیس کے پاس ایف آئی آر درج کرائیں۔ ہم نہیں یہ خود چور ہیں" بات تو یہ بھی درست لگتی تھی۔

میں نے پریشان ہو کر، باباجی سے پوچھا "حکومت، اپوزیشن کے چوروں کو کیوں نہیں پکڑتی؟" کہنے لگے "اسلئے کہ اپوزیشن کے پاس حکومتی چوروں کی فائلیں ہیں، پھر وہ بھی پکڑے جائیں گے" میں نے کہا "اپوزیشن والے، حکومت کے خلاف ثبوت عدالت کیوں نہیں لے جاتے؟" کہا: "اسلئے کہ حکومت کے پاس اپوزیشن کی چوری کی فائلیں موجود ہیں پھر وہ بھی پکڑے جائیں گے" میں نے کہا: "پھر ایک دوسرے کو گالیاں کیوں دیتے ہیں؟"

باباجی نے قہقہہ لگایا "گالیاں تو وہ تم لوگوں کو مصروف رکھنے کی خاطر دیتے ہیں تاکہ تمہاری توجہ تیسری طرف نہ جانے پائے۔ خود سوچو اگر دلیل اور ثبوت کی بنیاد پر سیاست ہونے لگی تو یہ دونوں مٹ جائیں گے اور پھر وہ طبقہ اوپر آئے گا جس کا نہ پانامہ لیکس میں نام ہے، نہ دہی کے فلیٹوں میں۔ تو میاں، اپنا بزنس کون خراب کرتا ہے؟"

مولانا فضل الرحمن نے پانامہ لیکس کے معاملے پر نواز شریف کا ساتھ کسی وجہ سے دیا ہے۔

ایک دوست نے فرمایا "نواز شریف ایک کینسر ہے جس سے ملک کو نجات دلانا ضروری ہے۔"



عرض کیا "کینسر کا علاج ضروری ہے مگر کسی پرانے سیانے سے مشورہ بھی کر لیجئے گا۔ کہیں سائیڈ ایفیکٹ میں "ایڈز" زندگ جائے"

اگر لوگ یہ کہیں کہ مولانا فضل الرحمن نے نواز شریف کی حمایت کے پیسے لیے ہوں گے تو یہ ان کا قصور نہیں۔ لوگوں نے ملکی سیاست میں آج تک ایسے ہی کردار نمایاں دیکھے ہیں اور نون لیگ کی وجہ شہرت ہی پیسے کا استعمال ہے۔ پس عوام کا ذہن یہ قبولے کو تیار ہی نہیں کہ کوئی سیاستدان، خاص طور پر کوئی مولوی پیسے کے بغیر بھی کوئی پالیسی ترتیب دے سکتا ہے۔ میں نے اس پہ ایک مضمون لکھا تھا، پڑھ لیجئے۔

رقم بڑھاؤ نواز شریف، ہم تمہارے ساتھ ہیں:

مولانا فضل الرحمن کی ذات پہ چسپاں کر کے مذکورہ فقرہ اچھالا گیا ہے۔ چونکہ سب لوگ متعصب یا چھپھورے نہیں ہوتے پس منصف مزاج مگر بے خبر لوگوں کے سامنے تصویر کا اصل رخ لانا بھی ایک شرعی فریضہ ہے۔ تاہم اپنے موضوع پر آنے سے قبل، ایک چھوٹا سا واقعہ آپ کے گوش گزار کرتا ہوں:

خاکسار، سعودی سول ایشن میں بطور سینئر انجینئر خدمات سرانجام دیتا ہے اور اسی ضمن میں گاہے گاہے، سعودی عرب کی 26 ایئر پورٹس پہ آ جانا لگا رہتا ہے۔ 2008ء کے الیکشن ہوئے کچھ روز ہو چکے تھے اور پیپلز پارٹی کی حکومت بن رہی تھی۔ جدہ کے الفرسان لاؤنج میں جناب اسٹیڈی ڈار صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ موصوف مدینہ منورہ جا رہے تھے اور میرا بھی وہیں کا دورہ تھا۔ اتفاق سے جہاز کی بزنس کلاس میں بھی خاکسار کو ان کے پہلو میں سیٹ ملی تو بات چیت چلتی رہی۔ ظاہر ہے کہ سیاست ہی موضوع گفتگو تھا۔

(یہ تفصیلات میں نے ڈار صاحب کی یادداشت تازہ کرنے کیلئے لکھی ہیں)

باتوں باتوں میں، میں نے ان سے مولانا فضل الرحمن کے بارے میں رائے لی۔

پٹ سے جواب دیا "وہ تو بکاؤ مال ہے۔"

عرض کیا "پھر آپ لوگ اسے خرید کیوں نہیں لیتے؟"

"ایسے کام ہم نہیں کیا کرتے۔ نون لیگ نے ہمیشہ اصولوں کی سیاست کی ہے"

میں نے کہا "ڈار صاحب، بے نظیر کے خلاف تحریک عدم اعتماد کے دنوں میں ہارس ٹریڈنگ مشہور ہوئی تھی، ان دنوں پیپلز پارٹی کے ارکان کو سوات میں اور آئی جے آئی والوں کو چھانگا مانگا بند رکھا گیا تھا۔ یہ خبر بھی عام تھی کہ ہر رکن اسمبلی کو 20 لاکھ روپے دئے گئے ہیں، وہ کیا چکر تھا؟"

کہنے لگے: "وہ پیسہ پیپلز پارٹی والوں نے چلایا تھا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، انسان کمزور ہے اور لالچ



میں آجاتا ہے۔ پس ہم نے صرف حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے ارکان کو مہمان بنایا ہوا تھا“  
عرض کیا ”ان دنوں صرف دو پارٹیوں کے ارکان ہی کھلے بندوں پھر رہے تھے۔ مولانا کے ارکان بھی آزاد پھر رہے تھے۔“

”ہاں، ہم نے ان کو لفٹ نہیں کرائی تھی“  
”آپ نے پیسہ نہیں دیا لیکن وہ تحریک عدم اعتماد میں آپ کے ساتھ کھڑے تھے۔ تو پھر پیپلز پارٹی نے کیوں نہیں خرید لیا؟“

”یہ گہری سیاسی باتیں ہیں، آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“  
اسحق ڈار صاحب سے بہت لمبی گفتگو نہ ہو سکی۔ ایک توجہ دہ سے مدینہ ویسے ہی 35 منٹ کی فلائٹ ہے دوسرے، وہ اپنے سینہ میں کسی پرانے عارضے کی وجہ سے ریشہ کرنے سے تنگ بیٹھے تھے۔ لیکن اس مختصر نشست سے یہ ہوا کہ نون لیگ کیلئے میری ناپسندیدگی پہلے سے بڑھ گئی۔  
(خاندانی اور مصنوعی لیڈروں کی وضع داری کا فرق بھی نوٹ کیجئے گا۔ میں نے اس لئے نام لے کر تذکرہ کیا ہے کہ موصوف تو معقول لوگوں میں گئے جاتے ہیں)

عرض یہ ہے کہ اکثر لوگوں نے مولانا فضل الرحمن کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ ورنہ میرے خیال میں یہ شاید واحد سیاستدان ہے جسے خریدنا جھکا یا نہیں جاسکتا۔

ابھی کل ہی کی بات ہے پشاور آرمی اسکول کے حادثے کے بعد آرمی کے تیور سخت بگڑ چکے تھے۔ ملٹری کورٹس کے قیام کے لئے آئین میں 21 ویں ترمیم یوں منظور کرائی گئی کہ رضاربانی صاحب رو بھی رہے ہیں اور قرارداد بھی پیش کر رہے ہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ ڈنڈے کی طاقت تھی کہ پاکستان بھر کی سیاسی پارٹیوں نے صرف ایک ماہ میں اس پر دستخط کر دئے، سوائے مولانا کے، جس نے آج تک اس سے اتفاق نہیں کیا اور بنگا دہل اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ مولانا، مرعوب ہونے والا آدمی نہیں ہے۔

یہ تو ملٹری کی بات ہوئی۔ سول حکومت کی بھی سن لیں۔ پنجاب اسمبلی نے تحفظ نسواں بل پیش کیا۔ اگرچہ وہاں مولانا کی نمائندگی نہیں اور اگرچہ ہم مولانا کے موقف سے کچھ اختلاف بھی کرتے ہیں لیکن آپ مولانا کا رویہ ملاحظہ فرمائیں جس نے واشگاف الفاظ میں نون لیگ کو دھمکی دی کہ حکومت گرانے کیلئے مشکل نہیں ہے۔ اگر مولانا پک جایا کرتا ہے تو خریدنے والے، اب تک منت سماجت کیوں کر رہے ہیں؟

لوگ کہتے ہیں کہ مولانا ہر حکومت میں شامل ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ الزام سرے سے ہی غلط ہے لیکن آپ سے میرا سوال یہ بھی ہے آخر کیوں ہر حکومت میں شامل نہ ہوا جائے؟ کیا عوام اپنا نمائندہ اس لئے منتخب



کرتے ہیں کہ وہ اسمبلی میں جاتے ہی اکھاڑہ لگا دے یا وہ اپنے مسائل کے حل کیلئے اسے منتخب کرتے ہیں؟ اور اس کے لئے منطقی صورت یہی ہے کہ وہ ہر حکومت بنانے والی پارٹی کو اپنی شرائط پیش کرے اور حکومت میں ضرور شامل ہو اور پھر حکومت کو ایقائے عہد کے لئے مناسب وقت بھی فراہم کرے۔ ہاں اگر حکومت وعدہ ایفاء نہیں کرتی تو راستہ الگ کر لے۔ مگر اسمبلی میں جاتے ہی بلاوجہ اپوزیشن میں بیٹھ جانا تو اپنے حلقے کے عوام کے ساتھ صریح زیادتی ہے۔

بہر حال مولانا کے متعلق درست جملہ یوں ہو سکتا ہے کہ مولانا ہر اس جمہوری حکومت کے ساتھ اتحادی رہا ہے جو اپنے موقف میں آزاد ہو اور اسٹیبلشمنٹ کی ڈکٹیشن پر نہ چلے۔ پاکستان میں گذشتہ 40 سال کی 2 ملٹری اور 5 سول حکومتوں کے ساتھ مولانا کا رویہ تاریخی دستاویز ہے۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مولانا نے کبھی چور دروازے سے اقتدار میں آنے کی کوشش نہیں کی۔

خیر، یہ ایک الگ موضوع ہے۔

فی الحال اسی الزام کو درست مان لیتے ہیں کہ مولانا ہر حکومت کے ساتھ شامل ہوتا ہے اور پیسے کے لئے شامل ہوتا ہے تو پھر نواز شریف کا ساتھ دینے کیلئے مولانا کو بھلا کیوں بے چینی ہو؟ جب نواز شریف جائے گا تو جو بھی آئے گا، بقول آپ کے مولانا کی حکومت تو پھر بھی ہوگی۔ تو اس کو اتنے تردد کی ضرورت کیا ہے؟ عقل کی بات تو یہ ہے کہ اسے اگر حکومت سے رقم درکار ہوا کرتی ہے تو مولانا یہ کوشش کرتا کہ نواز شریف جلدی چلا جائے تاکہ نئی حکومت آئے اور نئے ریٹ ملے ہوں۔ بغض، عقل کو مار دیتی ہے۔

ورنہ اگر وہ رقم لیکر کندھا فراہم کیا کرتا ہے تو وہ لوگ اس کو رقم دے کر کیوں نہیں خرید لیتے جنہوں نے دھرنے تماشوں پہ اربوں روپے لٹا دئے؟ حالانکہ دھرنے والے بیچارے تو شیخ رشید جیسوں کو ساتھ رکھنے کے لئے بھی مرے جاتے ہیں۔ مولانا کو خریدنے میں ان کا بھی فائدہ تھا اور مولانا کا بھی، کہ وہاں تو رقم بھی ملتی اور "چند روزہ" عزت بھی ملتی۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مولانا نے نواز شریف کا ساتھ اس لئے دے رکھا ہے کہ عمران خان کی حکومت آگئی تو مولانا کو کوئی ذاتی نقصان کا اندیشہ ہے، تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ عمران خان کی حکومت، مولانا کا بال تک بیکا نہیں کر سکتی۔ خیبر پختونخوا کی مثال سامنے ہے۔

میں اپنے علاقے سے تحریک انصاف کے دو ارکان کے اخباری بیانات کا حوالہ دوں گا جس میں جہان معنی پوشیدہ ہے۔ ایک ٹانک سے ایم این اے داؤد کنڈی ہے جس نے پریس کانفرنس کی کہ پرویز خٹک، مولانا لطف الرحمن سے پوچھ کر پی ٹی آئی کے کلٹ بانٹا ہے، ہم سے تو وہ ملتا ہی نہیں۔ دوسرا رکن علی امین



خان گندہ پور ہے، جو کہتا ہے کہ معلوم نہیں صوبہ میں ہماری حکومت ہے یا مولانا کی؟ مولانا کے بغض میں کوئلہ ہونے والوں کو معلوم ہو کہ ملٹری حکومت ہو یا سول حکومت، مولانا ان کا محتاج نہیں بلکہ وہ مولانا کا محتاج ہیں۔ اور یہ طاقت، مولانا نے اپنی اخلاقی قوت سے بنا رکھی ہے۔ دیکھئے! ایم کیو ایم ایک سیاسی جماعت جس کے قبضے میں صرف کراچی شہر ہے تو 30 سال سے سول و ملٹری حکومتیں اس کے خڑے اٹھاتی رہی ہیں۔ جبکہ جمعیت علماء اسلام جس کے پاس 40 سال سے پاکستان کا سب سے بڑا، سودمند اور حساس ترین صوبہ ہے، یعنی بلوچستان۔ تو کیا وہ جماعت کوئی وقعت نہیں رکھتی؟ بلکہ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ آج بلوچستان میں اگر وفاق کا پرچم لہرا رہا ہے تو اس میں جمعیت علماء اسلام کا سب سے زیادہ کردار ہے۔

رہا سوال حکومت میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا۔ تو مولانا خیر پختونخوا کے علاوہ بلوچستان میں بھی اپوزیشن میں ہے۔ یہاں تو چلو عمران خان ہے، لیکن وہاں اسے کیا تکلیف ہے؟ اگر اس کو حکومتوں میں شامل ہونے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہاں وہ کیوں حکومت میں شامل نہیں ہوا؟ تو بھائی حکومت یا اپوزیشن کا ساتھ دینے کیلئے مولانا کے کچھ اصول ہیں جو اہل نظر سے مخفی نہیں ہیں۔ باقی عمران خان کے ساتھ بھی مولانا کا اختلاف کوئی ابدی یا خونی اختلاف نہیں ہے۔ بات اتنی ہے کہ جب بھی مولانا کو یہ اطمینان ہو گیا کہ تحریک انصاف کو غیر جمہوری، طاقتیں ہینڈل نہیں کر رہیں، اور وہ اپنے بیرونی ایجنڈے سے دستبردار ہو کر اپنے فیصلے خود کرنے کی پوزیشن میں ہے تو اس کے ساتھ ورکنگ ریلیشن بنانے میں اسے کوئی مسئلہ نہیں۔ کسی زمانے میں یہی صورت حال اسلامی جمہوری اتحاد کے ساتھ تھی۔ اس زمانے میں بھی دیندار لوگ حیران ہوتے تھے کہ مولانا بے نظیر جیسی لبرل کے بالمقابل قدرے مذہبی رجحان رکھنے والے نواز شریف کا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ لیکن سمجھنے والے سمجھتے تھے کہ مولانا کا نواز شریف پہ گر جنا بر سنا، اس کے لئے نہیں بلکہ اس کو چلانے والوں کے لئے پیغام ہوتا تھا۔

اب ورکنگ ریلیشن شپ کی بات بھی سن لیجئے۔ علماء کی اس جماعت کو عمران خان اور اس کی پارٹی سے سخت اختلاف ہے اور صوبہ میں اس کو کھف نامم دینا کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن لوگوں کے حقوق کے نقصان پہ، جمعیت اپنی سیاست نہیں چمکایا کرتی۔ خیر پختونخوا کے ایک ذمہ دار صوبائی وزیر نے اس خاکسار کو بتایا کہ مولانا کی جماعت نے جس قدر ہمارے ساتھ تعاون کیا ہے اور مختلف موضوعات پر ہماری رہبری کی ہے، اس سے میرے دل میں علماء کیلئے عزت بڑھی ہے۔ آپ میرے کہے کو چھوڑیں، پختونخوا کی حکومت کے کسی وزیر سے تنہائی میں عندیہ لے لیں۔ میری بات کی خود بخود تصدیق ہو جائے گی۔



واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے پارلیمانی سیاست میں الائنس اور اپوزیشن کا ایک نیا تصور دیا ہے۔ یہ نیا ورژن اپنے موقف کی شدت، جمہوری مخالفین کے احترام، عوام کی خیر خواہی اور ہر قیمت پر جمہوریت کے تحفظ پر مبنی ہے (لفظ "جمہوری مخالفین" پیش نظر رہے)

اسی تناظر میں عرض کرتا ہوں کہ نواز شریف یا زرداری کا ساتھ دینے میں مولانا کو ذاتی منفعت نہیں بلکہ اجتماعی مفاد پیش نظر ہوتا ہے کہ یہی اس کے اسلاف کی بھی روایت رہی ہے اور اس کی اپنی 35 سالہ سیاسی زندگی کا خلاصہ بھی۔ مولانا کا موجودہ موقف، صرف اسی خاطر ہے کہ یہ سسٹم ڈی ریل نہ ہونے پائے۔ اس لئے کہ متمر جمہوری نظام، ملک میں امن کی ضمانت ہے اور یہ بھی کہ اسلامی سیاست کی بنیاد و چیزوں پر ہے، پہلی چیز امن ہے اور دوسری، امن کے دامن سے پھوٹی باوقار معیشت۔

آدم برسر مطلب: میرا موقف ہے کہ چند آدمیوں کے بے نامی انکشافات پر، منتخب حکومتیں تو کیا، ایک کلرک کو بھی درخواست نہیں کرنا چاہیے، جب تک کہ آپ کی متفقہ عدالتی نظام سے وہ نا اہل ثابت نہ ہو جائے۔ اس پر خاکسار کا یہ مضمون ملاحظہ کیجئے:

### کیا اب لیکس کی بنیاد پہ حکومتیں گرائی جائیں گی؟

چونکہ ہمارا قومی مزاج یہ ہے کہ جو شخص ہمارے موقف سے متفق نہیں وہ ضرور دشمن کا ایجنٹ ہے۔ لہذا میں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق جمعیت علمائے اسلام کی ایم آر ڈی دور کی نسل سے ہے جو کبھی بھی اپنے دل میں نواز شریف یا اس کے گاؤں اور کیلئے نرم گوشہ محسوس نہیں کر سکتے۔

مگر بات نواز شریف کی نہیں بلکہ اصول کی ہے۔ فرض کریں، نواز شریف کی جگہ عمران خان 18 کروڑ عوام کا حقیقی یا غیر حقیقی منتخب وزیراعظم ہو اور پھر 200 یا 400 صحافی اس کی مالی کرپشن پر ایک رپورٹ شائع کر دیں تو کیا ہمیں فوراً اسے گھر بھیج دینا چاہئے؟ یہ کیا منطق ہوئی؟ ہمیں نہیں پتہ یہ لیکس کیا بلا ہیں؟ سچی ہیں یا جھوٹ کا پلندہ ہے؟ لیکن فرض کیا بالکل سچ ہیں، تب بھی اس کی تحقیق کے لئے مہذب دنیا کا کوئی قاعدہ قانون ہے یا نہیں؟ کیا اب چند صحافی، دنیا کی حکومتوں کے فیصلے کیا کریں گے؟

سرشام جینٹلوی رونق بڑھانے والے خود ساختہ دانش کے حامل تجزیہ نگاروں کو کیا یہ پتہ ہے کہ تجزیے، "ثبوت" کی بنیاد پہ کئے جاتے ہیں نہ کہ "لیکس" کی بنیاد پر۔

سنجیدہ صحافت تو "لیکس" جیسی چیزوں کو خبر کا درجہ بھی نہ دیتی۔

اسی پانامہ لیکس کو مائیکرو سطح پہ لے آئیے۔ مثال کے طور پر سوشل میڈیا پہ کسی جزل کے بارے میں کوئی



ڈاکومنٹ "لیک" ہو جائے تو پہلے اس الزام کی تفتیش کی جائے گی یا پہلے اس جرنیل کو نوکری سے فارغ کیا جائے گا؟ پھر تو مکشن کا کاروبار چل چکا جناب۔

جناب عالی! یہ لیکس نامی اسکینڈل ہمارے معاشروں میں انتشار برپا کرنے کا نیا پانکھنڈ ہے۔ پانامہ لیکس کو اس وقت عالمی مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ اس میں عالمی رہنماں کی خفیہ دولت کے راز اگلے گئے ہیں اور بس۔ معمولی شدہ بدھ رکھنے والا آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ آف شور کمپنیوں میں بڑی خفیہ دولت، غیر اخلاقی سہی مگر غیر قانونی ہرگز نہیں۔ یہ کہ اخلاقی بنیادوں پہ اپنے حکمرانوں کی سرزنش کرنے کا حق صحافیوں کا نہیں بلکہ عوام کا ہے۔

ہمارا مسئلہ اس وقت نواز شریف یا کسی کی دولت نہیں، بلکہ ہمارا مسئلہ ہمارا اپنا ملک اور اس کی معیشت ہے۔ پاکستان کے لوگ کیا چاہتے ہیں؟ یہی کہ ہماری ملکی دولت جو پچھلے ادوار میں لوٹی گئی اسے واپس کیا جائے اور آئندہ کے لئے اس کی روک تھام کی جائے۔ فی الحال پچھلی کرپشن کو بھول کر آئندہ کے سد باب کی کوشش کی جائے۔ اس لئے کہ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوگا، فقط اپنی منزل کھوٹی ہوگی۔ تاہم اگر کوئی دیانتدار سیاسی لیڈر (ہنسنا منع ہے) حکمرانوں کے احتساب پہ مصرعے تو بھائی ہمارے ملک میں احتساب کے ادارے موجود ہیں، ان کے سامنے اپنا کیس پیش کرے۔ اگر موجودہ اداروں کو کھٹ پٹی سمجھتا ہے اور ان پہ مطمئن نہیں تو پارلیمنٹ کے ذریعے اپنے اعتماد کا ایک نیا احتساب ادارہ بنادے (جیسے خیبر پختونخوا اسمبلی نے بنایا تھا) یا فوج کو اقتدار میں لاکر نیب بنادے (جیسے مشرق نے بنائی تھی) یا مولویوں کو اقتدار میں لاکر احتساب کروادے (جیسے ایم ایم اے کے دور میں تھا) مطمئن رہیں نتیجہ ایک ہی نکلے گا کیونکہ ہر روپ میں اشرافیہ ہی ہمارے سروں پہ براہمان رہے گی۔

ہم مسلمان آخرت پہ یقین رکھتے ہیں کہ ہاں جو ہماری ساری تنگ و دو اور جدوجہد کے بعض لوگ اس دنیا میں کمزور فریب کے بل بوتے پر صاف بیچ نکلیں گے مگر ان کا حساب آخرت میں ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دیانتدار معاشرے کے قیام کی کوشش نہ کریں۔ یہ تو وظیفہ ایمانی ہے۔ لیکن اس کام کے لئے بھی رائج دستور کے اندر ہی کوشش کرنا پڑے گی۔ کسی کو اگر رائج دستور اپنے عقائد کے خلاف نظر آتا ہے اور اس کے بدلنے کی پرامن کوشش بے سود لگتی ہے تو کہیں اور ہجرت کر جائے مگر انتشار نہ پھیلانے۔ پچھلے احتساب کی تو بات چھوڑیں آئندہ کی کرپشن روکنا بھی آسان نہیں ہے لیکن اس مسئلہ کے حل کا پرامن راستہ، صرف یہی پارلیمانی نظام ہے، اسکے علاوہ کوئی نہیں۔

میں ایک چھوٹی سی مثال عرض کرتا ہوں۔ کتنے سال ہو گئے کہ نیا اسلام آباد ایئر پورٹ بن رہا ہے۔



بین الاقوامی ایئر پورٹ بنانے کا تجربہ رکھنے کی بنا پر عرض کرتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ چار سال میں بن جانا چاہئے تھا مگر ابھی اس کا 50 فیصد کام بھی مکمل نہیں ہوا اور کتنے دیری ایشن آرڈر بھی لگ چکے ہیں۔ میں تحریک انصاف میں جن دو چار آدمیوں کو سنجیدہ اور سمجھدار خیال کرتا ہوں، ان میں ڈاکٹر عارف علوی بھی ہے جو اسی ایئر پورٹ کے ضمن میں پارلیمنٹ کی قائمہ کمیٹی کے چیئر مین ہیں اور جنہوں نے پچھلے ماہ متعلقہ افسران کی کلاس بھی لی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر نے کسی کو معطل کیوں نہ کیا؟ قوم کے سامنے اس کرپشن پر پریس کانفرنس کیوں نہ کی؟ کیا ڈانٹ ڈپٹ کے ڈرامے کے بعد، ایئر پورٹ بن گیا ہے؟ یہی حال تحریک انصاف کی سب پارلیمانی کمیٹیوں کا ہے۔

ہمیں نواز شریف کی ذاتی آمدنی سے کوئی مسئلہ نہیں کہ حلال کی ہے یا حرام کی ہے؟ ہمارا مسئلہ یہ ہونا چاہئے کہ ملکی دولت چوری نہ ہوئی ہو۔ اب اگر یہ اخباری رپورٹیں ہماری ملکی صحافت کی ہوتیں تو بھی ان کی نفی کرنا ضروری تھا، اسلئے کہ حکمرانوں پر لگنے والے ہر الزام کو سنجیدہ لینا چاہئے، مگر واضح ہو کہ شریعت میں کسی مہم جرم سے صفائی کا بار طرم پر نہیں رکھا گیا کہ وہ ٹی وی پر آکر صفائیاں دے۔ بلکہ اپنے الزامات کو ثابت کرنا خود الزام لگانے والے کے ذمہ ہے کہ وہ متعلقہ ملکی عدالت کے سامنے اپنا کیس ثابت کرے۔

چونکہ پانامہ لیکس کو ایک عالمی معاملہ بنا دیا گیا ہے تو اس سلسلے میں ایک عالمی پروٹوکول موجود ہے۔ ہم اقوام عالم کی ہستی میں رہنے والی ایک قوم ہیں اور اقوام متحدہ کے فیصلوں کے شرعی، قانونی اور اخلاقی طور پر پابند ہیں۔ پس ایسے معاملوں میں ہمیں انتظار کرنا چاہئے کہ عالمی فورم اپنا کیا لائحہ عمل مرتب کرتا ہے۔ یہ جو آکس لینڈ کے وزیراعظم نے پانامہ لیکس کی بنیاد پر استعفیٰ دیا، اس سے اہل پاکستان کا کوئی لینا دینا نہیں ہونا چاہئے۔ ہمیں نہیں معلوم آکس لینڈ میں اتنا بڑا مجمع خود بخود اکٹھا ہوا یا پانامہ لیکس کو وقار بخشنے کیلئے انجمن و مجمع تھا؟ اور آکس لینڈ کے وزیراعظم نے پریشر میں آکر استعفیٰ دیا یا وہ خود بھی گریٹ گیم کا حصہ تھا؟ ہمیں غیر ملکی لیکس یا پراپیگنڈہ کی بجائے، اپنے معاملات کو اپنے ہی انداز میں دیکھنا اور حل کرنا چاہئے۔ بد قسمتی سے ہم ابھی حقیقی جمہوری منزل پہ نہیں پہنچ سکے۔

اب یہ بچکانہ باتیں بند ہونا چاہئیں کہ فلاں چینل کے اینکر کے کہے پر ثابت کیا جائے کہ اس ملک کا تیسری بار منتخب وزیراعظم انڈیا کا جاسوس ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو دنیا کی ہر ایک ایجنسی سمیت ہم سب کو خودکشی کر لینا چاہئے۔ اس ملک کی سنجیدہ سیاست میں ہم نے وہ نمونے بھی دیکھے ہیں کہ کبھی ایک قومی سطح کے لیڈر پر یہ الزام ہوتا ہے کہ فلاں قومی لیڈر انڈین ایجنٹ ہے تو کبھی ایک جرنیل ایک کتاب لکھتا ہے کہ ایک دوسرے جرنیل نے فقط اپنے ذوق کی خاطر ہزاروں فوجی جوان بلاوجہ کارگل میں مروا دیے۔ یہ



بدقسمت ملک پھر بھی چل رہا ہے۔

ہمیں اسی دھاندلی زدہ، کچی پکی جمہوریت کو چلنے دینا چاہئے، بصورت دیگر اپنے ملک کے آئین کے دائرے میں ایسی جمہوری جدوجہد کرنا چاہئے جس سے ملک انتشار کا شکار نہ ہو۔ شوخی قسمت کہ اس وقت نواز شریف کے علاوہ کوئی اور ایسا شخص نظر ہی نہیں آتا جو ملک چلا سکے۔ پیپلز پارٹی کا دور تو کل کی بات ہے۔ خیبر پختونخوا میں تحریک انصاف کی گذشتہ تین سال کی کارکردگی سامنے ہے۔ شکر ہے کہ عمران خان وزیراعظم نہیں بنا ورنہ آج پورے ملک میں یا تو کنسرٹ ہو رہے ہوتے یا ہم چوہے پکڑ رہے ہوتے۔ مذہبی جماعتوں کا جنت نظیر دور بھی ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ خود نوں لیگ میں نواز شریف سے زیادہ بہتر لوگ نظر آتے ہیں مگر خیال آتا ہے کہ چوہدری ثناء کو وزیراعظم بنانے کی صورت میں ہم روزانہ چار گھنٹہ پریس کانفرنسیں سنا کریں گے جبکہ اسلام آباد سکندر حافظ آبادی کے حوالے ہوگا۔

مضمون ختم ہوا۔

پانامہ لیکس کے حوالے سے، آخری بات یہ ہے کہ جمعیت علماء اسلام کو طعنہ دینے والے، خود کہاں کھڑے ہیں؟ دوسری جماعتوں کے ارکان تو خیر سے خود ہی آف شور کمپنیوں کے مالک نکلے، مگر دینی جماعتوں کے کسی ممبر کا نام اس میں نہیں تو اب ہم جماعت اسلامی کی پالیسی کا تجزیہ کر لیتے ہیں۔

جماعت اسلامی اور پانامہ لیکس اتحاد

پانامہ لیکس طوفان سے دو سبق حاصل ہوئے۔

ایک یہ پاکستان کی کسی مذہبی سیاسی جماعت کے کسی لیڈر کا نام آف شور کمپنیوں میں نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ پاکستان کی باقی ساری سیاسی پارٹیوں کا کوئی نہ کوئی لیڈر، آف شور کمپنیاں رکھتا ہے۔

اب عمران خان کی تفسیر کے مطابق، آف شور کمپنیاں رکھنے والے چور ہیں، تو معلوم ہوا کہ حکومت اور اپوزیشن دونوں چور ہیں۔

مذہبی پارٹیوں کی اپنی حکومت تو آتی نہیں۔ پس یوں سمجھ لیجئے کہ ان میں اسے ایک پارٹی یعنی جمعیت علماء اسلام حکومتی چوروں کے ساتھ ہے تو دوسری پارٹی یعنی جماعت اسلامی اپوزیشن کے چوروں کے ساتھ ہے۔ یعنی دونوں چوروں کی سپورٹ کر رہے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن نے اس ساتھ دینے کے عوض اپنے اضلاع کیلئے چھ ارب کے ترقیاتی فنڈ لئے مگر جماعت اسلامی کو کیا ملا؟

پھر پانامہ لیکس پر طوفان کھڑی کرنے والی جماعتوں کی سنجیدگی دیکھئے کہ پہلا کل جماعتی اپوزیشن اتحاد،



اعتراف احسن کے گھر پہ ہو رہا ہے۔ بلاول، عمران خان اور فاروق ستار پاکستان میں موجود ہیں مگر اس میں شریک نہیں ہوتے بلکہ اپنے دوسرے درجہ کی قیادت کو بھیج کر وزیراعظم سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اور اس اہم ترین پہلے اجلاس میں، کون کون پارٹی سربراہ بذات خود شامل ہیں؟  
چوہدری شجاعت، شیخ رشید اور سراج الحق۔

کبھی جماعت اسلامی خود کو عالمی جماعت کہتی تھی، اب شیخ رشید لیول پہ آگئی۔

مولانا فضل الرحمن اگر نواز شریف کے ساتھ ہے تو نواز شریف اسے ذاتی طور پر اور پبلک میں عزت دیتا ہے۔ پیچارہ سراج الحق، عمران خان کا ساتھ بھی دیتا ہے اور اس سے منافقت کا خطاب بھی پاتا ہے (اسلام آباد دھرنے میں کنٹینر پر عمران خان نے کہا کہ سراج الحق، وکٹ کے دونوں طرف کھیلتا ہے) لوجی! اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی۔

### خواتین کے حقوق کی مخالفت:

جمعیت علماء اسلام پہ الزام لگتا ہے کہ وہ خواتین کے حقوق کی مخالفت ہے۔ حالانکہ، ایم ایم اے دور میں خواتین کے لئے کئی وگرنی کالج کھولے گئے۔ جمعیت علماء اسلام کے پینل پر عیسائی خاتون ممبر قومی اسمبلی رہی ہیں۔ تاہم، پنجاب اسمبلی میں خال ہی میں، ایک خواتین تشدد بل پیش کیا گیا جس کے خلاف مولانا فضل الرحمن میدان میں آ گئے۔ مولانا فضل الرحمن وفاق میں حکومت کے اتحادی ہیں اور پنجاب اسمبلی میں ان کا کوئی رکن بھی نہیں۔ مگر انہوں نے بڑے سخت انداز میں اس بل کو لا کارا۔ مجھے ذاتی طور پر اس کی سمجھ نہیں آئی کہ جب پنجاب اسمبلی کی حکومت اور اپوزیشن ساری پارٹیاں اس بل کی حمایتی ہیں تو آپ کو اس کیوں اعتراض ہے؟

اس پہ میرا موقف پڑھ لیجئے:

### پنجاب اسمبلی اور مولانا فضل الرحمن:

پنجاب اسمبلی نے اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے، اپنے صوبے میں خواتین تشدد بل منظور کیا خواتین پر بڑھتے ہوئے مظالم کے پیش نظر، ذاتی طور پر خاکسار، اس بل کی پرزور حمایت کرتا ہے۔  
پنجاب اسمبلی تعریف کی مستحق ہے کہ انہوں نے معاشرتی مسائل کو ڈسکس کر کے اپنی تنخواہ کا حق ادا کیا۔ لیکن جس انداز میں مولانا فضل الرحمن کھلے بندوں پنجاب اسمبلی پر چوٹ فرما رہے ہیں، وہ جمہوریت سے بعید ہے۔ بھائی ان کا صوبہ ہے، وہ منتخب لوگ ہیں، انہوں نے اپنے مردوزن کے لئے ایک بل منظور کیا، مگر



آپ تو ان کے وزیر اعلیٰ تک کو زن مریدی کا طعنہ دے رہے ہیں۔

تسلیم، کہ اس بل پر تنقید بھی مولانا کا جمہوری حق ہے اور ظاہر ہے کہ مولانا، اپنی رائے کو حق سمجھ کر بیان کرنا ضروری سمجھتے ہوں گے مگر بھائی سیاسی ”مفاذ“ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

شہباز شریف کو رگیدنے کی کیا تک ہے؟ پہلے ہی آپ نے پی ٹی آئی سے سینکڑے پھنسائے ہوئے ہیں۔ اب شریفیوں کی دم پہ پاؤں رکھ کر کیا فائدہ ہوگا؟ ادھر دیکھئے، ایک اور دینی جماعت بھی ہے جو ایک صوبے میں سیاسی مفادات کی خاطر، اپنی اتحادی جماعت کے رقص و سرود تک کی وکالت فرمالیا کرتی ہے۔ تو پورے پنجاب کو اپنا دشمن بنانے کی کیا تک، جبکہ پہلے ہی وہاں سے آپ کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے؟ اتنا ضرور مانتا ہوں کہ مولانا نے اپنا وہ جملہ سچ ثابت کر دیا کہ: ”حکومت میں ہونا، نہ ہونا ہمیں حق کوئی سے نہیں روک سکتا“ بلکہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کتنا ہی سیاسی نقصان ہو جائے، مولانا جس چیز کو حق سمجھے، اسے ڈنکے کی چوٹ بیان کرتا ہے۔ مولانا کی یہ سخت گیری، صرف سیکولر لوگوں کے لئے نہیں ہے۔

یادش بخیر! سپاہ صحابہ کے بانی، مولانا حق نواز چھٹو کوئی مولانا کی جماعت کے صوبائی نائب امیر تھے۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ 1988ء میں جھنگ میں کتاب کے نشان پر الیکشن لڑتے، وہ عابدہ حسین جیسی جاگیردارانی کے مقابل 42 ہزار ووٹ لیکر صرف 3 ہزار ووٹ سے ہارے تھے، لیکن مولانا چونکہ ان کی ”شیعہ کافر“ مہم سے متفق نہیں تھے، لہذا کبھی بھی ان کے اختیار کردہ طرز عمل کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نام نہاد انقلابی پارٹیاں، ایک ایک الیکٹیل کو رجھانے، اس کے دروازے پہ ماتھا رگرتی ہیں، وہاں ایک چھوٹی سیاسی جماعت کا محض اصول کے اختلاف پر پورا ایک حلقہ قربان کر دینا اصول پرستی کی زندہ مثال ہے۔ لہذا اصولی اختلاف کے باوجود، مولانا کی اپنے موقف کی خاطر جرات مندانہ للکار کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

### گھریلو تشدد بل کی مخالفت کیوں؟

پنجاب اسمبلی سے منظور شدہ خواتین بل پر اگرچہ ساری اسلامی جماعتیں بیخ پا ہیں مگر میر اسوال صرف مولانا فضل الرحمن سے ہے کیونکہ بوجہ میں علمائے دیوبند کو بھی اور جنرل اور معتدل اسلام کی نمائندہ آواز سمجھتا ہوں۔ میر اسوال ہے کہ خواتین بل کی مخالفت، آپ شریعت کے تحفظ کے لئے کر رہے ہیں یا مشرقی اقدار کے تحفظ کی خاطر؟

دیکھئے! شریعت نے انسان کیلئے اسکی فطرت کے مطابق موزوں ترین قوانین عطا کئے ہوئے ہیں



ریاست اور فرد کے باہمی حقوق، محلے میں ہمسائے کے حقوق اور میاں بیوی کے حقوق، سب بہت واضح طور پر شریعت میں موجود ہیں۔ اصولاً ایک اسلامی ملکی میں، ہر خاندان اور فرد کیلئے کسی انگریزی قانون کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن سب جانتے ہیں کہ شرعی قوانین کی موجودگی کے باوجود، پاکستان میں شروع دن سے فرنگی قوانین موجود ہیں اور انہی قوانین کی بناء پر کاروبار حکومت چلتا رہا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ شریعت میں پہلے سے خواتین کے حقوق موجود ہیں تو یورپی قوانین کا نفاذ، اسلام دشمنی ہے۔ محترم! اس ملک میں رائج سارے فرنگی قوانین اسلامی قوانین کی ضد ہی ہیں۔ ان قوانین کے خلاف آپ بات تو کیا کرتے ہیں مگر اس قدر شور و غوغا کبھی نہیں مچایا؟ ایک اور فرنگی قانون کے آنے سے کیا پہاڑ گرے گا؟

پھر آپ مشرقی اقدار کا رونا روتے ہیں کہ ایک مشرقی مرد کی غیرت سے بعید ہے کہ جو بیوی اس کو کڑا پہنا دے، اس کو اپنے گھر میں رکھے، پس طلاق کی شرح زیادہ ہو جائے گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو مشرقی مرد نظر آتا ہے مگر مشرقی عورت نظر نہیں آتی۔ آخر ایک مشرقی عورت، خاندان کی مار کھا کر بھی، کیوں پولیس کو بلائے گی؟ لندن میں نسلوں سے رہنے والی مشرقی عورتوں نے بھی کبھی شوہر کے خلاف پولیس کو نہیں بلایا تو یہاں کیوں بلائے گی؟

محترم! آپ دین کے محافظ ہیں، نہ کہ مشرقی اقدار کے۔ بلکہ بعض مشرقی اقدار کو آپ ہی ختم کرنے کے شرعاً پابند ہیں۔ اس لئے، قرآن وحدیث سے کوئی ایسی واضح شق پیش کیجئے جو اس بل کو کفر قرار دے اور مزید اپنے احتجاج کی اس قدر شدت کا بھی شرعی جواز پیش فرمائیے۔

خاکسار کا اندازہ ہے کہ یہ بل، پنجاب اسمبلی نے واپس لینے کے لئے بنایا ہے۔ قادری کی پھانسی پر بحث بڑھ کر کسی کے گریبان کی طرف جاسکتی تھی، لہذا مولویوں کو نئی بات پر ہنگامہ کھڑا کرنے کو کہا گیا تاکہ دینی مزاج عوام کا ذہن بٹ جائے، لبرل لوگوں کو پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے نون لیگ میں لایا جائے، مغربی آقاؤں کے سامنے بھی سرخرو ہو جائیں، اور بعد میں بل واپس لیکر مولویوں کو بھی خوش کر دیا جائے۔ ہاں، صرف مولانا ناشرانی کو احتجاج کا حق حاصل ہے۔ اس لئے کہ دستوری طور پر ہر نئے بل سے پہلے، اسلامی نظریاتی کونسل سے راہنمائی لینا چاہئے جو کہ نہیں لی گئی۔

نوٹ: اس علمی اختلاف کے باوجود بھی عملی میدان میں ہم جمعیت علماء اسلام کے فالورز ہیں۔ والسلام خیر، یہ تحریر، اس حد تک درست ثابت ہوئی کہ بل واپس لے لیا گیا۔ اور یہ کہ میرا مولانا سے دوسرا گلہ بھی



دور ہو گیا۔ وہ یوں کہ مولانا شیرانی نے اس بل کے مقابل، اسلامی نظریاتی کونسل سے تمام مکاتیب فکر کے عالم کا متفقہ متبادل بل بھی پیش کر دکھایا اور یوں علماء نے اپنی بات کو منطقی طور پر سنجیدگی عطا کی ہے۔

### کشمیر کمیٹی کی ناقص کارکردگی:

جب مولانا فضل الرحمن پہ نہ تو کرپشن کا الزام بار آور ہوسکا، نہ کسی اور طور اسے نچا دکھاسکے تو یار لوگوں نے کشمیر کمیٹی کی چیئر مینی کو موضوع بنا کر مولانا کو رگیدنا چاہا۔ افسوس کہ حاسدین کا یہ داؤ بھی نہ چل سکا۔ مولانا فضل الرحمن، کشمیر کمیٹی کے چیئر مین ہیں، پوچھنا تو حق بنتا ہے کہ انہوں نے کشمیر کیلئے کیا کیا ہے؟ دیکھیے! مولانا سے پہلے مشرف دور میں کشمیر کمیٹی کے چیئر مین، حامد ناصر چٹھہ تھے جو تحریک انصاف میں شامل ہو چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ کشمیر کو تقریباً آزاد کر اہی چکے تھے۔

ان سے پہلے یعنی 1996 تا 1999 کشمیر کمیٹی کے چیئر مین غلام سرور خان تھے وہ بھی تحریک انصاف کے لیڈر ہیں۔ یعنی تحریک انصاف کے دو موجودہ لیڈروں کی چیئر مینی کا کل عرصہ 10 سال بنتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے مجلس لوگوں کے ہاتھوں کشمیر آزاد ہونے ہی لگا تھا کہ مولانا نے کام خراب کر دیا۔ مولانا تو خیر بیچارہ کس کھیت کی مولیٰ ہے۔ پارٹیشن کے فوراً بعد کشمیر کونسل بنائی گئی تھی جس کے ارکان میں مولانا مودودی بھی شامل تھے۔ ظاہر ہے ایسے دانشمند لوگوں کی مساعی جلیلہ کو بھی مولانا فضل الرحمن نے برباد کر دیا، ورنہ کشمیر کب کا آزاد ہو چکا تھا۔

اب حالت یہ ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی میں تو می اسمبلی کی مختلف جماعتوں کے 35 ممبران شامل ہیں جو مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں مگر لوگوں کو ان کے نام بھی نہیں معلوم، نام صرف مولانا کا معلوم ہے۔ میں یہ قطعاً نہیں کہتا کہ مولانا سے باز پرس نہ کی جائے۔ بطور چیئر مین کشمیر کمیٹی، ان کی کارکردگی پر باز پرس کرنا تو کم کا حق بنتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ مولانا سے یہ باز پرس سوشل میڈیا کے کا کے کریں گے یا قوم کے نمائندہ لیڈروں کو کرنا چاہئے؟

آخر اپوزیشن لیڈر یا کوئی اور پارٹی لیڈر اسمبلی کے فورم پر مولانا سے سوال کیوں نہیں کرتا؟

کہیں ایسا تو نہیں کہ مولانا کے جواب سے کسی کو ننگا ہونے کا ڈر ہو۔

مندرجہ بالا مختصر پیرا گراف کو دوبارہ پڑھ لیجئے۔ اس میں نہ تو مولانا کی صفائی پیش کی گئی ہے، نہ کشمیر کمیٹی کے قواعد و ضوابط پہ گفتگو ہے، نہ مسئلہ کشمیر کی شرعی و قانونی حیثیت کی تشریح ہے اور نہ اس کمیٹی کی رپورٹ پر کوئی تبصرہ ہے۔ بلکہ اس عبارت میں ایک سادہ سا سوال ہے جو کہ مولانا کے معترضین پہ کیا گیا ہے۔



شعور کی بنیادی سطح، سوال کو سمجھنا ہوتا ہے۔ جب سوال ہی آدمی نہ سمجھ سکے تو تبصرہ کیا کرے گا؟ میں اس کو مزید سادہ بنا کر لکھتا ہوں:

دیکھئے! اگر آپ پالیٹکس پہ تبصرہ فرمانے کے شوقین ہیں تو ہمیں امید ہے کہ آپ مندرجہ ذیل بنیادی باتوں سے پہلے ہی واقف ہوں گے۔

بحیثیت ایک جمہوری ملک کے مہذب شہری کے، آپ اس پہ یقین رکھتے ہیں کہ ملکی مسائل چوکوں، تھڑوں، بازاروں کی بجائے ایک منتخب فورم پہ حل کئے جائیں۔

آپ نے ملکی پالیسی بنانے میں اپنا حصہ ڈالنے، ووٹ کے ذریعے پانچ سال کیلئے اپنا نمائندہ منتخب کیا تاکہ قوم کے باقی افراد اگلے پانچ سال کیلئے اپنی روزمرہ زندگی پہ توجہ دیں۔ ملکی انتظام چلانے کیلئے ایک حکومتی ٹیم منتخب ہوئی اور اس ٹیم کو راہ راست پہ رکھنے، اپوزیشن کی دوسری ٹیم منتخب ہوئی۔

آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اگرچہ ملک کا نظم و نسق چلانے کیلئے، وزیروں، مشیروں کی ٹیم حکمران ہی بنایا کرتے ہیں لیکن بعض امور ایسے ہوتے ہیں جن میں صرف حکومتی پارٹی کو فری ہینڈ نہیں دیا جاسکتا۔ اس کیلئے حکومت اور اپوزیشن کے متعدد ممبران پر مشتمل پارلیمانی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں جیسے پبلک اکاؤنٹس کمیٹی، امور خارجہ کمیٹی، کشمیر کمیٹی وغیرہ۔ امید ہے آپ کو ان سب کمیٹیوں کی ترتیب و دائرہ کار کا بخوبی علم ہوگا۔ آپ کو یہ بھی پتہ ہوگا کہ ان پارلیمانی کمیٹیوں کا سربراہ، حکومتی یا اپوزیشن ممبر ہو سکتا ہے۔ یہ کمیٹی، وفاقی وزارت کو جوابدہی کیلئے طلب کر سکتی ہے۔ اس کمیٹی کا سربراہ، صرف اپنی ٹیم کا ترجمان ہوتا ہے ورنہ ذاتی اختیارات میں تفاوت نہیں رکھتا۔ اس کو وفاقی وزیر کا رسمی عہدہ دیا جاتا ہے کیونکہ آئینی طور پر یہ وفاقی وزیر کا گویا "باس" ہوا کرتا ہے تو اس سے کم عہدہ نہیں ہو سکتا۔

ہمیں یہ احساس ہے کہ کشمیر کمیٹی سمیت کسی بھی پارلیمانی کمیٹی کی خاطر خواہ کارکردگی نہیں رہی جو کہ اس کے جملہ ممبران، حکومت اور اپوزیشن دونوں کے منہ پہ طمانچہ ہے۔ ان کمیٹیوں کا احتساب اگر پارلیمنٹ میں موجود سیاسی لیڈران نہیں کر رہے تو وہ نہ صرف اس کے جرائم میں شریک ہیں بلکہ عوام کے ٹیکسوں سے حرام کی تنخواہ بھی لے رہے ہیں۔ ہمیں آپ کے شعور سے امید ہے کہ اس سادہ بات کو بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی امید ہے کہ جس طرح کشمیر کمیٹی پر آپ تبصرہ فرماتے ہیں، آپ دوسری پارلیمانی کمیٹیوں پر اتنا ہی تبصرہ فرماتے رہتے ہوں گے۔ اگر ایسا نہیں اور آپ کو صرف کشمیر کمیٹی پر بے چینی ہوتی ہے تو آپ کسی خاص بغض کا شکار ہیں۔

ہمیں یہ بھی امید ہے کہ اگر مولانا فضل الرحمن کی کارکردگی سے آپ مطمئن نہیں ہیں تو ان کی کمیٹی کے



35 ممبران کو آپ نے اپنے تمبرہ جات میں ضرور مخاطب کیا ہوگا کہ آپ کی کمیٹی کا لیڈر کیا کر رہا ہے؟ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ کسی خاص نفسیاتی آگ میں جل رہے ہیں۔

اب چونکہ کشمیر کمیٹی کے سب اراکین ہی کم سم ہیں تو آپ نے پارلیمنٹ میں موجود، سیاسی لیڈران کو کم از کم ان کمیٹیوں میں موجودان کے اپنے ممبران کا احتساب کرنے کا فرض یاد دلایا ہوگا۔ اگر نہیں کیا تو پھر آپ کو سیاسی تمبرہ بازی زیب نہیں دیتی۔

ہمیں یہ بھی امید ہے کہ چونکہ "مجرم" مولانا فضل الرحمن سے کوئی بھی سیاسی لیڈر پارلیمنٹ کے فورم پر باز پرس نہیں کر رہا تو آپ باقی سارے سیاسی لیڈران کو بھی اسی طرح مجرم، منافق اور مفت خور کہتے ہوں گے۔ اگر آپ صرف مولانا کو ہی یہ خطاب دیتے ہیں تو آپ کی یہ بیماری، بظاہر لاعلاج ہے۔ ہم اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

پس ہمارے پہلے والے پیرا گراف میں انہی مذکورہ باتوں کو ایک سوال بنا کر پیش کیا گیا ہے، وہ سوال کسی دوسرے کی کارکردگی سے متعلق نہیں ہے، بلکہ مقررین کے رویے سے متعلق ہے۔

آپ حیران ہوں گے کہ میرے اس سوال کا جواب، ایک انتہائی تعلیم یافتہ دوست نے یہ کہہ کر دیا کہ آخر مولانا کو قیثات کیونکر میسر ہیں؟

عرض کیا: ”برادر! ہمارے معاشرے میں مولوی کے تن پہ سفید پٹے کسی کو برداشت نہیں ہوتے ورنہ آپ مولانا فضل الرحمن کی قیثات حوالہ دیے کیلئے سوشل میڈیا کے پراپیگنڈہ کے علاوہ کوئی معقول ثبوت ضرور مہیا کرتے۔ ڈیرہ میں 10 مرلہ گھر کے سوا اس کرہ ارضی پہ اس کا کوئی گھر نہیں۔ سرکاری لینڈ کروزر جو اس کو بلحاظ عہدہ ملی، اس کے علاوہ ان کے زیر استعمال کوئی گاڑی نہیں۔ عیدین تہوار گھریا حرم میں گزارتے ہیں اور دیگر لیڈروں کی طرح اس کی "نچی چھٹیاں" نہیں ہوتیں۔ پانامہ لیکس کل کی بات ہے، کسی بھی دینی لیڈر کا نام اس میں نہیں۔ مگر پھر بھی آپ کے نزدیک وہ لیرا ہے، حد ہوتی ہے۔

امور کشمیر کی پارلیمانی کمیٹی کا وہ سربراہ ہے، جو اپنی جماعت کیلئے تین وفاقی وزارتیں لے سکتا ہے، خود کیوں وفاقی وزیر نہیں بنتا؟ کیا اس میں زیادہ پیسہ نہیں۔ وفاقی وزیر امور کشمیر، گویا کشمیر کا وائسرائے ہوتا ہے، کیا عہدہ لینے میں اسے کوئی روکاٹ ہے؟ حد ہوتی ہے۔

آپ کا شکریہ کہ آپ نے تسلیم کیا کہ سب حکومتیں، معاشی استحکام کیلئے اس کی محتاج ہیں۔ ورنہ تو دیگر 40 دینی جماعتوں کا وہ ٹولہ بھی موجود ہے جو آپارہ کے حکم پہ دفاع پاکستان کونسل کے نام سے اکٹھا ہو جایا کرتا ہے۔ حالانکہ سب حکومتوں کو پتہ ہے کہ مولانا کو ساتھ نہ بھی ملایا جائے تو بھی وہ قوم میں جلاؤ گھیراؤ کی



سیاست نہیں کرتا حالانکہ اسکے پاس کئی مواقع پر کئی پتے ہاتھ آئے۔ خیر، آپ کے اس تبصرہ کو ان لوگوں کو ضرور پڑھنا چاہئے جو غراتے تھے کہ ہم نے مولانا کی سیاست کو ختم کر دیا۔ میرے پیارے! مشرف دور میں اگر وہ پختونخوا حکومت سے استعفیٰ دے دیتا تو مشرف کو مشکل ضرور پیش آتی۔ اس نے نہیں دیا اور نہ ہی عوام سے کوئی ایسا وعدہ کیا تھا، نہ ہی دھمکی دی تھی اور نہ ایسا انتشار پیدا کرنے کا اس کا کوئی ایجنڈا تھا۔ لیکن، آج نواز شریف کو ہٹانے بھی تو اسمبلی سے استعفیٰ دیا جاسکتا ہے۔ نواز کو مشرف سے زیادہ مشکل میں ڈالا جاسکتا ہے اور یہاں تو بڑے بڑے ڈرامہ بازوں نے استعفیٰ کے ڈائیلاگ سنا سنا کر عوام کے دماغ کی وہی بنادی ہے۔ پس وہ یہ کام آج کیوں نہیں کر لیتے تاکہ مولانا پر اپنی اخلاقی برتری کا ڈھنڈورا پیٹ سکیں؟

اب آپ یہ ضرور بولنا کہ میں کسی پارٹی کا نہیں ہوں لیکن عمران خان پھر بھی باقی سب سے اچھا ہے۔ اب اس الزامی سوال و جواب کے بعد، میں مسئلہ کشمیر بارے اپنا ذاتی موقف، ایک اہتمام سے بیان کرتا ہوں۔ جسے میں نے "قریشی برادری کا مسئلہ" سے متعین کیا ہے۔

### قریشی برادری کا مسئلہ

کشمیر کمیٹی کے تناظر میں ایک مختصر کہانی پیش کر رہا ہوں، جس کے آخر میں ایک سادہ سوال رکھوں گا، آپ کی ذہانت کا امتحان ہے۔

بہت برس پہلے، میاں مسلم قریشی کی برادری کو ایک کالونی الاٹ ہوئی۔ کالونی کے پچھواڑے ایک ظالم مخدوم کا وسیع باغ تھا جس کے غریب مزارعین بھی قریشی قوم سے تھے۔ ادھر مسلم قریشی کی کالونی میں ایک مولوی ٹوکہ رہتا تھا جس کے پاس غنڈے بھی تھے۔ اس نے مسلم قریشی کو سبز باغ دکھا کر مخدوم کے باغ کو بھی ہتھیانے کی ترغیب دی۔

مسلم قریشی کو اپنی برادری کی نیکی کا علم تھا، جب علاقہ کے تھانیدار نے بھی اس کا ساتھ دینے کی حامی بھری تو اس نے مولوی ٹوکہ کو کاروائی کا گرین سگنل دیدیا جس نے مزارعین کو مخدوم کی خلاف بغاوت پر اکسادی۔ مخدوم کو بھی حالات کا اندازہ ہو گیا اور اس نے چپکے سے زمین بکٹی سرداروں کو بچ دی۔ مولوی ٹوکہ کے لوگ وہاں گئے تو ٹکٹیوں نے مار مار کر بھگا دیا اور مزارعین پر مزید ظلم شروع ہو گیا۔

اب مولوی ٹوکہ نے کالونی کی قریشی برادری کو برادری ازم کا واسطہ دیکر چندے اکٹھے کرنا شروع کئے ادھر تھانیدار نے بھی ایک آدھ بار، باغ میں اپنے سپاہی بھیجے جو مار کھا کر واپس ہوئے



مسلم قریشی بپارے نے شہر کی برادریوں کے عمائدین کے پاس وفود بھیجے کہ ہماری مدد کریں مگر ان عمائدین نے القاریشی کو قصور وار ٹھہرایا کہ جب زمین کے ملکیتی کاغذ بکٹی کے پاس ہیں تو تم نے قبضہ کرنے کو اپنے بندے کس قانون سے وہاں بھیجے؟

قریشی کالونی میں ایک ملا خیر خواہ بھی رہتا تھا جو یہ اصولی بات کہتا تھا کہ جب مخدوم نے زمین بکٹی کو بیچ دی تو پھر غنڈی گردی درست نہیں کہ اس سے مزارعین کو مزید مار پڑے گی۔ مگر ملا خیر خواہ کی بات کو نہیں سنتا تھا۔ جب کئی برس گزر گئے اور کچھ حاصل حصول نہ ہوا۔ تھانیدار اور مولوی ٹوکہ ڈھینگین مارتے رہے اور مال کھاتے رہے۔ ادھر برادری کے غریب مزارعین مزید مار کھاتے رہے اور کالونی کے لوگ بھی قریشی پر جرح کرنے لگے۔ شہر کے کسی وڈیرے نے بھی قریشی کا ساتھ نہ دیا تو بالآخر اس نے مولوی خیر خواہ سے اس مسئلہ کا حل پوچھا۔

مولوی خیر خواہ نے سمجھایا کہ شہر کے وڈیروں کو اس صورت میں ثالث بنا سکتے ہو۔ اگر ان کو یہ کہنے کہ بجائے کہ زمین پر میرا حق ہے، تم صرف غریب مزارعین کی تکالیف کا واسطہ دیکر مسئلہ حل کراؤ۔

قریشی نے مولوی خیر خواہ کو دین و انسانیت کا واسطہ دیا کہ اب آپ ہی میری طرف سے وفد لے جاؤ اور وڈیروں کو اپنے انداز سے مسئلہ کے بیچ لاؤ۔ مولانا خیر خواہ نے صرف ایک شرط رکھی کہ جب تک میں سب وڈیروں کو مل نہیں لیتا تب تک، تھانیدار کے سپاہی اور مولوی ٹوکہ کے غنڈے، اس باغ کی طرف نہیں جائیں گے۔ قریشی مان گیا مگر مولوی خیر خواہ کے باہر جاتے ہی مولوی ٹوکہ نے تھانیدار سے جا کر کہا کہ اگر مزارعین اور بکٹی کا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تو کالونی کے قریشی جو سا لہا سال، اسی مسئلہ کی خاطر ہمیں چندہ دیتے رہے، وہ ہماری باز پرس شروع کر دیں گے۔ مزید یہ کہ باغ کے مزارعین بھی یہ بھانڈا پھوڑ دیں گے۔ لڑتے مرنے مزارعین رہے، مال تو ان کے نام پہ دوسرے کھاتے رہے۔

پس مولانا خیر خواہ جب شہر کے وڈیروں کو بیچ میں لانے میں کامیاب ہونے والا تھا کہ ایک بار پھر جاگیر پر مزارعین نے بکٹی کے ملازمین سے پنگا لے لیا اور مار پیٹ شروع ہو گئی۔ ایک بار پھر وڈیرے، اس مسئلہ سے لاتعلقی ہونے لگے۔

ادھر مولوی ٹوکہ نے کالونی کے قریشیوں کو یہ باور کرا دیا کہ مولوی خیر خواہ، تمہاری برادری کے ساتھ مخلص نہیں اور مسئلہ حل کرنے کی بجائے سیر سپاٹے کر رہا ہے تو کالونی کے سادہ قریشی لوگ، یہ دیکھ کر بغیر کہ مولوی خیر خواہ، کئی سال پرانے اس مسئلہ میں پچھلے مہینے دخل انداز ہوا ہے اور وہ بھی صرف انسانیت کے کاٹے، مولوی خیر خواہ کو ہی کو سننے دینے لگے۔



خیر، یہ کہانی ابھی ادھوری ہے۔ میرا سوال آپ سے یہ ہے کہ اس کہانی میں ”مولوی ٹوکہ“ کا کردار میں نے کس کے لئے تخلیق کیا ہے؟  
کمال دیکھئے کہ جس نے بھی غور سے یہ کہانی پڑھی، اس کا جواب تھا ”جماعت اسلامی۔“

### لیبیا حکومت سے تعلقات:

لیبیا کی حکومت اور جمعیت علماء اسلام کے مابین مفتی محمود صاحب کے دور سے لیکر 1990 تک تعلقات رہے۔ کس حد تک؟ اس کی مجھے خبر نہیں۔ لیکن کیوں رہے؟ اس پہ میں تہمہ کر سکتا ہوں۔  
یہ تو ممکن ہی نہیں کہ مفتی محمود صاحب نے لیبیا سے پیسہ بنانے کیلئے تعلقات رکھے ہوں۔ وہ تو مفتی محمود صاحب کی زندگی اور جمعیت علماء اسلام کی حالت زار سے ہی عیاں ہے۔ بھٹو کی شہادت کے بعد، کرل قذافی کے پاکستان سے تعلقات خراب ہو گئے تھے۔ اب ایک طرف کرل قذافی کی پاکستان سے سرد مہری تھی تو دوسری طرف جمعیت علماء اسلام، ضیاء مارشل لا کا عذاب جھیل رہی تھی۔ مولانا فضل الرحمن پابند سلاسل تھے، ضیاء الحق کی حمایت و مخالفت کی بناء پر جماعتی تقسیم کے بعد متوازی دھڑے کے بڑے لیڈر جنرل صاحب کی گود میں جانیٹھے تھے اور گویا پارٹی زمین سے لگ چکی تھی۔

بے نظیر حکومت کے بعد جمعیت اور قذافی کے دوبارہ رابطے بحال ہوئے مگر فوراً ہی ختم ہو گئے۔ اس کی وجہ مولانا فضل الرحمن کا اپنے اٹل موقف پہ استقلال تھا۔ یہ کہانی پھر سہی۔

البتہ عوامی طور پہ یہ مشہور رہا کہ ڈیرہ میں ایک یونیورسٹی لیبیا کے تعاون تعمیر کی جائے گی۔ اصل بات یوں ہے کہ مولانا فضل الرحمن کا ڈیرہ میں مدرسہ جامعہ معارف الشرعیہ کے نام سے انجینئر اور لیس سدوزئی کی حویلی میں عارضی طور پر قائم تھا، جمعیت کا منصوبہ تھا کہ جامعہ کو ایک عظیم الشان یونیورسٹی میں تبدیل کیا جائے جس میں دینی و عصری علوم مہیا کئے جائیں۔ اس کیلئے زمین ڈیرہ کے معروف زمیندار حاجی عبدالرشید دھپ نے حد یہ کی تھی، اس کی عظیم الشان افتتاحی تقریب ڈیرہ اسماعیل خان میں منعقد ہوئی۔

مگر اس تقریب کے بعد نہ تو یونیورسٹی کی بات آگے بڑھی، نہ ہی لیبیا کی حکومت سے جمعیت کا کوئی اور رابطہ نظر آیا۔ حاجی عبدالرشید دھپ صاحب جو میرے محترم ہیں، ان سے اس موضوع پر حال حوال پوچھا تو انہوں نے کہا کہ کافی عرصہ وہ زمین یونہی پڑی رہی۔ تو میں نے مولانا سے کہا کہ یا تو آپ اسے کسی مصرف میں لائیں یا میں خود اس میں کچھ پراجیکٹ کھولوں۔ مولانا نے، بخوشی مجھ اجازت دیدی اور زمین واپس ہو گئی۔ جس آدمی میں اتنا استغناء ہو کہ بدیہ کی گئی زمین کو سالوں تک دیکھنے کا روادار نہ ہو اور واپس کر دیتا ہو،



کیا وہ حکومت کی چند کنال زمین دبائے گا؟

اب مفتی محمود صاحب کے لیپا سے تعلقات کی ایک ہی وجہ سامنے آتی ہے، جو دونوں میں مشترک تھی اور وہ ہے امریکہ دشمنی۔ بھٹو اور قذافی غیر رسمی دوستی کی بنیاد بھی یہی تھی اور قذافی کا امریکہ کو سرنڈرنہ کرنا اور اس کے قتل نے واضح کر دیا کہ مفتی صاحب نے درست آدمی کو پہچانا تھا۔

یہاں یہ واضح کرنا ضروری ہو گا کہ حکومتیں، دوسرے ممالک کے سیاسی حلقوں میں اپنی لابی رکھا کرتی ہیں۔ پاکستان نے بھی کئی ملکوں میں اپنی لابی کی ہوئی ہے۔ جیسے دیگر حکومتوں کو اپنی حامی لابی رکھنا، ان کے معاشی اور سیاسی مفادات کیلئے ضروری ہوتا ہے، ویسے ہی قومی، سیاسی جماعتوں کو بھی بین الاقوامی حلیف درکار ہوتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے گاؤں کے دو سیاسی گھرانے، قومی سیاستدانوں کے ساتھ ضرور ربط رکھتے ہیں، تاکہ کسی نازک موقع پر ان کو پاورفل حمایت میسر آ سکے۔ بڑی سیاسی جماعتوں میں ایلٹ کلاس کے اکثر لوگ، نظریات کی وجہ سے نہیں، اپنے مفادات کی وجہ سے شامل ہوا کرتے ہیں۔ تاہم یہ بھی ضروری نہیں ہر کوئی بس اپنی ذات کیلئے ہی کسی پارٹی کا مجبور ہے۔

خیر! پاکستان میں جمعیت علماء اسلام کے اگر لیپا سے تعلقات تھے تو مولانا نورانی کے عراق سے، ولی خان کے روس سے، ایم کیو ایم کے انڈیا سے اور جماعت اسلامی کے سعودیہ سے تعلقات بھی ڈھکے چھپے نہ تھے۔ ایم کیو ایم نے ریاست پاکستان کو جس طرح برغمال بنایا، وہ بھی ظاہر و باہر ہے۔ سعودیہ نے پاکستان میں جماعت اسلامی سے ملکر جو نظریاتی سرمایہ کاری کی ہے، اس کے نتائج بھی سامنے ہیں۔ اس تناظر میں لیپا کے ساتھ جمعیت کے روابط نے پاکستان کو کبھی کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا بلکہ اس کی امداد ہی کی ہے۔

آج کے پاکستانی جو خمیازہ بھگت رہے ہیں وہ، لیپا، عراق یا روس وغیرہ کی حلیف جماعتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ سعودیہ اور انڈیا کی حلیف جماعتوں کی پالیسی کی وجہ سے بھگت رہے ہیں اور مزے کی بات یہ کہ ان دونوں ملکوں کی حلیف جماعتوں کو ہماری فوج نے ناک کا بال بنا کر رکھا ہوا تھا۔

یہاں ایک سوال اٹھتا ہے کہ جب سیاسی جماعتیں، دوسرے ملکوں کی ایجنسیوں کی لابیگ کانظریاتی حصہ بن سکتی ہیں تو اپنے ملک کی ایجنسی کا کیوں نہیں؟ دیکھئے! اپنے ملک کی ایجنسی بھی باہر کے ملکوں کی سیاسی جماعتوں میں لابیگ کرتی ہوگی مگر اپنے ملک میں اس کے لئے سب سیاسی جماعتیں برابر ہونی چاہئیں کیونکہ منطقی طور پر، یہاں تو اسی کو سیاست کی اجازت ہے جو ملک دشمن نہیں ہے۔ تو یہاں ایجنسیوں کی طرف سے کسی ایک لیڈر کی پشت پناہی کرنا فال گیم ہے۔



## وراثتی قیادت:

جمعیت علماء اسلام پہ ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ وراثتی سیاست کرتی ہے۔ اگرچہ میرا موقف ہے کہ مولانا فضل الرحمن کے خاندان کو رضا کارانہ طور پر آگے آنے سے اجتناب کرنا چاہئے، مگر وراثتی سیاست پہ تیخ پا ہونے والوں سے میرا سوال ہے کہ آخر کیوں نہیں کرنی چاہیے؟ میں اس موضوع پر اپنا ایک مضمون پیش خدمت کرتا ہوں:

## جذباتی معاشرے اور وراثتی سیاست:

رہتے جذباتی معاشروں میں ہیں اور تنہا یہ کہ مغرب جیسا میرٹ پر مبنی سسٹم عطاء ہو۔ بھائی جن مشرقی معاشروں میں، رشتوں کے بندھن ابھی قائم ہیں، وہاں لگے بندھے نظام چلے ہیں نہ چل سکتے ہیں۔ مغرب کی نفسانسی سوسائٹی میں نہ کوئی کسی کے جگر کا ٹکڑا، نہ آنکھ کا ٹکڑا۔ وہاں غبن کیوں ہو جہاں اپنی ذات کے خول میں بند، اپنے مستقبل سے بے یقین آدمی، پھونک پھونک کر نوکری کرتا ہے کہ غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہاں تو بچوں اور بیوہ بہن کو پالنے والا، اگر رشوت نہ بھی لے، پر بیٹی کے سرال کا کام آ پڑے تو کیا کرے؟ مغربی معاشرے نے جذباتیت سے آزاد ہو کر کھویا کم، پایا زیادہ ہے۔ مشرقی معاشرہ بالخصوص پاک و ہند کا معاشرہ روایات اور جذبات پر قائم ہے (اسلئے بالی ووڈ کی ہر فلم کا خلاصہ، رونا ہے یا گانا ہے) ایسے معاشروں میں عقل اور منطق کی باتیں کرنا ہی بے عقل ہے۔ یہاں منہ بند رکھ کر، چھپ چھپا کر ووٹ تو شاید دے لو، پر ساس کو عقل سکھانے والی یا داماد کو منطق سمجھانے والا، پھر نیند کی گولیاں ہی لیا کرتا ہے بھائی۔ خود کو پہچان کر جیو، تو چل پاؤ گے، ورنہ کلوریکس کے ڈرم میں نہا کر بھی گوروں جیسے نہیں بن سکتے۔ اس جذباتی معاشرہ پر جب مذہب کا تڑکے بھی لگ جائے تو کیا کہنے!

آپ کی ساری تعلیم، تجربہ، سائنس اور منطق، ایک مولوی کی جوتی کی نوک پر ہے۔ فقہ میں ایک اصطلاح ہے ”استنباط“، یعنی میز پر پڑے شیشے کے گلاس کو اگر حضرت والا نے فلاں روایت سے استنباط کر کے پھینس ثابت کیا تو کیا کہو گے؟ آپکا انکار ہی نہیں، تردد بھی آپکو آپکے منطقی انجام تک پہنچا سکتا ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ ایسے معاشروں میں موروثی سیاست، نہ ختم کی جاسکتی ہے، نہ ہی کرنا چاہیے کہ یہ اس سوسائٹی کا بنیادی عنصر ہوتا ہے۔ تاریخ کا جبر، ایک خاندان کو اکھاڑتا ضرور ہے، پر صرف اس لئے کہ دوسرے خاندان کو جگہ دی جائے۔ موروثی سیاست کے جذباتی مخالفین، بعض اوقات بڑی دور تک جا کر بڑے محترم ناموں کے گریبانوں پر ہاتھ ڈال آتے ہیں۔ گستاخی معاف! حضرت امیر معاویہؓ نے یزید کو



جانشین مقرر کر کے وراثتی سیاست کی؟ لیکن یہ تو بعد میں ہوا۔ امیر معاویہ نے حسن بن علی سے معاہدہ کیا تھا تو حسن کو کس نے نامزد کیا تھا؟ حضرت علیؑ نے نہیں کیا، مگر خاندان بنی ہاشم نے کیا، کیوں؟ اس لئے کہ وہ اپنے گروپ کیلئے اسی طرح وحدت کا سہیل تھے جس طرح بنو امیہ کیلئے یزید۔ میں بوجہ، نازک وادیوں میں قدم نہیں رکھنا چاہتا، ورنہ موروثی سیاست کے نقادوں سے پوچھتا کہ اگر موروثیت اتنا ہی بڑا جرم تھا تو سرکار کے وصال کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں، بنی ہاشم کے بزرگان کس عنوان پر جمع ہوئے تھے؟

بات یہ ہے کہ مشرقی خاندانوں کی بنیاد ہی اپنے بڑوں کا احترام کرنا ہے، جس بناء پر ان کا امن اور وحدت قائم رہتی ہے۔ اس تناظر میں بڑوں کے وارث کو مریدین طبعی طور پر اپنا بڑا قبول کر لیتے ہیں اور یوں اس گروہ کی وحدت قائم رہتی ہے۔ (بعض لوگ تو موروثیت کے لفظ سے ہی چڑتے ہیں حالانکہ انبیاء نے اپنی تحریک کے وارث خود مانگے ہیں)

ہمارے ہاں کی موجودہ سیاسی پارٹیاں بھی ایک قبیلہ کی طرح ہوتی ہیں جو یہاں کے کلچر کی مجبوری ہے، اسلئے کہ مغرب میں کسی سیاسی مخالف کو بھینس چوری کے مقدمے میں گرفتار کرا کر لٹر پڑوانے کا رواج نہیں۔ یہاں اگر کسی پارٹی میں موروثیت ہے تو بھائی یا پارٹی کارکنوں کا اندرونی مسئلہ ہے، ہمیں تمہیں کا کیا دخل؟ پھر یہاں کی سیاست میں کارکن نہیں ہوا کرتے بلکہ جیالے، متوالے، دیوانے، چھتے، جانثار وغیرہ اور وہ بھی بے شمار ہوتے ہیں۔

جناب من! کارکن دفتروں اور کمپنیوں میں ہوا کرتے ہیں۔ جذباتی معاشرے میں مرید اور پجاری بستے ہیں، جہاں ممدوح کے پیالے اور پا بجائے تنگ سے پیار کیا جاتا ہے۔ تو اس کی آل اولاد تو بدرجہ اولیٰ، مریدوں کے لئے وحدت کا محور ہوتی ہے۔

اور پھر یہ سنئے! سیاسی جماعتوں میں میرٹ پر تقرری اور ترقی؟ یہ سیاسی جماعت ہے یا رسول سروس؟ بھائی کئی قبیلے ایسے تھے کہ ان کا سردار، اپنے قبیلے کے لوگوں کے بعد مسلمان ہوا لیکن نبی ﷺ نے پھر اسی کو سرداری عطا کر دی۔ جو رسول ﷺ نے کیا، وہی تو میرٹ ہوتا ہے۔ آپ عمر فاروقؓ کی مثال دیتے ہو کہ وہ بنو امیہ کے سرداروں کے سامنے بلال حبشی کو مقدم رکھتا تھا۔ جناب! ذاتی عزت افزائی کرنا، پرانے اور نظریاتی کارکن کا حق ہے، پر شام کا ملک چلانے کیلئے عمر جیسا فقیہ بھی امیر معاویہ کو بھیجتا ہے، نہ کہ بلال کو۔ محترم! معاف کرنا، وراثتی سیاست کے مرثیے و نوے کا نوں کو بھلے لگتے ہیں، پر ہیں بچگانہ باتیں۔ میں جانتا ہوں، آپ کو اس ظلم کے ماحول کے بدلنے کی اشد تمنا ہے۔ اس معاشرے کو مغربی رنگ نہ تو دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی دینا چاہئے۔ پر ایسے معاشروں کی چند اپنی منفرد خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ جیسے



باہمی ایثار، وفاداری اور وضع داری، ان کو زندہ کرو۔ چاہے دعوت والی جانی قربانی سے یا کسی علمی و فکری تحریک سے ممکن ہو۔ معاشرے کے ہر فرد کو یہ فکری محنت کرنا پڑے گی تاوقتیکہ ایک معتد بہ تعداد، مطلوبہ سوسائٹی کا چہرہ بن کر دکھادے۔

ایک مخصوص سطح تک یہ محنت کرنے بعد تمہیں، خدا کی طرف سے بہترین لیڈر انعام میں دیئے جائیں گے، چاہے وہ اورنگزیب جیسے متقی یا اکبر جیسے لبرل ہو کر 50 سال تک حکومت کر جائیں یا شیر شاہ سوری کی طرح 5 سال یا عمر بن عبدالعزیز کی طرح ڈھائی سال مگر ہر صورت تمہارا امن و معیشت سدھار جائیں گے۔ ہاں اگر یہ بنیادی محنت تم نہیں کرنا چاہتے تو پھر لگے رہو، منا بھائی! نوٹو شاپ سے تو کلاچی کو مری بنا سکتے ہو، حقیقت میں نہیں!

مگر کہانی ابھی باقی ہے۔ عمران خان اور طاہر القادری نے منہ سے کف اڑاتے ہوئے پاکستان میں نسل در نسل حکمرانی ختم کرنے کو نعرہ زن ہوئے ہیں۔ میڈیا یہ بیٹھی، کٹھ پتلی دانش نے تال میں تال ملائی اور نوجوان، خطیبانہ اداکاری سے مسحور ہونے لگے۔ لیکن میرا خیال ہے یہ ایک نان ایٹو ہے۔

اب یہ بچکانہ باتیں چھوڑ دینی چاہئیں کہ کوئی اپنے خاندان کو آگے لا رہا ہے۔ لانے دو بھی۔ ایک فطری چیز ہے۔ تم اسمبلی میں اپنی کارکردگی دکھاؤ۔ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ہمیں بھٹو اور نہرو جیسے لیڈر درکار ہیں۔ تو کیا اندرا گاندھی اور بے نظیر کو ان کے والد آگے نہیں لائے؟ عمران خان اگر اپنے خاندان کو آگے نہیں لاتا تو اس کی مرضی، بعض لوگوں کی نفسیات یہ ہوتی ہیں کہ ساری دنیا کو نوازیں گے مگر اپنے خاندان کو برابری کی سطح پر آتے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ صرف اپنے کزنز وغیرہ کو آگے نہیں لاتا، ورنہ بہنوں بچوں کے لئے اس کے اصول اور ہیں۔

میں اس میں ایک اضافہ کرنا چلوں، جمعیت علماء اسلام سندھ کے سیکرٹری جنرل علامہ ڈاکٹر خالد محمود سومرو کو شہید کر دیا گیا۔ صوبائی جنرل کنسل نے نوجوان راشد محمود سومرو پہ اعتماد کرتے ہوئے انہیں اپنے والد کے جانشین کے طور پہ صوبائی جماعت کا جنرل سیکرٹری چن لیا۔ اور اس کے ساتھ ہی جمعیت کی قیادت نے ان کی سیاسی تربیت بھی شروع کر دی۔

میں سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر خالد محمود سومرو جیسے سیاسی ورکر، اپنی ساری زندگی ایک سیاسی جماعت کو دیا کرتے ہیں۔ ان کی کوئی پنشن نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے نظریے پہ زندگی تنج دیا کرتے ہیں۔ اس جدوجہد میں ان کی فیملی لائف تباہ ہو جاتی ہے، بچے اپنے باپ کی توجہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ایسا ورکر جب ساری عمر جماعت کو دے کر دنیا سے رخصت ہوا اور جماعت اس کی فیملی کو بھول جائے، تو کیا یہ منطقی بات ہے؟



میرا تو خیال ہے کہ ایک اچھی جماعت کو اپنے ورکرز کی فیملی کا خیال ضرور رکھنا چاہئے، ہاں یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ میرٹ بھی ضرور ہوا اور باقی ورکرز کی حمایت بھی حاصل ہوتا کہ کسی اور کی حق تلفی نہ ہو۔

### اہل تشیع کا ساتھ دینا:

سپاہ صحابہ کے نوجوان، مولانا سے نالاں ہیں کہ انہوں نے اہل تشیع کو ایم ایم اے میں شامل کر کے دوبارہ زندہ کر دیا اور ان کی جدوجہد پہ پانی پھیر دیا۔

حیرت یہ ہے کہ مولانا کی اس مخالفت میں، جو کہ وہ مبینہ طور پر نظریاتی بنیادوں پر کیا کرتے ہیں، وہ مولانا کے ہر اس مخالف کو سپورٹ کرنے پہ تیار ہیں جو چاہے کتنا ہی اہل تشیع کا حامی ہو۔

اب تو اس موضوع پہ زیادہ خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں رہی کیونکہ جھنگ کے بلدیاتی الیکشن میں مولانا احمد لدھیانوی اور فیصل صالح حیات گروپ نے باہمی اتحاد کر کے سپاہ صحابہ کے سارے اصولی موقف زمین بوس کر دیے ہیں۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس معاملے پر اپنا ذاتی موقف پیش کروں اس لئے کہ میرے نزدیک پاکستان میں اہل تشیع کا جو عقیدہ ہے، اس کی بناء پر انہیں مسلمان نہیں سمجھا جاسکتا مگر یہ بھی پیش نظر رہے کہ بحیثیت مجموعی امت نے کبھی ان کو خارج از اسلام بھی قرار نہیں دیا۔

قادیانی حضرات کو غیر مسلم قرار دینے، اہل تشیع سمیت سب سنی جماعتیں ایک ساتھ جدوجہد کرتی رہی ہیں مگر چودہ سو سال میں، اس غیر معمولی اتحاد کے ساتھ، کبھی اہل تشیع کو کافر قرار دینے کی مہم نہیں چلی۔ معلوم ہوتا ہے کوئی ٹیکنیکل مسئلہ ضرور ہے کہ جمہور اسلاف نے اہل تشیع کو کافر قرار نہیں دیا۔

جہاں تک بات مولانا فضل الرحمن کی ہے تو وہ شروع دن سے اتحاد امت کے داعی ہیں اور شیعہ کافر ہم سے لا تعلق رہے ہیں، اس کیلئے انہوں نے اپنی سیاسی قربانی دی یعنی مولانا حق نواز تھنگوی کی سیٹ چھوڑ دی مگر مولانا کا مختلف العقیدہ لوگوں سے سیاسی اتحاد، بڑے مقاصد کو سامنے رکھ کر ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک مشترکہ مقصد کیلئے، گاندھی جیسے ہندو سے بھی اتحاد کیا جاتا رہا ہے اور آپ کے اسلاف کرتے رہے ہیں۔

میرے بچپن کی بات ہے، ایک مولوی صاحب سے کسی نے پوچھا کہ بھٹو کے خلاف آپ بریلویوں سے اتحاد کر رہے ہیں حالانکہ بریلوی کو آپ بد دین کہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ وضو کرنے کیلئے پاک پانی دیکھا جاتا ہے، آگ بجھانے کیلئے نہیں۔

میں بحیثیت سول انجینئر اپنی مثال دیتا ہوں کہ جب ملک میں پروفیشنلزم کے حقوق کی بات ہوگی تو میں میکینکل انجینئر کے ساتھ کھڑا ہوں گا اور جب صرف سول انجینئر کا معاملہ آئے گا تو ظاہر ہے کہ اس وقت



صرف اپنی کمیونٹی کے ساتھ ہی کھڑا ہوں گا۔ یعنی ہدف کے لحاظ سے اپنا مقام طے کروں گا۔ یہ سادہ بات، ہر ایک کو سمجھ لینا چاہئے۔

جمعیت علماء اسلام اہل تشیع کے بارے جو بھی عقیدہ رکھتی ہو، مگر ایک سیکولر جماعت ہونے کے ناطے، سب کے پر امن بقائے باہمی کے حق کو ماننی ہے اور ایک دینی جماعت ہونے کے ناطے، دینی جماعتوں کو ایک دوسرے کا حریف نہیں بلکہ حلیف دیکھنا چاہتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ساجد نقوی، ایک دینی جماعت کی قیادت کر رہے ہیں، چاہے اس کا عقیدہ آپ سے مختلف ہو۔

پس متحدہ مجلس عمل جس کے بنانے میں مولانا فضل الرحمن اور قاضی حسین احمد کی کاوشیں شامل ہیں، اس میں اگرچہ شیعہ، بریلوی، دیوبندی سب جمع تھے مگر مولانا نے اپنے بنیادی موقف کو بھی ہمیشہ برقرار رکھا اور اس کے اظہار میں کوئی لگپی نہیں رکھی۔

اگرچہ مولانا فضل الرحمن اور سپاہ صحابہ کی راہیں جدا تھیں، مگر ظاہر ہے کہ جھنگ میں مولانا کا کافی بڑا ووٹ بینک تھا کیونکہ وہاں پہلے الیکشن مولانا کی جماعت نے لڑا تھا۔ لیکن سپاہ صحابہ کی خاطر مولانا فضل الرحمن نے کبھی وہاں سے اپنا امیدوار کھڑا نہیں کیا تا کہ مذہبی ووٹ تقسیم نہ ہوں، ورنہ سپاہ صحابہ کے لئے جھنگ کی سیٹ لینا بہت مشکل ہو جاتا۔ اس کے برعکس سپاہ صحابہ نے ہمیشہ مولانا کے خلاف اپنا بندہ کھڑا کیا بلکہ ایم ایم اے دور میں جب مولانا وزیر اعلیٰ کے امیدوار تھے، تب بھی مولانا اعظم طارق نے عالم دین ہونے کے باوجود مولانا کو ووٹ نہیں دیا، جبکہ لیبرل عمران خان کا ووٹ مولانا فضل الرحمن کے حق میں تھا۔

مولانا سمیع الحق صاحب سے بھی مولانا کا اختلاف تھا اور ڈیرہ میں مولانا سمیع الحق کا کوئی ووٹ بینک نہیں، اس کے بالمقابل نوشہرہ کے چاروں طرف مولانا فضل الرحمن کا اچھا خاصا ووٹ بینک ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہ مولانا سمیع الحق صاحب ہمیشہ مولانا کو ہرانے اپنا ایک بندہ کھڑا کرتے تھے، مولانا فضل الرحمن نے کبھی نوشہرہ میں ان کے مقابل بندہ کھڑا نہیں کیا۔

ایم ایم اے کے دور میں اہل تشیع کے رمضان تو قیر کو مشیر کا درجہ دیا گیا۔ مولانا کے اس طرز عمل سے ڈیرہ شہر میں نہ صرف خونریزی کم ہوئی بلکہ اہل تشیع جو ڈیرہ چھوڑ چھوڑ کر جا رہے تھے، ان کو بھی امن کا سند یہ ملا۔ آخری بات یہ کہ مولانا نے کبھی شیعہ اور سنی بنیاد پہ ووٹ نہیں مانگے، نہ ہی اس کی حوصلہ افزائی کی ہے تو سپاہ صحابہ کو مولانا پہ کیا حق ہے کہ ان سے اس بارے باز پرس کریں؟ باز پرس تو اپنے لیڈروں سے کریں جن کا ساری زندگی کا مشن، ایک بلدیاتی سیٹ کی نذر ہو گیا۔



## باب سوم: دھاندلی، وراثتی قیادت اور احتساب

ابن الوقتوں کا ایک ٹولہ اٹھا ہے جو پاکستان کے امن کو تباہ کرنے کیلئے، وہ پاپور اصطلاحات استعمال کر رہا ہے جو عوام میں مقبول ہیں..... الیکشن میں دھاندلی ہوئی ہے، نسل در نسل ایک ہی خاندان پاکستان پہ مسلط ہے اور کرپٹ حکمرانوں کا احتساب کرنا ضروری ہے۔

یہ باتیں کانوں کو بھلی لگتی ہیں، ان میں کافی حد تک حقیقت بھی ہے۔ لیکن جو لوگ یہ نعرے لیکر اٹھے ہیں، ان کو دیکھ کر وہی محاورہ یاد آتا ہے کہ چھانچ، چھانچ کو بولے تم میں سوراخ ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے ان موضوعات پر ایک تفصیلی گفتگو کی جائے تاکہ خیالی دنیا کی بجائے، زمینی حقائق پر نظر جائے۔

دھاندلی: انتخابات میں دھاندلی کیا ہے؟ دھن، دھونس اور دھوکے سے لوگوں کی بے لاگ رائے کو بزور بدلنا۔ ووٹ کی پرچی میں اول بدل تو انتخابی دھاندلی کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ عوام کے سامنے جانے والے ہر امیدوار کو یکساں مواقع فراہم کئے جاتے لیکن ہوتا یوں ہے کہ عوام کے دل یا شکم ہی نہیں، دماغ سے بھی کھلواڑ کیا جاتا ہے۔ کیا یہ دھاندلی نہیں؟

دل کو ”دھونس“ سے، شکم کو ”دھن“ سے اور دماغ کو ”دھوکے“ سے خریدنا، بہکایا یا ڈرایا جائے تو یہ بھی دھاندلی ہوتی ہے جناب۔ ”دھونس“ صرف جان اور عزت کی ہی نہیں، ایمان کی بھی دی جاتی ہے کہ فلاں کو ووٹ دینا، جنت اور فلاں کو دینا جہنم میں لے جائیگا۔ پہلے گلی کوچوں میں سیاسی جماعتوں کے غنڈے، لاکارتے پھرتے تھے اور ان کی گالی گلوچ کے ڈر سے، شریف امیدوار کیلئے کوئی جھنڈا لگانے کو تیار نہ ہوتا۔ آج سوشل میڈیا کی دھونس کی بنا پر کوئی اپنے ضمیر کی آواز بلند نہیں کر سکتا، تو یہ بھی دھاندلی کی ہی شکل ہے۔

”دھن“ کا مطلب، ووٹ خریدنا ہی نہیں ہوتا، بلکہ دھن کی بنیاد پر ایک امیدوار کے پاس رسائی کا موقع ہے جبکہ دوسرا اس سے محروم ہے تو کیا جمہوریت میں یہ دھاندلی نہیں؟ ایک وقت تھا کہ ایک امیر امیدوار کے پاس گاڑیوں کا بیڑا ہے، جبکہ دوسرا اس سے محروم ہے۔ آج کل رسائی کیلئے میڈیا ہے۔ اب ایک کے پاس دھن ہے تو میڈیا میں ہر طرف اس کے اشتہار چل رہے ہیں، دوسروں کو دھن نہ ہونے کی وجہ سے پس منظر میں جانا پڑتا ہے تو کیا الیکشن کمیشن نوٹس لے گا کہ سب امیدواروں کو یکساں مواقع ملیں؟

لوگوں کے ذہن دھوکے سے بدلنا بھی تو دھاندلی ہے۔ میڈیا کا ایسے استعمال کرنا کہ کسی کے پلائیڈ انٹرویو دکھا کر اسے حاضر جواب ثابت کرنا اور دوسرے کو اینٹکے کے ذریعے، غیر متعلق سوالوں میں الجھا کر، کنفیوز دکھانا۔ یہ بھی تو دھاندلی ہے جناب!



آرمی، ایک جمہوری ادارہ ہے، نہ ہونا چاہیے۔ اسلئے اظہار رائے ایک بنیادی حق ہونے کے باوجود، فوج کے حاضر سردس افران کو سیاسی تہروں سے روکا جاتا ہے۔ دیگر قباحتوں کے علاوہ اس میں یہ بھی ہے کہ اگر ایک سینئر افران کی امیدوار کی حمایت کا اظہار کرے تو جو نیز بھی پابند ہو جائیں گے (ڈسپلن کا تقاضہ ہے) اب اگر آرمی افران نے کھلے بندوں کسی پارٹی کیلئے مہم چلائی تو کیا یہ دھاندلی نہیں ہے؟ کیا نئی گالہ میں حاضر سردس لوگ، پریزنٹیشن نہیں دیتے رہے؟

اتنی نہ بڑھا پا کئی داماں کی حکایت دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

یہاں جدہ میں ہمارے انڈین ہسائے الیکٹرانک وونگ کی کرامت بھی بتاتے ہیں کہ کیونکر مسلمان نام کا ووٹ، بدل کر مودی کو جا پڑتا تھا۔ انگوٹھوں کے نشان تو معمولی سی بات ہے، اگر الیکٹرانک وونگ بھی شروع ہو گئی تو بھی "فرشتوں" کو مداخلت سے کوئی نہیں روک سکتا بلکہ شاید ان کا کام زیادہ آسان ہو جائے گا۔ کمپیوٹر سافٹ ویئر بھی انسان ہی بتاتے ہیں جناب!

دھاندلی صرف ووٹ کے منگر پرنٹ سے نہیں مانی جاسکتی ہے، جناب!

تحریک انصاف کو اوپر لانے کیلئے (جہاں تک لانے کا بیج تھا) منظم دھاندلی کی گئی، اس دھاندلی میں قوم کے ساتھ جذباتی بلیک میلنگ کا گرم بھی استعمال کیا گیا۔ عمران خان خود بھی اعلیٰ درجے کے اداکار ہیں، مگر کہانی کا سکرپٹ لکھنے والوں نے بھی کمال کر دیا۔ کبھی تیس منٹ کے بیچ سے وہ چھلانگ لگا کر، اور کبھی کسی کو تھپڑ مار کر، اینگری بنک مین کا کردار پوز کرتے ہوئے، ہیرو پرست قوم کو متاثر کر رہے ہیں۔ مگر کمال کا ڈرامہ انکیشن کی بالکل آخری رات کیا گیا جس کی وجہ سے لاکھوں ووٹ تحریک انصاف کو پڑ گئے۔ مجھے بہر حال، اس وقوے پر کچھ اشکالات ہیں۔

یہ انکیشن کمپین بند ہونے کے آخری لمحات تھے۔ لاہور ہی اس ڈرامہ کیلئے موزوں مقام تھا۔ چنانچہ بڑے مناسب وقت پہ عمران خان صاحب لفظ سے گر کر ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ راستے میں جناح ہسپتال پڑتا تھا لیکن وہ سیدھے شوکت خانم ہسپتال کی تیسری منزل پر جا پہنچے جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ لوگ اور حامد میر کی میروں سمیت ہسپتال کے باہر براجمان ہو گئے۔ اس جذباتی فضاء میں عمران خان ایک ویڈیو بیان ریکارڈ کرواتے ہیں۔ گردن میں پلستر ڈالے دہائی دے رہے ہیں "نوجوانو! میں نے پاکستان پہ جان واردی ہے، آگے آپ کا کام ہے" لاکھوں ووٹ بڑھانے کو یہی سکرپٹ کافی تھا۔

ایک قومی شخصیت کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا، جائے وقوعہ کو سیل کیا جانا چاہئے تھا۔ لفظ پہ لگے خون کے نمونے لینے ضروری تھے۔ لفظ آپریٹر سمیت جن لوگوں کے کو لہے لگنے سے عمران خان گرے تھے، ان



کے انٹرویو اور سوال و جواب ریکارڈ ہونے چاہئے تھے، وہ لفظ تو قومی اثاثہ بن کر میوزیم میں ہوتا۔ مگر یہاں تو رات گئی، بات گئی۔ نہ ٹیٹ، رزلٹ نہ ایکسپریس۔ بس بند کرے سے عمران خان کے بیان پہ بیان اور ساتھ پاکستانی ٹی شرٹ میں ملبوس ہسپتال کا ڈائریکٹر، سبحان اللہ۔ جس طرح نواز شریف کیلئے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اپنے دل کے آپریشن کی پوری تفصیل قوم کے سامنے رکھیں، ویسے ہی عمران خان کے اس وقوع کو بھی بے نظیر کے وقوع کی طرح نامکمل تفتیش کے شکار نہیں ہونا چاہئے اور پوری تفصیل سامنے آنا چاہیے، ورنہ ہم اسے ڈرامہ سمجھنے پہ مجبور ہوں گے۔

تو جناب یہ بھی دھاندلی کی ایک زریں اور نایاب قسم ہے، جس سے قوم کو الو بنایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود میں عرض کروں گا کہ جو ہوا، سو ہوا۔ سیاسی لیڈروں کو دھاندلی کا ماتم چھوڑ دینا چاہیے۔ لیڈران کرام! عوام پر رحم کرو۔ ان کا کام تھا تم کو ووٹ دینا، دے دیا۔ آگے تمہارا بھی کچھ کام ہے۔ اگر یہ ووٹ ایجنسیوں نے کسی دوسری پارٹی کی خاطر چرایا ہے تو جو گیدڑ سنبھلی، اس پارٹی نے استعمال کی ہے تم بھی کرو۔ کیا ساری عمر عوام ہی تمہارے ساتھ سڑکوں پر خوار ہوگی۔ سیاسی بصیرت یا حکمت بھی کوئی چیز ہے۔ خود بھی کچھ کرونا!

آخر بے نظیر بھٹو کے ساتھ بھی تو بدترین دھاندلی کر کے نواز شریف کو بھاری اکثریت دلائی گئی تھی۔ کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ قومی اسمبلی میں بے نظیر کے ہوتے ہوئے پیپلز پارٹی کی چند سیٹیں ہوں۔ مگر چونکہ بے نظیر، ایک لیڈر تھی تو اس نے چیخ و پکار اور رونے دھونے پر ٹائم ضائع نہیں کیا بلکہ ایسی گیم کھیلی کہ انہی 10 سیٹوں کے ساتھ، پانسہ الٹ دیا۔ جولایر 30 سیٹوں کے ساتھ بھی عوام کو المد المدد و پکارتا رہے، وہ لیڈر کہلانے کا حقدار ہی نہیں ہوتا۔

### تحریک انصاف کا بیج:

موجودہ جمہوریت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ ووٹ کی اکثریت کی بناء پر حکومت نہیں بنا کرتی۔ مثلاً کسی ملک کی ٹوٹل 10 سیٹیں اور 2 پارٹیاں ہیں۔ ایک پارٹی کے پاس کل امیدوار ہی 6 ہیں، مگر یہ 6 امیدوار صرف 10 ووٹ کے فرق سے پہلے نمبر پر آ گئے۔ اب ووٹ دوسری پارٹی کے زیادہ ہیں، مگر حکومت چھوٹی پارٹی کا حق ہے۔ خیر، یہ جمہوریت چلے گی تو خود کو ٹھیک کرے گی۔

پارٹیوں کو صوبائی سطح پر دینے میں، فرشتوں نے جس عرق ریزی سے کام کیا، ہمارے جیسے عام اذہان وہاں تک رسائی نہیں رکھتے۔ مگر اپنی تجسس طبیعت کے ہاتھوں، ایک سراغ میں نے پایا۔



میں آپ کو اپنے صوبائی حلقہ، یعنی ڈیرہ اسماعیل خان سٹی میں 11 مئی 2013ء کے گرم دن کی واردات سناؤں گا۔ ڈیرہ میں مولانا نے بڑی زبردست منصوبہ بندی کی ہوئی تھی، پانچوں صوبائی حلقوں میں اس کا مضبوط پینل تھا۔ ڈیرہ سٹی میں مولانا لطف الرحمن امیدوار تھا۔ تقریباً سارے پرانے سیاسی چہرے اس کیساتھ مل چکے تھے۔ بریلوی و دوٹوں کی خاطر، گولڑہ اور تونسہ کی گدی نے بھی مولانا کی حمایت کا اعلان کیا تھا میاں خیل خاندان سے ذاتی رنجش تھی۔ اس کو تحریک انصاف سے دور رکھنے کیلئے نواز شریف کا ٹکٹ قیہار کو دیا گیا۔ تحریک انصاف کے پاس گویا ایک ہی صوبائی امیدوار تھا، علی امین۔ آپ اندازہ لگائیں، ایک طرف لطف الرحمن جو ممکنہ وزیر اعلیٰ پورٹریٹ ہو چکا تھا، دوسری طرف علی امین جیسا غیر معروف لابلای نو جوان جس کی شہرت ایک کبوتر بازی تھی۔

مولانا لطف الرحمن نے اپنے ایک بااعتماد کارکن، ملک قیوم حسام کے ذریعے بے دریغ ٹرانسفارمر بانٹے تھے، لوگ متاثر تھے۔ ان حالات میں ہمارا خیال تھا، 30 ہزار ووٹ پول ہوں گے، جس میں 20 ہزار مولانا کے اور 6 ہزار علی امین کے ہوں گے (وہ بھی سپاہ صحابہ کی وجہ سے)

اب یوں ہوا کہ الیکشن سے ایک ماہ قبل ملک قیوم حسام آزاد امیدوار کے طور پر مولانا کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ کیوں؟ کوئی خاص وجہ بھی نہیں بنانا تھا تاہم ایک تو وہ غیر اہم تھا، دوسرے مولانا لطف الرحمن کا یہ اعتماد تھا کہ وہ قیوم حسام کو گھر کا آدمی سمجھتا تھا کہ جب کہوں گا وہ دستبردار ہو جائے گا۔ ہم یہ سمجھے، یہ مولانا ہی کی کوئی چال ہے۔ ہمارا یہ خیال تھا کہ چونکہ یہ مولانا کے گھر کا حلقہ ہے تو تحریک انصاف کو بدترین شکست دینے کے لئے مولانا بڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔

اپنے تجسس کے پیش نظر میں نے دو پولنگ سٹیشن ٹارگٹ کئے، جہاں مولانا دھاندلی کر سکتا تھا۔ ایک علی امین کا گڑھ، یعنی محلہ علی زئی اور دوسرا مولانا کا گڑھ یعنی دین پور کا محلہ۔ یاد رہے کہ اس دوران ملک قیوم کو کوئی سیریس نہیں لے رہا تھا (ایجنسیاں آپ کو گلوبٹ کی طرف متوجہ رکھتے ہوئے، اپنا کام دکھاتی ہیں)

خیر پولنگ شروع ہوئی۔ محلہ علی زئی میں یہ تیزی تھی کہ دوپہر تک ہزار سے زیادہ ووٹ پول ہوئے۔ ادھر دین پور میں عجیب صورت حال۔ صبح پتہ چلا، سٹیشن بدل گیا۔ 9 بجے تک پریزائیڈنگ افسر نہیں آیا۔ وہ آیا تو ووٹ کی پرچیاں میسر نہیں تھیں۔ گرمی کے مارے، ٹشل کاک برقعے والی عورتیں واپس ہو گئیں۔ دس بجے پولنگ شروع ہوئی تو پولنگ سٹاف، ایک ایک شناختی کارڈ چیک کرنے میں کافی ٹائم لگاتا رہا۔ یہاں ظہر تک نوٹس 200 ووٹ پول ہوئے (جب باقی جگہوں سے ”اوکے“ کی رپورٹ مل گئی تو یہاں بھی



تیزی آگئی، مگر ظاہر کہ علی امین کی لیڈ ہو چکی تھی)

قصہ مختصر! صوبائی نتیجہ یہ تھا کہ آزاد امیدوار (جو چند روز قبل جمعیت کا بندہ تھا) کے 11 ہزار ووٹ، مولانا لطف الرحمن کے 12 ہزار اور علی امین کے 13 ہزار ووٹ نکلے۔ یہ واحد حدیث تھی جو ڈیرہ سے تحریک انصاف کو ملی۔ مجھے کافی حد تک شک ہے کہ مولانا لطف الرحمن کو بھی اس پیکیج کی پیشگی خبر تھی کہ اس لئے تو وہ دو صوبائی حلقوں سے امیدوار ہوا تھا (دوسرے حلقے سے جیت بھی گیا)

جمہوریت کو انہی دھاندلیوں سے گذر کر آگے بڑھنا ہے۔ چور چائے شور بھی اسی جمہوری تماشے کا حصہ ہے۔ اس لئے ہر ذی شعور آدمی نے عمران خان کو یہی مشورہ دیا کہ مرکزی حکومت اور صوبائی حکومت کو کام کرنے دے اور خود قومی اسمبلی کی آئین سازی میں حصہ لیں جو آپ کا کام ہے۔ فرض کریں نواز شریف کی اصلی سیٹیں صرف 20 ہیں۔ تو کیا ہوا؟ عمران خان نے ملکی ترقی کے نام پر ایک ایسے حکمران کی بھی پر جوش حمایت کی تھی جس کی ایک سیٹ بھی نہ تھی، تو اب کیوں اتنا دوا دویلا؟ اگر نواز شریف، ملک لوٹ کر لے جائے گا تو عوام پہلے ہی 60 سال سے عادی ہیں، ایک بار پھر سہی۔ مگر کیا عمران کو کرپشن کی فکر ہے؟ میں نہیں سمجھتا، جن چوہدری برادران کی کرپشن کے کاغذات عمران لہر کر دکھایا کرتا تھا ان کو تو گلے لگایا ہوا ہے۔ مگر لگتا یوں ہے کہ پیکیج عطا کرنے والے پاکستان کے آئین میں جو جو ہری تبدیلیاں کروانا چاہتے تھے، وہ وفاقی حکومت سے ہی ممکن تھیں نہ کہ صوبائی سے اور عمران خان کو شاید شک یہ اسی کا دیا گیا تھا، جس میں ناکامی پر، مالکان اپنا راس المال واپس بھی لے سکتے تھے۔ شاید اس کنٹریکٹ کو بچانے اور کسی کو کارکردگی دکھانے ہی کیلئے ساری چیخ و پکار ہو رہی ہے ورنہ دھرنے کے دوران کنٹینر پہ کھڑے ہو کر اپنے مستقبل کے فنانس منسٹر کیلئے ایک قادیانی کے نام کا اعلان کرنے کی اور کیا تک تھی؟

### نسل در نسل حکمرانی:

چھ عشروں سے، اس ملک میں، جمہوریت دشمن ماتم نگاروں نے شام غریباں جمائی ہوئی ہے، یہ بلانوش سیاہ فروش، لباس سے نہیں پہچانے جاسکتے کیونکہ روایتی سیاہ پوش نہیں ہوا کرتے البتہ ”سیاہ پاپوش“ کے دلدادہ ضرور ہوتے ہیں۔ اپنے عشرت کدوں کے چرمی صوفوں پہ مچلتے عوام کے غمخوار ماتم نگاروں کا تکیہ کلام ہے کہ ”سیاست زرداروں کا کھیل ہے، یہ اربوں روپے کا سٹہ صرف کرپشن سے ہی ممکن ہے“ یہ آدھا جج صرف سیاسی لیڈروں کو شیطان ثابت کرنے کا منتر ہے حالانکہ سیاستدان، مال حرام سے ہی سہی، مگر بہر حال قریہ و کوچہ کی خاک چھان کر سیاسی پارٹی بناتے ہیں۔ مگر صاحبو! خدا لگتی کہیے، جنرل اسلم بیک اور



جنرل پرویز مشرف نے ریٹائر ہوتے ہی گھر بیٹھے قومی سیاسی پارٹیاں کیا آبائی جاگیروں کے مل پہ بنالیں؟ اس ”عجزہ کن فیکون“ پہ سیاہ فرودشوں کا قلم کیوں نہیں اٹھتا؟ یا پھر اس دربار میں فرشتوں کے پر جلتے ہیں؟ عوام کو جمہوریت سے برگشتہ کرنے، ہر مرثیہ کا شیب کا مصرعہ یوں ہوتا ہے ”پاکستان کی ہر سیاسی پارٹی، چند خاندانوں کی نسل در نسل مافیا ہے جو غریب عوام کا خون چوسنے میں مشغول ہیں“ اس سچ نما جھوٹ کو اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ عوام کے دل میں راسخ کر دیا گیا، ہمارا آج کا موضوع یہی ہے۔

دیکھئے! پاکستان کی جمہوریت کا مقابلہ، یورپ سے مت کیجئے مگر اپنے پڑوسی ملک سے ضرور کیجئے جسے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے۔ انڈیا کی سیاست کا تجزیہ کریں تو معلوم ہو کہ ہمارا عوامی شعور، انڈیا سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ وہاں ابھی تک تقسیم کے وقت کی پارٹیاں اور لیڈر مارکیٹ میں ہیں جبکہ یہاں کی نئی نسل دولتانے، گورمانی، مڈوٹ کو جانتی بھی نہیں۔ ہماری ساری موجودہ سیاسی قیادت موجودہ زمانے کی نسل ہے۔ ذرا نام تو لیجئے کہ کونسی جماعت کے لیڈر، نسلوں سے مسلط ہیں؟

سوقیانہ لفظ کی معافی چاہتا ہوں مگر لوہار کا بیٹا، تیسری بار وزیراعظم بن رہا ہے تو کیا یہ آبائی تسلط ہے؟ سیاہ فرودشوں کو ”بھٹو“ خاندان سے خاص چو ہے۔ کیا ان کو نہیں معلوم کہ بھٹو کی نسل کو اڈو دھے نکل چکے اور زرداری، بھٹو سے الگ ایک خاندان ہے جو صدیوں پرانا جاگیر دار بہر حال نہیں ہے۔

کبھی اسفندیار ولی کو آڑے ہاتھوں لیا جاتا ہے کہ اس بیچارے نے چونکہ باچا خان کے گھر پیدا ہونے کی غلطی کر لی ہے تو اس کا کام صرف ملکی کرنا ہونا چاہئے نہ کہ لیڈری کرنا۔ کیونکہ اس سے خاندانی حکمرانی کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ کیوں عوام سے تھاق چھپاتے ہو کہ باچا خان نے تو سیاسی پارٹی بنائی ہی نہ تھی (خدائی خدمتگار تنظیم بنائی تھی جو ایک سماجی تنظیم تھی) (باچا خان کا بیٹا ولی خان، پہلے جس سیاسی جماعت ”نیپ“ میں شامل تھا اس کا سربراہ شیر باز مزاری تھا۔ مزید اگر ولی خان نے اپنی پارٹی میں اسفندیار کو پہلے سے اپنا ولی عہد نامزد کیا ہوتا تو کیا یکم نیم اسے قبضہ گروپ قرار دیتی؟ اسی سے تو ثابت ہوا کہ اسفندیار کو وراثت میں نہیں میرٹ پر پارٹی ملی ہے۔

پھر مولانا فضل الرحمن اور مفتی محمود کو نسل قیادت کے کونے دئے جاتے ہیں حالانکہ اجرتی ماتم نگار اچھی طرح جانتے ہیں کہ جمعیت کے امیر حضرت درخواستی صاحب تھے۔ مولانا مفتی محمود تو صرف جنرل سیکرٹری تھے۔ کیا جنرل سیکرٹری وراثت سے بنا کرتے ہیں؟ مفتی صاحب کے بعد شورٹی نے مولانا فضل الرحمن کو جنرل سیکرٹری بنایا تھا نہ کہ امیر۔ کافی عرصہ بطور سیکرٹری رہنے کے بعد وہ مولانا عبدالکریم قریشی کی وفات کے بعد امیر منتخب ہوئے تھے۔ اب فضل الرحمن کے بیٹے کے پاس بھلا کون سا پارٹی عہدہ ہے؟



فرض کر لیجئے کہ سیاپہ فروش ٹھیک کہتے ہیں کہ موجودہ جمہوری سیاسی پارٹیوں میں نسل در نسل، اقتدار منتقل ہو رہا ہے تو بھائی! یہ سیاسی جماعت کے کارکنوں کا اندرونی مسئلہ ہے نہ کہ آپکا۔ کسی سیاسی جماعت میں شامل ہونے کیلئے کوئی ویزا ضروری نہیں، نہ ہی ٹکٹے کیلئے ایگریگیشن کا ڈنٹر ہوتا ہے۔ ہر سیاسی کارکن، اپنی خوشی سے ایک جماعت چنتا ہے، کسی کو کوئی بھی سیاسی جماعت اچھی نہیں لگتی تو پاکستان کے آئین نے اسے الگ سیاسی جماعت بنانے سے روکا نہیں ہے۔

آدھے سچ سے پورا جھوٹ بہتر ہوتا ہے۔ جی ہاں، اس ملک میں نسلی اقتدار بھی چلتا ہے، جنرل ایوب کا بیٹا اور اب پوتا بھی ممبر قومی اسمبلی ہے، جنرل ضیا کا بیٹا بھی اکثر وفاقی وزیر بن جایا کرتا ہے لیکن بھائی! تصویر کا یہ رخ دکھانے سے اجرتی ماتم گذاروں کے قلم کا پتہ ہے، دل لرزاتے ہیں اور معدہ دہائی دیتا ہے۔ ویسے اس ملک کو خاندانی سیاست کے چنگل سے نکالنے، ماضی قریب میں دونجات دہندہ نمودار ہوئے تھے، ایک نے کینیڈا سے نازل ہوتے ہی پہلی پریس کانفرنس میں یہ اہتمام ضرور کیا کہ اس کے دونوں فرزند کراما کا تین کی طرح کندھوں سے لگے کھڑے رہیں۔ دوسرا بہ منت تمام اپنے سپوتوں کو انگلینڈ سے لاکر، کنٹینر پہ چڑھالایا تھا۔ چونکہ بچوں کی انگریز ماں کو یہ تماشا منظور نہ تھا، تو ہمارا مسیحا اپنے وسیع بنگلے میں ایک بار پھر تنہائیوں کا شکار ہو کر خاندانی سیاست کو کونے لگا۔ قسمت نے یاد دہی کی، کچھ دن کو بجلی چمکی، چار کتوں کے علاوہ ایک آدم زاد کی ہم نشینی میسر نہ آئی۔ گویا ایک خاندان بنا تو شہنشاہ جہانگیر کے اس شعر کی تصویر بن گئے کہ ہند کو نور جہان کے گال کے تل اور ایک جامِ سئے کے بدلے دان کر دیا (یہاں ”ہند“ کی جگہ ”پختونخوا“، ذال دیجئے) (یہ الگ بات کہ نئی ملکہ بھی بوجھ چھوڑ گئی ورنہ پارٹی بھی اس کے حوالے ہوتا تھی) خاندانی سیاست کو کونے والے تیسرے کردار یعنی لال حویلی کے کلین کا تذکرہ نہیں کروں گا جو پنڈی کی ہر چھوٹی بڑی سیٹ پہ اپنے بھتیجے کو نامزد کر دیا کرتا ہے۔ بال بچوں اور کارکنوں سے یکساں محروم، اس عظیم قومی راہنما کی فطرت، نہ نوری ہے نہ تاری بلکہ صرف ”خاکی“ ہے۔

یہاں ایک روحانی نکتے کی طرف اشارہ کروں گا۔ آج کی اس بازاری سیاست میں جب خاص طور پر نون لیگ اور پی ٹی آئی کے شرفاء ایک دوسرے کے راہنماؤں کو نشانہ دشنام بنانا عبادت سمجھتے ہیں، وہیں دونوں پارٹیوں میں بعض مخصوص لیڈر ایسے بھی ہیں جنہیں بہر جانب یکساں احترام حاصل ہے۔ مثلاً نون لیگ کے ہارون اختر اور پی ٹی آئی کے اسد عمر، کیوں؟ شاید اس لئے کہ دونوں کے مرحوم باپاجان، اپنے کندھوں پہ چار ستاروں کا وزن اٹھائے تھے۔ وہی ستارے جن کو زانچہ دان حضرات، مقدر کے



ستارے کہتے ہیں۔ اب فرمائیے! کیا واقعی پاکستان میں سب در سب حکمرانی چل رہی ہے؟  
پاکستان کا جمہوری نظام، آئینڈیل نہ سہی مگر ان گنت مسائل میں پھنسی، بے قابو آبادی کو جمہوری نظام سے بدظن کرنا، نوجوانوں کے اعصاب تباہ کرنے کی سازش ہے۔

یاد رکھئے! پاکستان ہی تو مواقع سے بھرپور سرزمین ہے۔ کسی کی ہمت پر کشا ہو تو آسمان زیر پر لایا جاسکتا ہے، ہمت کے ساتھ کچھ بصیرت بھی میسر ہو اور ”ہما“ کی سرپرستی مل جائے تو ٹھیکیدار ریاض سے ملک ریاض بننے کا راستہ ہر ایک کیلئے کھلا ہے۔ سیاہ فروشوں کی طرف دھیان نہ دیجئے، اپنے آپ کو کسی قابل بنائیے۔ آخر اسی ملک میں ہی تو یہ ممکن ہے کہ جھنگ کی میونسپل کمیٹی کے کلرک کا بیٹا، کینیڈا سے پاکستان نامی ریاست کو پہچانے، طیارہ چارٹر کر کے آتا ہے اور میانوالی کے ایک معمولی زراعت افسر کا بیٹا، دن دھاڑے 20 کروڑ عوام کی پارلیمنٹ پر دھاوا بول دیتا ہے۔

آخری بات، اس ملک کے نوجوانوں سے کہوں گا اس ملک کا۔ جاگیردار طبقہ، صنعتکار طبقے سیاسی دن پیچھے رہ گیا تھا جب پہلی شوگر مل نے گنے کے ریٹ طے کئے تھے۔ آج صنعتکار طبقہ بھی اپنی بلا شرکت غیرے حیثیت کھو کر پروفیشنل نوجوانوں کا مہونہ منت ہو چکا ہے کہ آئی ٹی ایکسپٹ کے بغیر فیکٹری نہیں چلائی جاسکتی۔ اس وقت اس ملک کو دی آئی ٹی طبقہ، تعلیم یافتہ اور مہنہ مند نوجوان ہیں، جن سے کسی طور صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

سیاہ فروشوں کے مرثیوں پر توجہ دینے کی بجائے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو ترقی دیجئے، یقین رکھئے، صرف یہی ملک ہے جو باصلاحیت اور پر عزم نوجوانوں کے لئے دنیا میں جنت ہے۔

Rights of e-Publications reserved by  
Team OFFICIAL JAMIA  
Official Jamiat  
JUIAnswerBack

### احتساب.....!!!!

اب اگلی بات یہ کہ میں احتساب نامی ڈرامے کے حق میں نہیں ہوں کیونکہ پاکستان کی حکومت اور اپوزیشن، احتساب کرنا چاہتی ہی نہیں، یہ جو ”جوائنٹ انویسٹی گیشن کمیٹی“ بنانے کے ڈول ڈالے جاتے ہیں، کس کو بیوقوف بنانے؟ آپ خود سوچئے کہ اسحاق ڈار نے اگر کہا تھا کہ نواز شریف نے منی لانڈرنگ کی تھی تو اسے جبری اعتراف قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح جاوید ہاشمی نے اگر کہا تھا کہ عمران خان جرنیلوں کے سہارے جمہوریت کی بساط لپیٹنا چاہتا تھا تو اسے الزام قرار دیا جاسکتا ہے۔

مگر پرویز مشرف نے تو خود اپنی کتاب میں لکھا کہ ہم نے کئی پاکستانی امریکہ کے حوالے کئے جن کے بدلے ڈالر لئے۔ خدا کے بندو! ان پاکستانیوں کے بھی تو ماں باپ بیوی بچے ہوں گے جن کی آہیں سننے والا



کوئی نہیں۔ اس آدمی کے بیان حلفی پر اگر کوئی ”جے آئی ٹی“ نہیں بنتی تو ہمیں ”ان کی مجبوریوں کا اندازہ ہے مگر سوشل میڈیا کے وطن دوست، غریبوں کے ہمدرد، بڑھے لکھے انقلابیوں کے منہ پر کیوں تالے لگے ہیں؟ پاکستان میں اگر احتساب کرنا ضروری ہی ٹھہرے تو پہلا سوال یہی ہوگا کہ شروعات کہاں سے کی جائیں؟ آئیے اس پہ سوچتے ہیں:

عوام کا پیسہ فلاں فلاں نے لوٹا۔ یہ خبر سب سے پہلے کون دیتا ہے؟ ظاہر ہے کہ میڈیا۔ تو پہلے میڈیا کو قابل اعتماد بنائیں کیونکہ اس نے عوام کی ذہن سازی کرنا ہے۔ یہاں صفائی ہوگی تو خبر کا وزن بنے گا اور عوامی پریشر میں بھی اضافہ ہوگا۔

اس لئے میرے خیال میں سب سے پہلے صحافیوں، تجزیہ کاروں اور اسکروں کا احتساب ہو۔ یہ کل درجن بھر لوگ ہیں، ان کا معیار زندگی، ذرائع آمدنی اور ٹیکس کا پتہ کرنے دو ہفتے کافی ہیں۔

یہاں تک تو شاید آپ میرے ساتھ متفق ہوں۔ اب اگلا سوال کہ ان کا احتساب کون سا پاک ڈاڑھ کرے گا جس کے تفتیشی نتائج پہ قوم کو اعتماد ہو؟ مزید یہ کہ جب تک ان کا معاملہ صاف نہیں ہوتا، اس دوران قوم کو اس کا رروائی سے لمحہ بہ لمحہ آگاہ رکھنے، کون سا دانشور، جمع بیک میوزک کے دستیاب ہوگا؟ اور اس کا رروائی پر گردن کی رگیں پھلائے، ”حقیقی“ تجزیہ کون کرے گا؟..... یہیں پانی مرنے ہے۔

لہذا اپنا اور قوم کا وقت، انرجی اور پیسہ ضائع کرنے کی بجائے، پارلیمانی نظام کو چلنے دو۔ احتجاج کرو، دھرنے دو، مگر پارلیمنٹ میں قانون سازی کو بھی وقت دوتا کہ ملک کی گاڑی آگے چلے۔

زرداری نے تو پھر بھی کچھ قانون سازی کر لی تھی، اس پارلیمنٹ میں تو تین سال بعد یہی طے ہوا کہ چلو پارلیمنٹ جعلی نہیں ہے، مگر حکمران ابھی تک جعلی ہے، قانون سازی کون کرے گا؟ جہاں تک میرے ناقص ذہن کا تعلق ہے تو میں تو کرپشن کے احتساب نہیں، بلکہ اس کے سد باب کا حامی ہوں۔ میرا موقف بھی سنتے جائیے۔

**احتساب نہیں، سد باب کیجئے، حضور!**

چھوٹا منہ بڑی بات سہی، مگر یہ عاجز پاکستان کے اصل پالیسی سازوں سے عرض گزار ہے کہ اگر آپ اس ملک کی ترقی چاہتے ہیں تو فی الحال احتساب کا معاملہ بند کر دیجئے۔ سب جانتے ہیں کہ اس ملک کے اصل پالیسی ساز، زرداری یا نواز شریف جیسے لوگ نہیں۔ جو شخص خود



وزیر اعظم ہوتے ہوئے بھی یہ پوچھنے کی جرات نہیں کر پاتا کہ اسے ہتھکڑی پہنا کر جہاز کی سیٹ سے کیوں کر باندھا گیا تھا؟ یادہ جو صدر پاکستان ہوتے ہوئے بھی اپنی بیوی کے قتل کی تفتیش کے لئے سکاٹ لینڈ یا رڈ کو بلانے کا مجاز نہیں ٹھہرا تھا۔ ان لوگوں کو کون پالیسی ساز مانتا ہے بھائی۔ اصل پالیسی ساز تو وہ ایما پڑ ہے جس کی انگلی کے آسرے پر ”ایاک نعبد وایاک نستعین“ فیم لیڈر نے ایڈوٹ کر کیا تھا۔

جناب عالی! ہمیں احتساب کے نالک سے خوف آتا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ کہ قوم کو احتساب کرنے والوں کی نیت پر اعتبار نہیں۔ عوامی سرگوشیوں پہ جائیں تو جس ادارے کو پوری دنیا میں بالا دست طبقات (یعنی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں) کا آخری محافظ گردانا جاتا ہے، اسے ہمارے عوام ان مذکورہ طبقات کا بھی مائی باپ سمجھتے ہیں۔

اور یہ صورتحال میڈیا پر بے اعتباری سے پیدا ہوئی۔ عوام سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں بے لاگ احتساب کے دروازے میں جتلا میڈیا کو، صرف سیاست دانوں کے منہ پہ کالک ملنے کے لئے بار آور کیا گیا ہے۔

آپ اسلحہ سکیئنڈل کو ہی لے لیں۔ بحرہ کے ایک ایڈمرل کی آبدوزوں کی خریداری میں تنہا 12 ارب کی کرپشن کی ہے، مگر ہمارا میڈیا ایس این پی کی پولیس اسلحہ میں ایک ارب کرپشن کا ماتم جاری رکھے گا۔ اسی طرح کچھ پراسرار قوتوں کے بھونپو، اس بات پر ہینچل پارٹی کا بیڈن بجاتے رہیں گے کہ انہوں نے 8 ہزار خاندانوں کو بلا وجہ پی آئی اے میں روزگار دے کر تو قی خزانے کو 5 سال میں 15 ارب روپے کا ٹیکہ لگا دیا۔ البتہ نسیان کی وجہ سے ان تین جرنیلوں کا نام نہیں لیں گے جنہوں نے ریلوے سکیئنڈل میں 15 ارب روپے ڈکار لئے تھے۔

دیکھئے! اگر کوئی احتساب کرنے میں مخلص ہو تو اس کے لئے شر لاک ہومز درکار نہیں۔ احقر ایک بہت آسان سائنٹ پیش کرتا ہے کہ ذرا عوام کو گزشتہ 30 سال کے دورانیے میں درج ذیل تین فہرستیں پیش کر کے دکھائیں۔ ان فہرستوں کے لئے صرف ایئر پورٹ اور سی ڈی اے سے رابطہ کرنا ہوگا۔

ایک فہرست ان لوگوں کی جن کی اسلام آباد میں دو کنال کی کوشی ہے یا وہ اس میں 30 سال سے قیام پذیر ہیں (کیونکہ کاغذی مالک ان کا خاندانی نوکر بھی ہو سکتا ہے) دوسری فہرست ان کی جن کے بچے اس عرصہ میں بیرون ملک کی پرائیوٹ یونیورسٹیوں سے پروفیشنل ڈگریاں لے کر آئے ہیں۔ تیسری فہرست ان لوگوں کی جو اس دوران کم از کم 5 بار، فیملی کے ساتھ یورپی ممالک گئے ہیں۔ چاہے سیر کے لئے ہوں یا علاج کے نام پر یا سیمینار وغیرہ کے نام پر۔



آپ کو حیرت ہوگی کہ اس فہرست میں پٹواری، تھانیدار اور کشم کلر قبیل کے لوگ تو ہوں گے، مگر سیاست دان آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہوں گے۔ مانا کہ اس پارلیمنٹ میں بھی چور بیٹھے ہیں مگر ان سے بڑے چور باہر آزاد پھر رہے ہیں۔

قوم کی پہلی نصف زندگی، نظام مصطفیٰ ﷺ کے سراب میں راندہ ہوئی، اور دوسری نصف احتساب کی سرخ بتی کے تعاقب میں خوار ہو رہی ہے۔ اب تو یہ یوں لگتا ہے کہ وقتاً فوقتاً کھیلا جانے والا احتساب کا ڈرامہ، صرف بڑے مگر مچھوں کو قانونی اور باعزت رہائی دلانے کے لئے کھیلا جاتا ہے۔ اپنے ایڈمرل منصور الحق کی مثال ہی لے لیں۔ موصوف نے نیوی کے پورے عملے کی تین برس کی تنخواہ کے برابر ٹین کیا مگر اس سے صرف 6 کروڑ روپے ملے کہ ہر جرم سے بری کر دیا گیا۔ ستم یہ ہے کہ اس ٹانک کے دوران ملزم کے پیچھے امریکہ جانے والی ٹیم کے ممبروں اور وکیلوں کی فیس کی مد میں عوام کے ٹیکسوں سے مزید 6 کروڑ خرچ ہو چکے ہوں گے۔ عوام کو تو آم بھی چوسنے کو نہ ملا۔

دوسری وجہ جس کی بنا پر میں احتساب کے بھاری پتھر کو اٹھانے سے منع کرتا ہوں، یہ ہے کہ حال کی گھڑی میں یہ ناممکن سا عمل لگتا ہے، بے لاگ احتساب کی راہ میں حائل چھ مشکلات بطور نمونہ عرض کر دیتا ہوں۔ پہلی مشکل یہ کہ اگر بے لاگ احتساب شروع کریں تو پہلے کس طبقے سے شروع کریں؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔ بالادست طبقات، ایک دوسرے کی جانبداری سے خوفزدہ ہیں اور ہر طبقہ چاہتا ہے کہ پہلے دوسرے طبقے کا احتساب شروع ہو۔ مثلاً سول بیورو کریٹ کا شکوہ کہ آرمی والے کو نسا دودھ کے دھلے ہیں؟ ان سے ابتداء کیوں نہیں کرتے۔ جاگیردار، کہتے ہیں صنعت کاروں سے شروع کرو، وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ بیک وقت، ساری قوم کا احتساب ممکن نہیں۔

دوسری مشکل یہ کہ مالی کرپشن کا وہ پودا جس کا بیج حضرت ضیاء الحق کے دور سے مفت کے امریکی ڈالروں کی برکت سے کاشت ہوا تھا، اب ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ ایسے ایسے بیج، جرنیل اور بیورو کریٹ بھی کسی نہ کسی طور مالی کرپشن میں ملوث رہے ہیں جن کی سوسائٹی کے لئے دوسری پروفیشنل خدمات بھی بہر حال ایک قابل احترام حقیقت ہے۔ اب ایسوں کو ننگا کرنے سے، سوسائٹی میں ایک انتشار پیدا ہوگا ڈاکٹر عبدالقدیر کی مثال ہی لے لیں۔

تیسری مشکل یہ کہ اگر کسی ایک ادارے کا بھی احتساب کیا جائے تو چھوٹے کرپٹ کو پہلے پکڑیں یا بڑے کو؟ دونوں صورتوں میں انتشار ہے۔ مثلاً جن بارڈر سے ایک کرٹل گاڑی اسمگل کروا کر سوات پہنچاتا ہے۔ اگر اس کو پہلے پکڑیں تو یہ واویلا کرے گا کہ میں نے تو صرف گاڑی اسمگل کی ہے، جبکہ جرنیل نے نیٹو



کا پورا کنٹینر کھالیا۔ اگر جرنیل کو پکڑیں تو عام آدمی میں اپنے سینئر کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات بھڑک سکتے ہیں جو ادارے کی مکمل تباہی کا سامان ہو سکتا ہے۔

چوتھی مشکل یہ کہ احتساب کی کہانی زرداری یا نواز شریف پہ نہیں رکھی گئی، بلکہ پچھلی نسل تک جائے گی۔ پھر پرانی کتھا کھولی تو شاید نتیجہ من پسند نہ نکلے۔ اس لئے کہ ان دو بدنام لیڈروں کے والدین، جاگیردار یا صنعت کار تھے مگر اپنے اسد عمر، جہانگیر ترین، عمران خان وغیرہ کے والدین تو سرکاری ملازمین تھے۔ چند برسوں میں چاند کو چھوٹا لائف سٹائل کس برتے پہ نصیب ہو گیا۔ اس کا جواب زرداری اور نواز شریف کے لئے اتنا مشکل نہیں ہو گا مگر، خیر۔

پانچویں مشکل یہ ہے کہ کسی بھی ادارے میں کرپشن کرنے والوں کی ایک پوری ٹیم ہوتی ہے، اگر آپ شفافیت سے کھراتا پتے چلے جائیں گے تو ہر ادارے میں کم و بیش 50 فیصد ملازمین، چھوٹی بڑی کرپشن میں ملوث نکلیں اور اتنی بڑی تعداد میں ملازمین کو گھر بٹھانے سے پوری ملکی مشینری کا ایک دم بھٹہ بیٹھ جائے گا۔

چھٹی وجہ یہ کہ جن لوگوں نے کبھی بڑی کرپشن کی تھی تو اب اس سرمائے کے تین حصے ہو چکے ہیں۔ ایک حصہ تو عیاشی پہ اڑایا جا چکا ہے کہ مال حرام، چیلے آتا ہے ویسے ہی جاتا ہے۔ اب یہ تو برا آدمی ہونے سے رہا۔ مال حرام کا دوسرا حصہ، شاید کاروبار وغیرہ میں لگایا گیا ہو (جس میں نا تجربہ کاری اور لاپرواہی کی بناء پر اکثر نقصان ہی اٹھایا جاتا ہے) ہر طور کاروبار میں کی گئی سرمایہ کاری، کسی طور سوسائٹی کے افراد میں واپس تقسیم ہو گئی، سمجھ لیں بہتر ہو گیا۔ مگر اب یہ واپس لینا چاہیں تو بھی اس کا کوئی امکان نہیں۔ کرپشن کا تیسرا حصہ جائیداد اور بینک بیلنس کی صورت محفوظ ہوتا ہے، جسے آپ احتساب کے نام پر ضبط کر سکتے ہیں۔ مگر بھائی، اب یہی مجرم کی بقاء کا کل سامان ہوتا ہے۔ آپ اگر آپ یہ واپس ضبط کرنا چاہتے ہیں تو وہ آدمی یہ ساری دولت، وکیلوں کی فیس میں لگا دے گا، مگر آپ کو نہیں دے گا۔ جبکہ اس کے مقابل حکومت کو بھی اتنا ہی خرچہ وکیلوں پہ کرنا پڑے گا جو کہ عوام کی جیب سے نکلے گا۔ زیادہ سے زیادہ، آپ اس کو جیل میں ڈال سکتے ہیں، مگر لوٹے گئے سرمایہ کا 10 فیصد بھی واپس نہیں آئے گا۔

یہ اور اس کے علاوہ کئی مزید عملی وجوہات ہیں جو احتساب کو گورکھ دھندہ بنا دیں گی۔

لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ”ایک زرداری، سب پہ بھاری“ نے اب آپ کو حقیقی احتساب کے قابل چھوڑا ہی نہیں۔ شنید یہ ہے کہ ہمارے اصلی خیر خواہ ملک کے اندر زرداری کے خلاف ثبوت اکٹھے کرتے رہے اور ادھر سندھی ماخوذ ایسی فائلیں ساتھ لے گیا جن کی بناء پر عالمی عدالت میں مقدمہ چل سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ڈاکٹر عاصم کیس ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے والا قصہ بن چکا ہے۔



حضور والا! کرپشن اور اس کے احتساب کے ضمن میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ آپ کے بقراطوں کے ہاں الفاظ و معانی کے پہناوے ہی نہیں، چہرے بھی بدل جایا کرتے ہیں۔ اس لئے قوم ابھی تک ابہام کا شکار ہے کہ کرپشن ہوتی کیا چیز ہے؟

یادش بخیر! جس دور میں ہم انجینئرنگ یونیورسٹی پشاور میں داخل ہوئے تو اس زمانے میں پاکستان میں نہ تو پرائیوٹ پروفیشنل یونیورسٹیاں ہوتی تھیں اور نہ ہی سیلف فنانس سکیم کے تحت داخلے ہوتے تھے۔ (قبائلی کوئٹہ البتہ ہوا کرتا تھا)

ہمارا ایک دوست چند نمبروں کی کمی سے داخلہ سے رہ گیا تھا۔ چنانچہ اگلے سال 50 ہزار روپے کی رشوت دے کر گھر بیٹھے ریاضی کا پرچہ حل کیا اور داخلہ لے لیا۔ دوست اسے کرپٹ ایڈمشن کہتے تھے۔ دو سال بعد، یونیورسٹی نے سیلف فنانس کی سیٹوں کا بھی کوئٹہ متعارف کرا دیا۔ یعنی جس کے نمبر میرٹ سے کم ہوں، وہ دو لاکھ روپے دے کر سیٹ حاصل کر سکتا ہے۔

ہمارا دوست کہتا تھا کہ اگر میں نے پیسے لگائے تو یہ کرپشن تھی اور یونیورسٹی پیسے لے کر داخلہ دے تو جائز ہو گیا؟ یہی حال، نیب کی پبلی بارگین کا ہے۔ پہلے کسی نے حکومتی اہلکار کو رشوت یا کمیشن کھلا کر مال بنایا۔ پھر پبلی بارگین کر کے (گویا کچھ مزید کمیشن یا رشوت دے کر) اسے حلال کر لیا۔

کرپشن کیا ہے؟ ایک لفظ ہی تو ہے اور آپ کی تجاویز لغت کے قریبان، الفاظ تو آپ کے گھر کی کینز ہیں۔ ہم کوئٹہ فہم تو گزشتہ 60 سال میں اتنا ہی سمجھ پائے کہ ہمارے اعمال نامے کی ہر تیرگی، آپ کی زلف میں پہنچ کر حسن بن جایا کرتی ہے۔ طوالت کی بناء پر بس اشارہ کافی ہے۔

مختصر عرض کرتا ہوں کہ جنسور، بس احتساب کو رہنے ہی دیجئے۔ راستہ چلتے، ایکسڈنٹ ہو جائے یا ڈاکو پڑ جائیں اور آپ اسی جگہ بیٹھ کر سیپا کرتے رہیں تو پھر پہنچ چکے منزل کو۔ چوہدری صاحب کا مشہور مقولہ سامنے رکھئے کہ: ”جو ہو چکا، اس پہ مٹی پا۔“

مکہ فتح ہو چکا، صحابہ جو گھر چھوڑ کر جا چکے تھے ان کو واگزار کرانا ان کا حق تھا۔ مگر سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کہ: بچھلی باتیں سب بھول جاؤ اور اب آگے بڑھو۔ ایسے ہی تو میں اٹھا کرتی ہیں جیسے جاپان اٹھا ہے جبکہ بنگلہ دیش ابھی تک پھانسیوں پہ ہی انکا ہوا ہے۔

میری تجویز یہ ہے کہ اب ملک میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے، آئندہ کرپشن کی روک تھام کا بندوبست کیا جائے۔ خدا نے چاہا تو جلد ہی قوم کا نقصان بھی پورا ہو جائے گا۔ جناب والا! اس درمائدہ قوم کے حق میں اگر کوئی خیر خواہی کی رفق آپ کے دل میں باقی ہے تو فی



الحال، کرپشن کے سدباب کا نظام بنایے۔

مجھ ناقص العقل سے قطع نظر، ایک سے بڑھ کر ایک دانشور ہیرا قوم میں موجود ہے جو آپ کو کرپشن کے سدباب کے باب میں فکری توشہ فراہم کر سکتا ہے، لیکن سوباتوں کی ایک بات کہ یہی پارلیمنٹ ہی کرپشن کا راستہ روک سکتی ہے۔ جی ہاں، یہی کرپٹ، نا اہل اور دھاندلی زدہ پارلیمنٹ آپ کے ملک کو ترقی کی راہ پہ گامزن کر سکتی ہے اگر آپ تین کام کر لیں۔

پہلا کام یہ کیجئے کہ آئین میں جن اداروں کو جو اختیارات دئے گئے، ان کی بلا تعصب پشت پناہی کیجئے تاکہ کوئی مافیا ان کو دھرنے جلے کے زور پر اور کوئی حکومت ان کو نوکر شاہی کی مکاری سے بے بس نہ کر سکے۔ دوسرے یہ کہ اپنی ایجنسیوں کو ان کے اپنے کام پہ لگائے تاکہ جب اخبار میں یہ خبر لگے کہ ماڈل آیان علی منی لائڈ رنگ کا 86 واں دورہ کر رہی تھی تو عوام یہ نہ پوچھیں کہ اس کے پچھلے 85 دورے، ہماری 26 ایجنسیوں سے کیوں اوجھل رہے؟۔

تیسرا کام یہ کیجئے کہ اس سنگڑی ٹولی جمہوریت کو چلنے دیجئے۔

آپ نے اس پارلیمنٹ کے حواس معطل کر رکھے ہیں۔ احتساب کے نام پہ بلیک میلنگ کی فائلیں اور اس پہ مستزاد کٹھ پتلی میڈیا کو ان کے سر پہ سوار کر رکھا ہے۔ آپ ذرا ان کو دم لینے دیجئے۔ عارضی طور ہی سہی، ان کے پرانے کھاتے کی طور بند کیجئے۔ اداروں کو حقیقی آزادی دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ آپ کے کہے بنا میڈیا اور عوام یکجا ہو جائیں گے اور یہی پارلیمنٹ، ہر قسم کی فلاحی قانون سازی پہ مجبور ہو جائے گی۔ آپ ذرا جمہوریت کو موقع تو دیجئے حضور! شاید کہ وقت کے ساتھ ساتھ، پرانا مال بھی برآمد ہو جائے مضمون ختم ہوا۔

لوگوں کو باور کرایا گیا ہے کہ سیاستدان کرپٹ ہوتے ہیں۔ مگر ایک بین الاقوامی مسلمہ اصول ہے کہ ہر انسان بے گناہ سمجھا جائے گا جب تک عدالت میں ثابت نہ ہو جائے۔ اس اصول کو نہ صرف ان پڑھ اور جاہل عوام بلکہ خود کو تعلیم یافتہ کہنے والے بھی، ماننے کو تیار نہیں۔ اور مزید یہ کہ اگر کہا جائے کہ نہ ماننے کی صورت میں کیا کیا جائے؟ تو فرمان ہوتا ہے کہ ان سب کو گولی مار دو۔ میرے ایک عزیز بھی اسی سوچ کے حامل ہیں۔ ان سے ایک مکالمہ ہوا تھا، جس کے بعد ذیل کی تحریر لکھی تھی:

انگریز کا بچہ حرامی نہیں ہوتا، سائیں!

ہم تو ٹھہرے ڈیرہ کے پینڈو، مگر موصوف تو برٹش نیشنل ہونے کے علاوہ ہیر سٹر بھی کہلاتے ہیں۔ جب



آدھا گھنٹہ کے سیاسی لیکچر میں درجن بار "چور زرداری" کہہ چکے تو ہم نے عرض کیا کہ جناب! آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ زرداری چور ہے؟ کسی عدالت سے وہ چور ٹھہرایا نہیں گیا اور آپ نئی تو ہیں نہیں کہ صرف آپ کے فرمان پر ایمان لایا جائے۔

حیرت سے ان کا منہ کھل گیا۔ زرداری کا دفاع اور وہ بھی ایک داڑھی والے کی طرف سے.....!!!  
افسوس سے فرمایا: "سلیم صاحب، آپ سے ایسی امید نہیں تھی کہ آپ ایک لٹیرے کی حمایت کریں گے۔ آپ ثبوت مانگتے ہیں، کیا یہ ثبوت کم ہے کہ چیف جسٹس کے بار بار کہنے پر، اس نے سوئس حکام کو خط نہیں لکھنے دیا تھا، چاہے اس کے وزیراعظم کی نوکری چلی گئی؟"  
ان کے اس "عظیم الشان ثبوت" پر میں ہکا بکارہ گیا۔

عرض کیا: "جس بات پر زرداری کو سلام کرنا چاہئے تھا، اس بات کو آپ اس کی چوری کا ثبوت بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ بھائی صاحب! آپ کا کیا خیال ہے کہ نواز شریف اور مشرف کی 20 سال تک تفتیش بھگتے والا، چوہدری افتخار کے خط سے ڈر گیا تھا؟ پھر یہ بتائیے کہ راجہ پرویز اشرف نے تو خط لکھ دیا تھا۔ اس بات کو بھی 5 سال ہو گئے تو پھر کیا قیامت آگئی؟"

میں نے کہا: "آصف زرداری نے آئین پاکستان اور عدالت کی حرمت بحال کی ہے۔ آئین، صدر کی کرسی کو استثناء دیتا ہے اور وہ یہ آئینی حق، چیف جسٹس کی انا کی بھینٹ چڑھانے پر راضی نہیں تھا۔ آج وہ صدر نہیں رہا لیکن وہی سپریم کورٹ موجود ہے۔ دس خط لکھ دیجئے۔ پھر افتخار چوہدری نے اس کے وزیراعظم کی چھٹی کرا دی۔ چوہدری کے اس فیصلے پر دنیا بھر کی عدالتوں نے چوہدری کا مضحکہ اڑایا، لیکن آصف زرداری نے چیف جسٹس کا یہ بدعتی والا حکم قبول کر کے، اس ادارے کی تکریم کی رسم ڈالی۔ ورنہ نواز شریف اگر چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے خلاف گیم کھیل کر اسے بے دست و پا بنا سکتا تھا تو کیا زرداری اس سے کم شاطر تھا، جبکہ وہ خود ہی صدر تھا۔"

کہنے لگے: "آپ کو خوب معلوم ہے کہ زرداری چور ہے، مگر پاکستان کی عدالتوں میں انگریز کا قانون ہے جس سے کچھ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اے کاش، یہاں اسلامی عدالت ہوتی تو صرف ایک سوال پوچھتی کہ تمہارا طرز زندگی، تمہارے ذرائع آمدن کے مطابق کیوں نہیں؟ کوئی بھی چور نہ بناتا۔"

عرض کیا: حضور! بدلنے اس نظام کو۔ اسلامی نظام کی جدوجہد میں آپ کے ساتھ ہوں۔ جس دن اسلامی عدالت بن گئی اور اس عدالت نے زرداری کو چور کہا، میں بھی کہوں گا۔ جب تک وہ عدالت نہیں



بنتی، تو ظاہر ہے کہ موجودہ عدالت کی رولنگ پر ہی چور یا امین کا فیصلہ کیا جائے گا“  
میں نے کہا: ”انگریز کے بچے کو حرامی نہیں کہا کرتے۔ ہاں، انگریز مسلمان ہو جائے اور پھر شادی بغیر  
بچہ پیدا کرے تو اس بچہ کو حرامی کہتے ہیں۔  
ایک اور پہلو بھی قابل توجہ ہے:

نواز شریف پر الزام ہے اس نے پاکستانی عوام کے ٹیکسوں سے رقم چوری کی، جبکہ عمران خان پر الزام  
ہے کہ شوکت خانم ہسپتال میں پاکستانی عوام کے چندے میں ہیرا پھیری کی گئی۔ یوں تو سب چاہیں گے کہ  
دونوں الزامات کی شفاف تحقیق کی جائے مگر میرا خیال ہے کہ پہلے ہسپتال کا ایسا توجہ طلب ہے۔  
دیکھئے! نواز شریف کا نقصان، اس کا ذاتی نقصان ہے، وہ ہٹ جائے گا، جیل جائے گا۔ کچھ رقم واپس  
آجائے گی، یہ معمول کی باتیں ہیں۔ پاکستان چلتا رہے گا۔ لیکن اگر شوکت خانم کینسر ہسپتال بند ہو جائے  
تو یہ قوم کا ایسا نقصان ہے جس کا ازالہ مشکل ہے۔

اگرچہ ہماری ”بدکردار جمہوری حکومتیں“ ہمیشہ فلاحی اداروں کی سیاسی وابستگی سے بالاتر ہو کر پشت  
پناہی کیا کرتی ہیں جیسے اے این پی کی حکومت نے پشاور شوکت خانم ہسپتال کو زمین اور مالی امداد دی، لیکن  
خود عمران خان کا کہنا ہے کہ اس ہسپتال کے وضع اخراجات کروڑوں کے سالانہ چندہ سے ہی پورے ہوتے  
ہیں۔ یعنی آج کل اگر کوئی مالی کرپشن ہوتی ہے تو چندے سے یہ کی پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن کل اگر عمران  
خان نہ رہا تو چندے سے ہسپتال کا چلنا بھی ممکن نہ ہوگا کیونکہ چندہ مانگنے کی خدا داد صفات اور وہی طریقے،  
ہر کسی کو عطا نہیں ہوا کرتے۔ اس لئے ہسپتال کا نظام درست ہونا بہت ضروری ہے۔

پس میرا خیال ہے کہ ہسپتال کے چندے میں مالی گڑبڑ کی تحقیق، پانامہ سکندل کی تحقیق سے بھی زیادہ  
ضروری ہے۔ اب یہ تفتیش کون کرے؟ خود عمران خان کو تو یہ کام سونپنا بے وقوفی ہوگا۔ کیونکہ جسٹس وجیہہ  
الدین، جنرل حامد خان اور اب تسنیم نوارنی نے احتساب جیسے کاموں میں کپتان کی معذوری یا بدینتی  
آشکار کر دی ہے۔ البتہ عمران خان نے قومی اسمبلی میں یہ کہا ہے کہ: ”ہسپتال میں مالی کرپشن کی تحقیق کرنا،  
میرا نہیں بلکہ حکومت کا کام ہے“ درست فرمایا۔ اب چونکہ یہ چور حکومت، اپنی یہ ذمہ داری نہیں ادا کر رہی تو  
اس کے خلاف عمران خان کو دھرنا دینا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا دھرنا نہ صرف اس پراجیکٹ کے لئے بہتر  
ہوگا بلکہ خود عمران خان کی اخلاقی ساکھ بھی بڑھے گی۔

مثلاً عمران خان، حکومت کو فکس ٹائم دیں کہ چیف جسٹس کی زیر نگرانی ایک کمیشن بنایا جائے جو دو ہفتے



میں ہسپتال کے چندے اور اگلے دو ہفتے میں پانامہ سینڈل بارے رپورٹ دے۔ تو ہر صاحب انصاف، عمران خان کا ساتھ دے گا۔

مگر وہ ایسا کیوں کرے؟ اپنے پاؤں پہ کون کلبھاڑی مارتا ہے؟  
بہر حال دھاندلی اور احتساب پر یہ اضافی مضامین، فقط اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے لئے لکھے ہیں۔  
رہا مولانا فضل الرحمن یا جمعیت علماء اسلام کا معاملہ (جو کتاب کا اصل موضوع ہے) تو نہ وہ بیچارے دھاندلی کرنے قابل ہیں اور نہ ان کے پاس کرپشن کی دولت ہے۔ دھاندلی کے تو وہ خود کشتہ ستم ہیں اور رہا ان کا احتساب، تو وہ ان کا گلی محلے کے لوٹے بھی کرتے پھرتے ہیں کہ:

میری خوبی پہ رہتے ہیں یہاں اہل جہاں خاموش  
میرے عیبوں کا چرچا ہو تو گونگے بول پڑتے ہیں

Rights of e-Publications reserved  
by  
Team OFFICIALJAMIAT

📞📧📱 / OfficialJamiat

📞 / JUIAnswerBack



## تیسرا حصہ:..... ذاتی واردات و تاثرات

کتاب کے اس حصے میں راقم کی ذاتی عقیدت کا بیان ہے۔ یعنی یہاں جمعیت علمائے اسلام کے دوستوں سے کچھ حال دل بائٹھا مقصود ہے۔

کسی کی یاد کے جگنو دھواں اگلے ہیں:

ذریہ اسماعیل خان کی تحصیل کلاچی، آٹھ دروازوں کی فصیل میں بند گاؤں نما شہر، جہاں 1973ء میں پرائمری سکول جاتے ہوئے، دو تاریخی مقامات کے سامنے سے گزرتا ہوتا تھا: مدرسہ نجم المدارس اور گندہ پور ہاؤس۔ بچپن میں گندہ نقش، مثل حجر ہوتا ہے۔ میرے ذہن کے فریم میں ایک عالم دین اور قوم کے سردار کا ایک ہی تصور ٹھہر گیا ہے یعنی شیخ الحدیث مولانا قاضی عبدالکریم صاحبؒ اور سردار عنایت اللہ خان گندہ پور۔ پس دور جدید کے نئے دینی سکالرز سے روابط کے باوجود، داڑھی پکڑی کے بغیر کوئی عالم دین نظر میں چٹتا نہیں ہے۔ ادھر یہ کہ آج کل ہر لونڈا لہاڑہ، خود کو سردار باد کرانے پہ تل گیا ہے مگر جس نے عنایت اللہ خان گندہ پور کو دیکھا ہے، اس سے تو ان کا بیٹا تک ہضم نہیں ہوتا تو ہاشما کون؟

پھول مرجھا گئے، گلداں بھی رکر کر ٹوٹا

کیسی خوشبو میں بے ہیں درود یار بانک

یادش بخیر! مولانا قاضی عبدالکریم صاحب مرحوم (جن کے ساتھ احقر کی تصویر زیر نظر کتاب میں موجود ہے) بہت بڑے عالم تھے، جن سے ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم بھی استفادہ فرمایا کرتے تھے۔ چھوٹے شہر کی بناء پر کم معروف تھے، وہ اگر کلاچی کی بجائے، کراچی میں ہوتے تو ان کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا۔

راقم نے ان کی خاطر یہ اشعار کہے تھے:

چھوٹے شہر میں امن خلوص تو ہوتا ہے پر

چھوٹے شہر بڑے لوگوں کو کھا جاتے ہیں

دیراں گوشہ میں گل چیں کا ڈرنہ ہو، پر

گلشن سے ہواوٹ تو گل مرجھا جاتے ہیں

کون آپر کھنٹی، اصلی لوگوں کو تو.....

شیشے کے شوکیس میں زیور بھا جاتے ہیں

قاضی صاحب آخری عمر میں مرض نسیان کا شکار ہو گئے تھے۔ ان کے بیٹے کے بقول، رات کو اٹھ اٹھ کر کئی بار وضو کا پانی طلب فرماتے۔ راقم دن کے وقت ان کی زیارت کیلئے گیا تو ان کی رتجگہ کا احوال سن کر واپسی کی ٹھانی، مگر ان کے پوتے نے ان کو بتا دیا کہ مکہ، مدینہ سے مہمان آیا ہے۔ پوتے کے سہارے گھر کی اس پرانی بیٹھک میں تشریف لائے، جہاں کبھی حضرت مولانا حسین احمد مدنی نے قدم رنجہ فرمایا تھا۔



مجھے معلوم تھا کہ انہوں نے 1963ء کے سفر حج میں ایک فارسی نعت لکھ کر مواجہہ شریف پہ پڑھی تھی، ان کو چھیڑا تو وہی نعت خود سنائی۔ خود اور ہم کو رلایا۔ راقم نے اپنے فون میں وہ ویڈیو محفوظ کر لی ہے۔ کبھی دیکھتا ہوں اور ایمان کی حلاوت پاتا ہوں۔ آہ! خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں برائیتیں تذکرہ، قاضی صاحب کو مولانا فضل الرحمن سے سیاسی اختلاف تھا، مگر ان سے اپنی غایت عقیدت کے باوجود راقم ان کے سیاسی موقف سے متفق نہیں رہا۔ میرا خیال ہے کہ دل اور دماغ کو اپنے اپنے حصے کا کام کرنے دینا چاہئے تو زندگی متوازن رہتی ہے۔

بہر حال، راقم کی کھٹی میں شاید علمائے دیوبند کا تاثر پڑ چکا تھا۔ حالانکہ میرے گھرانے کا کوئی خاص مذہبی پس منظر نہیں تھا، والد صاحب غیر سیاسی اور مصروف آدمی تھے مگر کانگریسی ذہن رکھتے تھے۔ معلوم نہیں کیسے؟ مگر ان کے پاس نایاب کتب اور قلمی خطوط موجود تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں اکثر کلاچی سے باہر رہتے مگر جب بھی کچھ ایام کو آتے تو ان کا بہترین مشغلہ ”دیوانِ رحمن بابا“ کی ”تلاوت“ ہوتا تھا۔ آج بھی لاشعور میں وہ منظر ابھرتا ہے کہ وہ شام کے بعد چار پائی پہ بیٹھے، ایک مہذب جذب و کیف سے دیوان پڑھ رہے ہیں۔ بعد میں راقم جب تبلیغی جماعت میں گیا اور وہاں ”چھ نمبر“ لکھائے گئے تو محسوس ہوا کہ یہی سب کچھ، ہم رحمن بابا سے پہلے ہی سن چکے ہیں۔

افسوس، ان کتابوں کا بیشتر حصہ میری نادانیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بچپن میں یہ لت لگی تھی کہ امی جان کے گوندھے آٹے سے کاغذ کے لفافے بنانے کا کھیل کھیلتا تھا، جس کے لئے ان قیمتی کتابوں سے ورق پھاڑ لیا کرتا۔ خیر، ان کتابوں میں مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت ”نقش حیات“ بھی تھی۔ شاید آپ اسے مبالغہ سمجھیں مگر میں نے تیسری جماعت میں اسے پڑھا تھا۔ 8 سالہ بچے کو اس کی کیا سمجھ آتا تھی لیکن اس کتاب میں ایک انگریز ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کا بار بار تذکرہ تھا جس کا نام بہت لطف دیتا تھا۔ اس وقت یہ شعور تو نہیں تھا کہ مولانا حسین احمد مدنی کتنے بڑے عالم ہیں یا مسٹر ہنٹر کی بطور تاریخ دان کیا حیثیت ہے؟ مگر یوں اندازہ ہوتا تھا کہ ایک مولوی صاحب ہیں جو انگریزوں کے خلاف کچھ لکھتے ہوئے، ان کے ہی ایک بندے سے ان ہی کے خلاف گواہی لا رہے ہیں۔ لاشعور میں یہ بیٹھ گیا تھا کہ مولوی لوگ بڑا مضبوط موقف اور دلیل رکھا کرتے ہیں کہ انگریز بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ہم لوگ 1976ء میں ڈیرہ اسماعیل خان (شہر) آ گئے اور 1977ء کا الیکشن مجھے یاد ہے۔ زندگی کی پہلی سیاسی ماروالد صاحب سے پہنچ پارٹی کی خاطر کھائی تھی۔ مفت میں ہاتھ آیا ترنگا جھنڈا، مجھے بہت پیارا لگا۔ سکول سے آ کر اسے گھر کی چھت پہ لہرا دیا۔ والد صاحب گھر آئے تو سامنے ہی یہ جھنڈا دیکھا۔



وہ قومی اتحاد کے نو تاروں والے پرچم کے حامی تھی، پس مجھے دن میں تارے دکھائے۔ وہ جھنڈا چھت سے تو اتر گیا، مگر آج تک دل سے نہ اتر سکا۔

اسیر دام جنوں ہیں، ہمیں رہائی کہاں یہ رنگ و بو کے نفس اپنے ساتھ چلتے ہیں خود مفتی محمود صاحبؒ کی ایک مبہم تصویر، نگار خانہ خیال میں آویزاں ہے کہ وہ الیکشن رزلٹ کی رات، مولانا علاؤ الدین صاحب کے مدرسہ میں چارپائی پہ نشست رکھتے ہیں، مگر یہ کہ مفتی صاحب کی بہت ہی حیرت انگیز صفات کا تذکرہ، انھیال کے خاندان میں چلتا رہتا تھا۔ ناناجی حاجی مہربان، مفتی صاحب کی وزرات اعلیٰ میں ان کے قریبی آدمی تھے۔ مگریوں ہے کہ باغی بچے کو مفتی صاحب کے مقابل، بھٹو زیادہ پسند تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟ یہ میرے شعور سے باہر کی چیز تھی۔ شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ خود کو دو دھیال سے زیادہ قریب پاتا تھا جو اکثر بھٹو صاحب کے حامی تھے۔ میں گمان کرتا ہوں کہ مجھے قدرتا تحریکی طبیعت عطا کی گئی۔ پولیس سے پہلی ٹرہیئر 1980 میں ہوئی جب ساتویں جماعت میں جامع ہائی سکول ڈیرہ کا طالبعلم تھا۔ باچا خان کے بیٹے عبدالعلی خان گول یونیورسٹی کے دہنگ وائس چانسلر تھے۔ انہوں نے جامع سکول کو یونیورسٹی سے ملحق کرنے کا فیصلہ کیا تو سٹوڈنٹس نے کئی دن احتجاج کیا۔ جامع سکول کو پہلے "ویمن" اور سال بعد "ویشم کالج" کا نام دے کر یونیورسٹی سے ملحق کر دیا گیا، مگر راقم نے احتجاجی سیاست کا اویں ذائقہ چکھا۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں جمعیت علماء مفتی محمود مرحوم سے بہت پہلے ہی ایک مقبول جماعت بن چکی تھی۔ اس کی بڑی وجہ دو محترم نواب گھرانے تھے۔ یعنی گنڈہ پور اور سدوزئی نوابان۔ کلاچی میں عنایت اللہ خان گنڈہ پور کے والد جمعیت کی نکت پہ منتخب ہوئے تو تربوری میں کچھ گھرانے بریلویت کی طرف چلے گئے (علی امین گنڈہ پور کے اسلاف)

ڈیرہ اسماعیل خان شہر کے دو نواب گھرانے ہیں علی زئی اور سدوزئی۔ مگر درحقیقت ڈیرہ کے بانی اور اصل حکمران درانی شاخ کے سدوزئی نواب تھے۔ ہماری نوجوانی تک یہ صورتحال تھی کہ سدوزئی فیملی کٹر دیوبندی جبکہ علی زئی فیملی پکے بریلوی تھے۔ علی زئی نوابان پیر صاحب تونسہ کے مرید تھے اور جب پیر صاحب کڑی علی زئی تشریف لاتے تو عمر رسیدہ علی زئی نوابان ان کے سامنے گھٹنوں کے بل چلتے تھے۔ آپ اندازہ کیجئے کہ نواب حیات اللہ خان جو چند سال قبل 72 سال کی عمر پا کر فوت ہوئے، ان کا اکلوتا بیٹا تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوا اور سات مہینہ کیلئے بیرون ملک تشکیل ہوئی تو والد صاحب بیٹے سے ملنے رائے وٹ مرکز گئے مگر "وہا بیوں" کے مرکز میں گھسنے سے انکار کر دیا اور بیٹے کو باہر بلا کر لے۔



قدرت کی نیرنگی مگر یہ دیکھئے کہ بعد میں نواب صاحب کی موت، رائے ونڈ مرکز کے اندر ہوئی۔ ان کا جنازہ وہاں پڑھا گیا۔ خاکسار کے حصے میں یہ سعادت آئی کہ ان کی میت کیلئے ڈیرہ تک ایبٹنس کا اہتمام کیا، جس گاڑی میں وہ رائے ونڈ مرکز، اپنی خوشی سے پہلی بار آئے تھے، اسی گاڑی میں ان کی جگہ یہ خاکسار جبکہ وہ میت گاڑی میں واپس ہوئے۔ آدمی رات کو سرگودھا ان کی جاگیر پہنچے تو ان کے مزارعین نے دوسری بار جنازہ پڑھا اور صبح ڈیرہ اسماعیل خان میں تیسرا بڑا جنازہ ہوا۔ ایں سعادت بزرگ دہاؤ نیست نوابان علیز کی میں سے زیادہ تر حیدر خان علیز کی عملی سیاست میں سرگرم تھے جو کئی بار پیپلز پارٹی اور آخری بار جمعیت علماء اسلام کی ٹکٹ پر الیکشن لڑے تھے۔ البتہ پرویز مشرف کی وجہ سے ان کے کورس میٹ میجر لطیف اللہ علیز کی ضلعی ناظم بنے تھے اور اب ان کا 24 سالہ بیٹا تحریک انصاف کے ٹکٹ پہ ناظم بننا ہے۔

سدوزئی نوابان جواب بالکل عملی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے ہیں، کبھی سیاست میں پیش پیش تھے۔ 1935ء انڈیا ایکٹ کے تحت ہمارے صوبہ خیبر پختونخوا کو قانون ساز اسمبلی کا اختیار ملا۔ 1946ء کے الیکشن میں صوبہ میں مسلم لیگ اور کانگریس کا زبردست ٹکٹ لڑا اور اس الیکشن میں جمعیت علماء ہند نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لائے اور میدان حافظ جمال میں تقریر کی۔ نواب اللہ نواز خان سدوزئی بھی حضرت کی زیارت کیلئے تشریف لائے، کیفیت بدل گئی۔ کہتے ہیں کہ حضرت مدنی کی تقریر کے دوران نواب صاحب کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے۔ تقریر کے بعد مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت فرمائی اور جمعیت علماء میں شمولیت اختیار کی۔ غالباً اس وجہ سے سدوزئی فیملی، دیوبندی مکتب فکر سے متاثر ہے۔ 1946ء کے الیکشن میں ار بن سیٹ پر نواب اللہ نواز خان جمعیت کی طرف سے منتخب ہوئے اور سرحد اسمبلی جس میں کانگریس کی حکومت تھی، اسکے سپیکر بنائے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد صوبائی حکومت توڑ دی گئی پھر 1951ء کے الیکشن میں مسلم لیگ نے بھرپور دھاندلی سے اپنی حکومت بنائی تو بھی نواب اللہ نواز خان کو بلا مقابلہ سپیکر منتخب کر لیا گیا یعنی صوبہ سرحد کے پہلے سپیکر کا اعزاز پایا۔ شاید حضرت مدنیؒ سے قلبی تعلق کی تاثیر تھی کہ نواب صاحب نے ڈیرہ اسماعیل خان میں واقع اپنی زرعی اراضی میں سے گیارہ سو کنال زمین گول پونیورسٹی کے قیام کی خاطر ہدیہ کی اور علاقے کو 1974ء میں پہلی یونیورسٹی عطا ہوئی۔

یہاں میں ایک ذاتی تذکرہ کروں گا۔ مجھے تبلیغی جماعت میں لے جانے والے پہلے محترم، جناب فاروق سدوزئی ہیں، مگر میرے تبلیغی احباب میں زیادہ تر علی زئی دوست ہیں۔

برسبیل تذکرہ، غالباً 1994 "میں کڑی علی زئی کے نوجوان تبلیغی ساتھی، جن میں فٹ بال کے



کھلاڑی بھی تھے۔ انہوں نے اپنے محلے سے سات ماہ کیلئے تبلیغی جماعت بنائی اور مدفا سکر کے جنگلات میں تشکیل ہوئی۔ ان جنگلات میں ایک کیرا پایا جاتا ہے جسے غالباً ورش کہتے ہیں۔ جو پاؤں میں داخل ہو جائے تو دوسرے دن پاؤں سوج جاتا ہے اور ہفتے کے اندر پاؤں کا شمار پڑتا ہے۔ مقامی لوگوں کو اس کاٹنے سے کچھ نہیں ہوتا، جس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ وہ لوگ نمک بالکل استعمال نہیں کرتے اور یہ کہ اس کی وجہ سانپ ان کو کاٹ لے تو سانپ مر جاتا ہے۔ واللہ اعلم

اس کیرے کا علاج یہ بتایا گیا کہ جو نمی یہ پاؤں میں گھسے تو بڑے سوئے سے اس جگہ سوراخ کر لیا جائے اور اس سوراخ میں تیل چھڑک کر ماس سے آگ لگا دی جائے تو اس کے اڑنے سے جل جاتے ہیں، مگر پاؤں میں سوراخ رہ جاتا ہے۔ کڑی علی زئی ڈیرہ کے ان نوجوانوں کو مقامی لوگوں نے اس مشکل کی وجہ سے آگے جنگل میں جانے سے منع کیا۔ مگر انہوں نے کہا کہ ہم تشکیل کے آخری مقام تک جائیں گے چاہے ہماری لاشیں اٹھانی جائیں۔ یہ نوجوان واپس ہوئے تو انکے پاؤں سوراخ سوراخ ہو چکے تھے۔ رانچو ٹرکز میں مولانا جمشید صاحب نے ایک ایک کو فردا فردا گلے سے لگایا اور بہت دعائیں دیں۔ یہ سب نوجوان ماشاء اللہ زندہ و تابندہ ہیں۔ نام نہیں لکھتا کہ شیطان عجب میں جتلا کر دیا کرتا ہے۔

بہر حال، باقی ملک میں اگرچہ محبت علماء اسلام کا کوئی عوامی تعارف نہیں تھا، مگر ڈیرہ میں یہ فیصلہ کن سیاسی قوت تھی۔ وینس کالج سے ساتویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہم اگلے پانچ سال کیلئے کیڈٹ کالج کوہاٹ کی نذر ہو گئے، جہاں کے شب و روز کچھ یوں تھے کہ:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی.....

جنرل ضیاء کا مارشل لا تھا اور ملک بھر میں سیاسی سرگرمیاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مگر ڈیرہ میں حرارت باقی تھی کہ ایم آر ڈی کا اہم ترین لیڈر یہاں سے تعلق رکھتا تھا۔ میرا مطلب ہے مولانا فضل الرحمن۔ مولانا سے عاتبانہ عقیدت والد صاحب کی وجہ سے ہوئی۔ میرے والد میرے پیر تھے، میرے آئیڈیل تھے، میرا سب کچھ تھے۔ پس ان کے ایک جیلے نے ہمیشہ کیلئے میرے دل میں مولانا کی عظمت ثبت کر دی۔

نظہر اندہ دل کہیں بھی تیری انجمن کے بعد

باباجان اپنے مخصوص انداز میں ایک جملہ بولا کرتے تھے ”مفتی محمود روپیہ تھا، فضل الرحمن سوارو پیہ ہے“ باباجان ایک گوشہ نشین، غیر سیاسی اور انتہائی کم گفتگو تھے جن کا واحد مشغلہ، قرآن پاک کی پیہم تلاوت تھا۔ تبلیغ میں بیرون ملک تشکیل ہوئی، وہیں فوج کا حملہ ہوا، اسی بیماری میں 15 رمضان کی شب انتقال ہوا۔ بزرگوں نے بڑی بشارات سنائی ہیں۔ اللھم اغفرلہ۔



بابا مرحوم کے اس جملے کا پس منظر بھی بہت دلچسپ ہے۔ وہ نہ تو عالم تھے اور نہ ہی بہت پرانے تبلیغی۔ مگر یہ کہ شروع سے موحداً آدی تھے اور علمائے دیوبند کی عزت کرتے تھے۔ 1980ء میں مفتی محمود صاحب کا انتقال ہوا تو رائے وڈر مرکز سے مولانا جمشید صاحب مرحوم تعزیت کیلئے ذریعہ اسماعیل خان تشریف لائے۔ وقت وقت کی بات ہے، حضرت مرحوم ایک عام مسافر بس میں آئے تھے۔

اس زمانے میں ذریعہ کا تبلیغی مرکز ایک کچا برآمدہ یا ہال نما کمرہ ہوتا تھا اور تبلیغی حضرات میں سے صرف دو آدمیوں کے پاس گاڑیاں تھیں، جن میں ایک میرے محترم حاجی رشید دھپ صاحب کے پاس ایک جیپ ہوا کرتی تھی۔ میرے والد کے ایک دوست پرانے تبلیغی ساتھی، حاجی اسماعیل بھاغوی مرحوم نے بابا کو بتایا کہ ایک بڑے بزرگ تشریف لارہے ہیں، پس یہ لوگ ان کی زیارت کیلئے مرکز گئے، جہاں مولانا جمشید صاحب عبدالنیل جانے کو تیار کھڑے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے پاس ایک 1968 ماڈل ٹیوٹا کرونا ہوتی تھی۔ مولانا جمشید صاحب نے فرمایا کہ اسی گاڑی میں جائیں گے۔ بابا کے مزاج میں مروت بہت تھی، انکار تو نہ کیا، لیکن فرماتے تھے کہ میں بہت شرم محسوس کر رہا تھا کیونکہ گاڑی کے بریک کام نہیں کر رہے تھے۔ خدا کی شان، سفر میں گاڑی نے کوئی مسئلہ ہی پیدا نہیں کیا۔

عبدالنیل میں مولانا فضل الرحمن تعزیت وصول کر رہے تھے جو مولانا جمشید کو نہ پہچان سکے۔ بعد میں مجمع میں کسی نے پہچان کر اُدائی تو اٹھ کر ملے۔ بابا مرحوم نے بھی پہلی بار مولانا فضل الرحمن کو دیکھا تھا اور وہاں ہی پر یہ جملہ بولا تھا۔ لیکن ان کے اس جملے پر میرے ماموں مرحوم، جو کہ مولانا فضل الرحمن کے دیوانے تھے، وہ بھی چپیں بجھیں ہوئے کہ اس سے ان کو مفتی محمود کی شان ٹھنسی محسوس ہوتی تھی۔ خیر، ان کے بار بار استفسار پر ایک دن بابا مرحوم نے تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاسؒ کی مثال دے کر اپنی بات کی تشریح کی:

”مولوی الیاس، ایک روپیہ تھا اور اس کا بیٹا مولوی یوسف چار آنے تھا۔ جب مولوی الیاس، دنیا سے جانے لگا تو بیٹے کو گلے لگایا اور اپنا ایک روپیہ اس کے حوالے کر دیا۔ مولوی یوسف کے چار آنے کیساتھ یہ روپیہ مل گیا، پس وہ اسی وقت ہی سوار روپیہ ہو گیا۔ اسی طرح مفتی محمود بھی ایک روپیہ تھا اور فضل الرحمن چار آنے۔ لیکن مفتی صاحب نے جاتے ہوئے اپنا روپیہ فضل الرحمن کو دے دیا ہے، اب یہ سوار روپیہ ہے“

بابا مرحوم بہت کم آ میز شخص تھے۔ نہ تو تبلیغ والوں سے اور نہ ہی کسی اور سے زیادہ میل جول رکھتے تھے۔ حافظ قرآن بھی نہیں تھے اور نظر بھی کمزور تھی۔ لیکن دن بھر میں 6، 7 پارے قرآن کی تلاوت فرماتے تھے۔ بس یہی ان کا شوق تھا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ تبلیغ کے بڑے بزرگ بھی ہمارے گھر بابا سے ملنے آتے تھے اور مولانا فضل الرحمن بھی بطور خاص، قاری نواز اور چوہدری شریف کے ہمراہ آئے اور تقریباً دو



گھنٹے تک بیٹھے رہے۔ اس ملاقات کی خاص بات یہ کہ مولانا اور بابا مرحوم تقریباً چپ چاپ ہی بیٹھے رہے جبکہ قاری نواز مرحوم اور چوہدری صاحب میں کوئی شکر رنجی تھی، وہی آپس میں تکرار کرتے رہے۔ والد مرحوم کا تذکرہ ہے: لذیذ بود حکایت درازتر گفتیم۔ لکھنے کو بہت کچھ ہے، آنکھ بھرا آئی ہے، بس اتنا عرض کرتا ہوں کہ ان کو فوت ہوئے تیسرا روز تھا، میں دھوپ میں کھڑے ہو کر قبرستان کی چار دیواری بنوار ہاتھا۔ ہمارے کم سن بچے کو خواب میں آئے کہ چچا سے کہو، سائے میں آ جائے، دھوپ تیز ہے۔

رب ارحمہما کما ربانی صغیراً

برسبیل تذکرہ عرض کر دوں، خدا چوہدری شریف صاحب کی عمر میں برکت دے فلاحتی ہسپتال چلا رہے ہیں۔ جوانی میں وزیر اعلیٰ مفتی محمود کے پرسنل سیکرٹری تھے۔ کہتے ہیں سگے بیٹوں سے زیادہ مفتی صاحب کی خدمت کی، ان کے دیوانے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ شوگر کی وجہ سے مفتی صاحب کے پاؤں کا زخم ہر رات ہوتا تھا اور وضو کی وجہ سے دن میں تین بار پٹی تبدیل کرتا تھا۔ یہ مفتی صاحب کا تقویٰ تھا کہ اس تکلیف میں بھی تازہ وضو فرماتے۔ ورنہ خود ان کا تقویٰ تھا کہ اس حالت میں فقط مسح کیا جاسکتا ہے۔

### اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

کیڈٹ کالج کی پابند زندگی سے انجمن تریک پشاور کی آزاد فضاء میں داخلہ گویا دبے ہوئے سپرنگ کا کھل جانا تھا۔ 1986ء میں روسی رچ بچھ کا ٹیل میں در آ رہا تھا اور رائف ضیاء مذہبی آمریت کی ضد میں کمیونزم کا پرچارک بن کر ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل ہو چکا تھا۔ کیا زمانہ تھا کہ اپنے لیڈر جام ساقی صاحب کی عینک سے ایشیاء کو سرخ ہوتا دیکھتے، پوری رات کارل مارکس کی ”کپسی ٹال“ پہ بحثیں ہوتیں اور ملائیت کے اختتام کی پیش گوئیوں سے دل بہلایا جاتا۔ مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا، وہ نوجوان جو مودودی پیروکاروں کو علمی مناظرے کا چیلنج دیتا تھا، تبلیغی سادہ خیلوں کے دام میں گرفتار ہو گیا۔ ابھی تو ٹور انقلاب کا ”ان“ بھی نہیں چھو اتھا کہ تبلیغ میں ”ان“ ہو گئے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانہ کے اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے شنید ہے کہ ہمارے پیشوا جام ساقی صاحب بھی آخری عمر میں تبلیغی جماعت کے کشتہ گان میں شامل ہو گئے تھے، تبلیغ والوں کے ساتھ پھرتے ہوئے، عملی سیاسی سرگرمیوں کا جاری رہنا ناممکن تھا لیکن یہ کہ: دل سے شوق رخ کو نہ گیا جہاں نکلتا کتنا کبھو نہ گیا

نوجوانی شعبہ جنون ہے۔ اس عمر میں کچھ کر گزرنے کی شدید خواہش ہوا کرتی ہے جو تبلیغی جماعت کے



ٹھنڈے مزاج سے لگاؤ نہیں کھاتی۔ تبلیغ میں لگے نوجوان لہو گرم رکھنے کا راستہ تلاشتے رہتے ہیں۔ دو قسم کے تبلیغی نوجوان ہوتے ہیں، دینی مدارس یا دیہاتی علاقوں والے اور دوسرے، شہری یا کالجوں والے۔ پہلے والے تبلیغی نوجوان، جہادی تنظیموں یا سپاہ صحابہ میں شامل ہو کر تسکین پاتے ہیں تو دوسرے گروپ کو عمران خان کی صورت ”ایک نعبہ وایاک نستعین“، فیم جماعت نے اچک لیا ہے۔

راقم کے زمانہ طالب علمی میں تحریک انصاف تو موجود نہ تھی تاہم جماعت اسلامی کا پلیٹ فارم موجود تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے جماعت اسلامی سے کبھی لگاؤ نہ ہوسکا۔ حالانکہ میں نے ذاتی و دینی مطالعہ کی ابتدا ہی تفہیم القرآن سے کی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ دینی ماحول کی پہلی میٹھی مجھے تبلیغی جماعت کی طرف سے میسر آئی لیکن وہاں تو فضائل کی کتب کے علاوہ کوئی اور مطالعہ، گویا درجہ کراہت میں داخل تھا۔

انجینئرنگ یونیورسٹی پشاور میں پہلا سال ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس میں گزارنے کے بعد، دوسرے سال راقم نے اپنے علاقے کے طلبا کیلئے گولڈ سٹوڈنٹس سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ تیسرے سال میں جمعیت طلباء اسلام قائم کی اور چوتھے سال میں انجمن سپاہ صحابہ کی تشکیل کی۔ جمعیت طلباء اسلام جو کہ جمعیت علماء اسلام کی ذیلی تنظیم تھی، شاید کبھی انجینئرنگ یونیورسٹی میں متحرک رہی ہو، مگر ہمارے زمانے میں اس کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ راقم ہی نے اس کی بنیاد رکھی مگر اس کا پس منظر، سیاسی نہیں تھا بلکہ محض ایک اتفاق تھا۔

وجہ یہ بنی تھی کہ پختون سٹوڈنٹس، پبلز سٹوڈنٹس، ڈیموکریٹک وغیرہ نے یونیورسٹی میں ایک تقریری مقابلہ بعنوان ”اسلام میں پردہ ضروری ہے یا نہیں؟“ منعقد کرنے کا اعلان کیا تھا جسے روکنے کیلئے، اسلامی جمعیت کے لڑکے وائس چانسلر کے پاس گئے تو ڈاکٹر جمال نے یہ عذر رکھا کہ ایونٹ کی حمایت میں تین تنظیمیں ہیں اور مخالفت میں آپ کی واحد پارٹی ہے۔ ان کی اس مشکل کا حل میں نے یہ نکالا کہ اسی رات اپنے کمرے میں جمعیت طلباء قائم کی۔ بنوں کے ایک لڑکے شہاب الدین کو ناظم بنا کر جمعیت طلبائے اسلام کے ہاتھ سے لکھے پوسٹر ہائلز میں چپکا دیئے۔ ان کے ساتھ دو اور تنظیموں کا اتحاد بھی کروا کر، مجوزہ پروگرام وی سی سے بند کروا دیا (جو کہ پہلے ہی جماعت اسلامی کے حامی تھے) سنا ہے بعد میں شہاب الدین صاحب نے جمعیت علماء اسلام میں کافی ترقی کی۔

برسبیل تذکرہ، سپاہ صحابہ کے قیام کا پس منظر بھی سنئے جائیے:

اس زمانے میں، ”انجمن سپاہ صحابہ“ ہی نام ہوا کرتا تھا، جس کے بانی مولانا حق نواز جھنگویؒ بڑے قادر الکلام خطیب تھے، لیکن راقم کو ان کے اہل تشیع کے خلاف دئے گئے حوالہ جات پہ اطمینان نہیں تھا۔



ایک لاہوری دوست کے ذریعے جامعہ السنظر سے چند کتابیں خود منگوائیں جن میں تاریخ اسلام (بشیر انصاری) اور تجلیات صداقت (مفتی مقبول حسین) کے نام یاد ہیں۔ مولانا جھنگوی کے دئے گئے حوالہ جات درست پائے اور مولانا ایثار القاسمی کی شہادت کے دن ہم چار دوستوں نے انجمن سپاہ صحابہ کی بنیاد رکھی۔ مگر مولانا فضل الرحمن سپاہ صحابہ کی ترتیب کے علاوہ مخالف تھے، پس جمعیت اور سپاہ صحابہ ایک ساتھ نہیں چل سکتی تھیں، لہذا ہم نے یہ بساط پلیٹ دی۔

یونیورسٹی کے دنوں میں ہی جنرل ضیا الحق کا سانحہ ارتحال ہوا اور 1988 کے الیکشن منعقد ہوئے تو ہم نے ڈیرہ جاکر بھرپور حصہ لیا۔ جمعیت علماء اسلام میں ہمارے تین عدد دوست، یعنی ماسٹر ایاز مرحوم، قاری اشرف اور حافظ شاہد، ہمیں ہر جلسے جلوس میں ساتھ لئے پھرتے۔ شاعری کا روگ بھی پالا ہوا تھا اور مولانا فضل الرحمن کی مدح میں چار نظمیں بزبان اردو، انگریزی، پشتو اور سرائیکی لکھی تھیں۔ موخر الذکر دو نظمیں، عوامی رنگ میں تھیں۔ پس حق نواز پارک ڈیرہ کے ایک بڑے جلسے میں اپنے مخصوص ترنم سے پڑھیں اور انبوه کثیر سے داد پائی۔ فنی لحاظ سے ان نظموں میں خیال آفرینی کا عنصر کم تھا، مگر عوامی نظمیں تھیں۔ ازراہ یادداشت، دو دوشعر یہاں لکھ دیتا ہوں:

عمل کے دے اخلاص لری، زڑہ کے دے قرآن دے

دا فضل الرحمن دے ..... او دا فضل الرحمن دے

یہ ٹیپ کا مصرعہ کا تھا:

Team OFFICIAL JAMIAT

ستا بلند اقبال دی، قسمت داسے ہر چاہ نہ شی

تا غوندے لیڈر بہ جاہل کور کے ہولنا نہ شی

سو کے مقابلہ کوی، دا گزراو دا میدان دے

دا فضل الرحمن دے، دا فضل الرحمن دے

داسے ننگلیالی زمونگ دا قام وطن گلو نہ دی

دونی خواڑہ خیالونہ او دونی اجت عملونہ دی

سلیم دا ہر تن دے سرہ، کہ زڑہ دے مسلمان دے

دا فضل الرحمن دے ..... او دا فضل الرحمن دے

اسی طرح سرائیکی نظم کا اپنا ایک لہجہ تھا، نمونہ دیکھئے:

لوکاں مردے گھر در چھوڑن یا چھوڑا سامان اے



مفتی دی میراث کچھ نہیں، ہک فضل الرحمن اے،

مردے جیندے عہد کریسوں، جیڈا ساتھ بھیدے رسوں.....

ووت تاں کھڑی شے اے ڈھولا خون دے عطیے ڈیندے رسوں

سلیم اساڈی گال ہے ہکا، اے ساڈا ایمان اے

مفتی دی میراث کچھ نہ نہیں، ہک فضل الرحمن اے

قصہ کوتاہ، مولانا فضل الرحمن 1988 کا الیکشن بھاری اکثریت سے جیت گئے۔ مولانا کے 65 ہزار اور ان کے مد مقابل، اسلامی جمہوری اتحاد کے فضل کریم خان کے 33 ہزار ووٹ تھے، یہی فضل کریم خان اگلے الیکشن یعنی 1990 میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایم این اے بنے۔

1993ء میں ایم این اے منتخب ہونے کے بعد مولانا نے قومی اسمبلی میں امور خارجہ کمیٹی کے چیئرمین کا عہدہ سنبھال لیا۔ ہمارے جمیعت کے دوست بھی اس پہ حیران تھے کیونکہ ان کے خیال میں بھی مولانا صاحبان کو فقط مذہبی ذمہ داریاں لینا چاہیے تھیں۔ راقم نے بچپن میں تحریک ریشی رومال کی تفصیل پڑھ رکھی تھی، پس اچنبھا نہ ہوا۔ جس کا کام اسی کو سا جھے، یہ علمائے دیوبند کا ہی منصب تھا۔ یہ مولانا عبید اللہ سندھی کی مسند مفتی جو بحال ہو گئی تھی۔ مولانا نے خارجہ امور کے پلیٹ فارم کو استعمال کر کے اپنی جماعت کو بین الاقوامی فورم پہ شناخت عطا کی اور اپنے فہم کا لوہا دنیا بھر سے منوا کر، جماعت اسلامی سے ان کی مزعومہ بین الاقوامی حیثیت چھین لی۔

Team OFFICIALJAMIA

توبہ میری جام شکن، جام مئے توبہ شکن:

پشاور یونیورسٹی سے 1990ء میں فراغت ہوئی تو تبلیغ میں چار ماہ کیلئے چلے گئے یعنی سیاست جے تبلیغی ماحول میں لایا یعنی سمجھا جاتا ہے، اس سے گویا توبہ کر لی۔ مگر یہ توبہ 2002ء کے الیکشن تک تھی۔ ہو گئی توبہ کو اک مدت کسے اب یاد ہے اصطلاحاً ہم نے کیا رکھا تھا ایمانے کا نام

راقم نے اپنے اس خالص تبلیغی دور میں، زیادہ وقت ”امت پنے“ کی سوچ میں گذرا۔ سب کو ساتھ لیکر چلنے کی روانوی مگر ناممکن تمنا عروج پر تھی۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے تعلق خاطر تھا۔ قاضی حسین احمد صاحب امیر جماعت اسلامی سے بوجہ، ایک عقیدت تھی۔ 1997ء میں تبلیغی جماعت، تنظیم اسلامی اور جماعت اسلامی کو قریب لانے کیلئے ایک کتابچہ لکھا تھا جس کے جواب میں محترم قاضی صاحب نے راقم کو جو خط ارسال فرمایا، اس کی تصویر بھی اسی کتاب میں شامل اشاعت ہے۔ اس خط کے لگانے کے تین



مقاصد ہیں، ایک تو قاضی صاحب کی انسان نواز دردمند شخصیت کا بیان کہ انہوں نے ایک غیر معروف، پسماندہ علاقے کے نوجوان لکھاری کی تحریر پڑھنے کو وقت نکالا اور اس پہ نقد لکھا۔ یہ امت کے لئے ان کے درد دل کا مظہر ہے۔ دوسرے، اپنے قارئین کو یہ بتانا کہ مجھے جماعت اسلامی سے خدا واسطے کا پیر نہیں تھا تیسرے یہ طفلانہ بڑھک کہ اگر قاضی صاحب کے ذہن میں متحدہ مجلس عمل کا خیال آیا تو اس کی آبیاری میں اس کمترین کے مذکورہ کتابچے کا بھی کوئی حصہ ہے۔ میں عرض کر دوں، قاضی صاحب کا پاک خمیر، جماعت اسلامی سے شہرہ برابر لگاؤ نہیں کھاتا تھا۔ کوئی انسان معصوم نہیں ہو سکتا، ان سے بھی غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی اور یہ غلطیاں جماعت اسلامی کی صحبت بد کا نتیجہ ہوں گی۔ گمان کرتا ہوں، وہ جماعت اسلامی میں نہ چھپتے تو تزکیہ و تصوف کے مسند نشین ہوتے۔

بہر حال 1990 تا 2002 کا دور جمعیت علماء کی سیاست سے دور اور پاکستان کے مختلف پراجیکٹس کی تکمیل پہ لگا۔ تاہم اس دوران جس پراجیکٹ پہ بھی نوکری کی (جس کا دورانیہ عموماً بہت کم ہوا کرتا تھا) وہاں یہ ضرور ثابت آئے کہ دیوبندی خمیر، دبے یا جھکنے والا نہیں ہوا کرتا۔ یہ اعجاز ہے، حسن آوارگی کا..... جہاں بھی گئے، داستاں چھوڑ آئے

اس دوران، ایسا وقت بھی آیا کہ ملکی اخبارات میں راقم کا نام لے کر ایک خبر شائع ہوئی جس میں افغان شہریت کیلئے درخواست کا تذکرہ تھا۔ امریکہ نے افغانستان پہ حملہ کی ٹھان لی تھی۔ کمانڈر صدر، ایک فون پہ ڈھیر ہو کر ملک ان کے حوالے کرنے لگا تھا۔ حق ٹھک ادا کرنے پر وزیر مشرف نے بیان دیا تھا کہ ”طالبان اقلیت کے دن گنے جا چکے ہیں“ راقم اسلام آباد پہنچا، افغان سفارت خانے میں ڈپٹی سفیر عبدالقادر شاہین کے ہمراہ پریس والوں کو بلا اور یہ بیان دیا کہ میرے ملک کے صدر نے چونکہ میرے جیسے موقف رکھنے والوں کو اقلیت قرار دیتے ہوئے ختم کرنے کی دھمکی دی ہے پس میں افغان سینیٹرز شپ کی درخواست کرنے آیا ہوں۔ یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں تھا مگر پریس کو ایسی چٹ پٹی خبروں کو تلاش ہوا کرتی ہے۔ پس اسے نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

جنرل پرویز مشرف کی حکومت، پاکستان کیلئے ایک خوش تھی، مگر اس شر سے ایک خیر برآمد ہوئی اور وہ متحدہ مجلس عمل کی صورت گری تھی۔ پرویز مشرف کا دور تہہ در تہہ سازشوں کا دور تھا، ہر کوئی اپنے پتے کھیل رہا تھا۔ متحدہ مجلس عمل شاید ہماری ایجنسیوں کی چاہت رہی ہوگی لیکن ان کے اپنے مقاصد تھے۔ دینی جماعتوں کا اتحاد مولانا فضل الرحمن اور قاضی حسین احمد مرحوم کی بھی قلبی خواہش تھی۔ ہر ایک کے اپنے اہداف



تھے، دینی جماعتوں کے ہر اتحاد میں رخنہ ڈالنے والی ہماری ایجنسیاں اس بار خاموش تھیں تو سکون سے یہ اتحاد وجود میں آیا اور اس کے دور رس اثرات ہر جگہ پڑے۔ قوم کے سرکردہ لوگ جب ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں تو مقبوعین میں نفرتیں ختم ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اس کا درست اندازہ ہم کو تبلیغی جماعت میں ہوا۔ پنجاب میں تبلیغ والوں کے سخت مخالف بریلوی حضرات تھے، کئی بار ہم کو ان کی سماج سے بزدل نکالا گیا تھا، مگر متحدہ مجلس عمل وجود میں آئی، ہماری تشکیل قصور کے ایک گاؤں کی بریلوی مسجد میں تھی۔ امام صاحب نے خوش دلی سے ویلکم کیا ”ہن تے اسی سارے ایک ہو گئے آں“ کاش، جماعت اسلامی اپنی منافقانہ اور ایجنسیانہ اطوار کی بنا پر اس اتحاد کو ختم نہ کرتی تو امت کا بڑا فائدہ ہوتا۔ جن باتوں کو بنیاد بنا کر، جماعت اسلامی نے یہ اتحاد ختم کیا تھا، آج ان سے کہیں زیادہ بدتر حالات میں وہ تحریک انصاف کے اتحادی ہیں حالانکہ تحریک انصاف نے کئی بار دھکارنے کے اشارے بھی دیئے ہیں۔

### میں اپنے ہی جیسوں کو کبھی پوجتا نہیں

پھر الیکشن کا اعلان ہو گیا، اس وقت تک سوچ میں یہ سوالات اٹھنا شروع ہو گئے تھے کہ علماء سے خرپوزہ کاٹنے کی سنت پوجھنا اگر ضروری ہے تو ملکی حالات سدھارنے ووٹ کے استعمال بارے پوجھنا کیوں ضروری نہیں؟ اب ایک بار پھر جمعیت علماء اسلام کی محبت نے سر ابھارا۔ انہی دنوں راقم تبلیغی مرکز رائے وٹ میں تشکیل میں تھا۔ مولانا فضل الرحمن کیلئے ایک نظم لکھ کر لاہور سے ہی چھپوا کر مرکز سے باہر لوگوں میں تقسیم کی، نظم یہ تھی:

### ابن مفتی محمود / Official Jamiat

مولوی رہا ہوں، نہ ہوں مولوی پرست  
انگریزی خواں ہوں پر نہیں انگریز کی بیعت  
گو خود کو عقل کل سمجھتا سوچھتا نہیں  
ہر نوع کی مجلس کی خاک چھانتا ہوں میں  
سیاست میں کچھ سوداگری بھی مانتا ہوں میں  
کوئی انسان سارے عیب سے پاک ہو نہیں سکتا  
ناقص سہی پر ہے مرے وجدان کا فتویٰ  
جاتے ہوئے مفتی نے تو چھوڑی نہ تھی دنیا

میں نے نہ اپنی مفتی سا کوئی دوسرا دیکھا  
کیا تم کو وراثت ملی تدبیر کی مایا؟



اللہ تیری قوت تہدیر بدھائے امت کا خوابیدہ مقدر تو جگائے  
جتنا بھی کوئی خوب ہو کیا کل کا بھروسہ؟ کیا آدم کی ضمانت کہ ہو ایسا، نہ ہو ایسا  
زمانے میں بہت بھاری ہے ایمان پہ پیسہ پر ڈھونڈ تو پاؤ گے نہ مولانا کے جیسا  
اعداء کی شہادت ہے یہ اب تک بکا نہیں فی زمانہ، سوچ، کیا یہ معجزہ نہیں؟  
اس نظم کا خاصہ یہ بھی ہے کہ راقم نے اس نظم کو ایم ایم اے کی اس پہلی کارزمیننگ میں مولانا کے  
سامنے پڑھا جو مسلم بازار میں حالیہ واقعہ بلور پلازہ کے خالی پلاٹ پہ منعقد ہوئی تھی۔

انہی دنوں یعنی 2002ء کے الیکشن سے کچھ دن پہلے، مکہ معظمہ میں مقیم، پیر طریقت حضرت حاجی  
عبد المنان صاحب مدظلہ، جمعیت کی حوصلہ افزائی کے لئے پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ جہاں تک  
یاد پڑتا ہے وہ جمعیت کیلئے 5 لاکھ روپے چندہ لائے تھے، جو ہرٹان لاہور میں ان کے کسی مرید کے بنگلے  
پر لاہور کے دینی مراکز کے دورے کا پروگرام بن رہا تھا۔ حضرت نے میری درخواست پر رائے وٹڈ مرکز  
کو اپنے شیڈول میں شامل فرمایا۔

جمعہ کا دن تھا کہ ہم تقریباً 15 آدمی جن میں سے سوائے مفتی شیر محمد صاحب (جامعہ اشرفیہ والے)  
سب ایگزیکٹو پوسٹوں والے لوگ تھے، حضرت کی قیادت میں رائے وٹڈ میں حاجی عبدالوہاب صاحب  
وامت برکاتہم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت پرانے مرکز کے مینار والے برآمدے کے نیچے، ان کا  
کمرہ تھا، جہاں وہ نماز جمعہ کی تیاری کر رہے تھے۔

مولانا فضل الرحمن کے ضمن میں بات چل پڑی تو حاجی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ایک لمبا  
واقعہ سنایا جس کی تلخیص میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ فرمایا: ”دیوبند مدرسہ میں دو طالعلم بہت ممتاز تھے اور  
ہر درجہ میں ان کی مسابقت ہوتی۔ بھی ایک اول آتا تو بھی دوسرا فراغت کے بعد ایک وہیں اور دوسرا  
مدرسہ میں مدرس ہو گیا۔ جب پاکستان بن گیا تو ان دونوں نے پاکستان کو ہجرت کی، جس پر قاری محمد طیب  
صاحب (مہتمم دارالعلوم دیوبند) نے فرمایا کہ پاکستان والے دیوبند کا کھن لے گئے ہیں، ایک تو  
مولانا غلام اللہ خان صاحب (پنڈی والے) تھے، دوسرے مولانا عبدالواحد صاحب (گوجرانوالہ والے)  
تھے۔ ثانی الذکر ہماری رائے وٹڈ کی شوری کے رکن بھی تھے اور جمعیت علماء اسلام کی شوری کے بھی۔ مفتی محمود  
صاحب کی وفات کے بعد خانپور میں جمعیت کی شوری کا اجلاس ہوا جس میں ان کی جگہ پر نئے ناظم عمومی کا  
انتخاب ہونا تھا۔ انہی دنوں ہمارا رانیوٹڈ کا ماہانہ مشورہ بھی تھا، میں نے مولانا عبدالواحد کو رائے وٹڈ میں



دیکھا تو کہا کہ: حضرت! آج تو آپ کو خانپور ہونا چاہئے تھا کیونکہ وہاں آپ کی زیادہ ضرورت تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں، صرف یہ مشورہ تھا کہ مفتی صاحب کی جگہ کون مناسب ہے، تو میں نے اپنی رائے لکھ کر دے دی ہے، وہاں میرا خود جانا اتنا ضروری نہیں۔ میں نے پوچھا: آپ نے کس کا نام لکھا ہے؟ تو کہا کہ مولانا فضل الرحمن کا۔ میں اس وقت تک مولانا فضل الرحمن سے واقف نہیں تھا۔ میں نے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ فرمایا: یہ مفتی محمود کے صاحبزادے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جس آدمی پر مولانا عبد الوہاب اعتماد کرتے ہیں، پھر تو وہ بہت خوب آدمی ہوگا۔

امانت میں خیانت ہوگی، اگر میں حاجی صاحب کا ایک جملہ یہاں ذکر نہ کروں جس کے کئی معنی نکل سکتے ہیں۔ فرمایا: ”میں نے مولوی فضل الرحمن سے کہا تو سات چلے بھی نہیں لگتا؟“ تو اس نے کہا: حضرت! آپ میرے کام کو دین کا کام نہیں سمجھتے؟“ میں نے کہا: ”میں تو اپنے کام کو بھی دین کا کام نہیں سمجھتا اگر اللہ کے لئے نہ ہو۔“

چونکہ خاکسار کو ذاتی طور پر اس سے پہلے اور بعد حاجی صاحب کی مولانا سے محبت کا علم ہے تو میں اس جملہ کو دینی مذاکرے کا حصہ سمجھتا ہوں۔ باقی آپ اپنے ذوق کے مطابق اس کے معنی لے لیں، کوئی پابندی نہیں۔

الیکشن سے دو دن قبل میں ڈیرہ پانچا اور دین پور سمیت تین پولنگ شیٹوں کی ذمہ داری مجھے دی گئی۔ ہم نے تبلیغی مزاج کے مطابق، ساتھیوں کی ایک جماعت کو الیکشن کے روز مسجد میں ذکر و نوافل پڑھا دیا۔ شام کو بھاری اکثریت سے حیات گئے۔ اب رزلٹ کو جمعیت کے مرکزی دفتر یعنی جامعہ معارف الشرعیہ سرکلر روڈ لے جانا تھا، وہ جمعرات کی شام تھی۔ میں نے رزلٹ جمعیت کے کارکنان کے حوالے کیا اور خود ساتھیوں سمیت، شب جمعہ کیلئے مرکز چلے گئے کہ ہمارا کام ختم ہو گیا تھا۔ یہ کارکنان نعرے لگاتے، اچھلتے کودتے اپنی طرز پر جلوس کی شکل میں مرکزی دفتر گئے۔

یہ تفصیل میں نے آپ کو کیوں سنائی؟ دیکھئے، دین کے مختلف شعبہ جات کے لئے مختلف استعداد کے لوگ درکار ہوا کرتے ہیں۔ ایک مجاہد کو چھ نمبر میں بیان کرنا نہ آتا ہو مگر اس کو اسلحہ چلانا آنا چاہیے اور بدنی قوت مضبوط ہونا چاہئے۔ تبلیغی کارکن کیلئے تقویٰ اور اخلاق، سر جھکا کر چلنا ہی اس کے شعبے کی ضرورت ہے۔ ایک عالم دین کے ذیل ڈول کو نہیں، اس کے دماغ کی قوت کو دیکھنا ضروری ہے۔ خطیب کیلئے جوش و رقت، مناظر کیلئے برجستگی اور نکتہ آفرینی چاہیے ہوتی ہے۔ اسی طرح سیاسی کارکنان کیلئے بھی عوامی مزاج، جوڑ توڑ اور داؤ پیچ سے معرفت لازمی ہے۔ پس بعض اوقات ایک شعبہ کا عیب، دوسرے کی خوبی بن جایا کرتا



ہے، ایک ہی عینک سے سب کو دیکھا تو اعتراضات اٹھیں گے۔

### ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

اکتوبر 2002ء میں انکیشن منعقد ہوئے جس میں ایم ایم اے نے صوبائی اسمبلی کی 110 میں سے 75 کے قریب سیٹیں جیت لیں جس میں سے جمعیت علماء کی 45 کے قریب سیٹیں تھیں۔ یہ اصول طے ہوا تھا کہ جس جماعت کی اکثریت ہوگی، وہ اپنا وزیر اعلیٰ لائے گی۔ پس اسی اصول کے تحت مولانا فضل الرحمن نے جناب اکرم درانی کو وزیر اعلیٰ نامزد کر دیا۔ ڈیرہ کا ہر آدمی جانتا ہے کہ اگر چوہدری شریف صاحب، معمولی مارجن سے ہار نہ جاتے تو مولانا کی پہلی چوٹس وہی تھے۔ جمعیت کے اکثر ممبران پہلی بار اسمبلی پہنچے تھے۔ اکرام درانی کو خاندانی پس منظر کی بناء پر اور تیسری بار منتخب ہونے کی بناء پر یا کسی بھی وجہ سے جمعیت نے نامزد کیا تو جماعت اسلامی کو اس سے کوئی غرض نہ ہونا چاہیے تھی کہ اب یہ جمعیت کا ذاتی استحقاق تھا، مگر وہ جماعت اسلامی ہی کیا جو کوئی حرکت نہ کرے؟ جماعت اسلامی کے صوبائی امیر پروفیسر ابراہیم صاحب نے پریس کانفرنس کر ڈالی کہ داڑھی منڈے کو وزیر اعلیٰ کیسے برداشت کیا جائے گا؟ (جی وہی پروفیسر ابراہیم جسے تحریک طالبان نے اپنا ثالث مقرر کیا تھا) اب سوچئے! کہ ایک تو یہ انتظامی معاملہ تھا جس کا تعلق بھی جمعیت علماء سے تھا۔ جماعت اسلامی کو اصولاً اس میں دخل اندازی کا بھی حق نہیں تھا اور اگر کوئی اعتراض تھا بھی، تو پریس کانفرنس کر کے اتحادی جماعت کا نتیجہ خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر داڑھی کا معاملہ اگر سیریس ہو تو دایوبندی علماء کیلئے ہو، جماعت اسلامی تو داڑھی کو سنت مانتی ہی نہیں تھی۔ اگر پروفیسر کے نزدیک داڑھی نہ ہونا اتنا کفر تھا تو اسی وقت سے ہی اعتراض کرتے، جب اکرم درانی کو جمعیت نے صوبائی اسمبلی کا امیدوار نامزد کیا تھا۔

یہ تو ایم ایم اے کے اولیس ایام کی داستان ہے۔ اس کے بعد پانچ سال تک جماعت اسلامی جس طرح جمعیت کو زک پہنچانے کی کوشش کرتی رہی، وہ ایک لمبی داستان ہے۔

میں جمعیت علماء اسلام کے اکابر سے دست بستہ گزارش کروں گا کہ دوبارہ کبھی جماعت اسلامی کے ساتھ اتحاد کا سوچیں بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اکابر اونچ نیچ سے زیادہ واقف ہیں مجھے معلوم ہے جو کچھ میں نے جماعت اسلامی بارے لکھا ہے، یہ بھی مولانا کی طبیعت پہ گراں گذرے گا کہ مولانا کا سینہ سمندر ہے اور کسی دینی جماعت کو برسر بازار عریاں نہیں دیکھنا چاہتے۔ مگر راقم کا بہر حال، اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ کھلی منافقت پہ خاموش رہوں۔



انتخابات کے نتائج کے اعلان کے بعد فائز کے ان سات ممبران کو جو کتاب کے نشان پہ منتخب ہوئے تھے، ان کو جنرل مشرف نے آزاد امیدوار قرار دے دیا اور یوں ایم ایم اے کے ارکان کی تعداد مزید کم کر دی گئی (وہ لوگ توجہ فرمائیں جو کہتے ہیں کہ پرویز مشرف ایم ایم اے کو لانا چاہتا تھا) وزیراعظم کے چناؤ کیلئے کھلی دوئنگ میں اصل مقابلہ جنرل مشرف کے امیدوار ظفر اللہ جمالی اور مولانا فضل الرحمن میں تھا۔ عمران خان نے اپنا ووٹ مولانا کو دیا۔ جبکہ ظفر اللہ کو شخص ایک ووٹ کی برتری سے سادہ اکثریت حاصل ہوئی اور ووٹ سپاہ صحابہ کے مولانا اعظم طارق کا تھا۔ ناطقہ سربرگریاں ہے، اسے کیا کہئے؟

### دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی ظرف

ایم ایم کے دور حکومت میں صوبوں کو وہ حقوق نہیں ملے تھے جو اٹھارویں ترمیم کے بعد ملے مگر اسے باوجود، ریکارڈ ترقیاتی کام ہوئے۔ میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں جمعیت نے نوکریاں دلوائیں مگر ہمارے معاشرے میں، کسی کے احسان کا تذکرہ کم ہی ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ پراپیگنڈہ بہت کیا گیا کہ مولوی، چندے کے نام پر رشوت لیکر نوکریاں دلواتے ہیں۔ میں اس پوزیشن میں نہیں کہ اس پر رائے دے سکوں۔ انسان بہت پیچیدہ مشین ہے۔ اگر قرون اولیٰ میں پیسہ کی بابت بات چلی ہو تو آج بھی عین ممکن ہے کہ یہاں دنیاوی معاملات زیادہ ہیں۔ مگر راقم کا اس زمانے میں بھی اور آج بھی یہ چیخ برقرار ہے کہ کوئی ایسا بندہ ملے جس نے خود مولانا فضل الرحمن کو رشوت دی ہو، کوئی نہیں ملا۔

البتہ بہت ہی انیسویں سے عرض کرتا ہوں کہ صرف ایک شخص ایسا ملا تھا جس نے مکہ میں حج کے دنوں میں یہ دعویٰ کیا کہ اس نے اور ایکسٹن شمر شاہ نے خود مولانا کو 20 لاکھ روپے رشوت دی۔ یہ تہمت بڑی تہمت تھی، اس محفل کے گواہ موجود ہیں جس میں اس کا جھوٹ اسی کے سامنے ثابت ہو گیا تھا۔ وہ باریش اور معزز شخص تھا، میں سمجھتا ہوں ایسی پاک جگہ پہ بیٹھ کر، ان پاک ایام میں علماء کے سرخیل پہ ایسا بہتان لگانا بہت بڑی بات تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس شخص نے خود کشی کر لی۔ اللہ اس کو اور ہم سب کو معاف کرے۔ تہمت تو کسی پہ بھی نہیں لگانا چاہئے مگر علماء کے باب میں خصوصی احتیاط کی درخواست کروں گا۔

مگر مولانا کیخلاف عوامی فضاء بنانے میں انہوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہمارے تبلیغی ساتھیوں کا فارمولا ہے کہ پہلے کسی کا دل لو پھر دل لو۔ آج کل علماء کو برا بھلا کہنا فیشن بن چکا ہے اور کم فہم تبلیغی حضرات اہل محفل کی ہاں میں ہاں ملا کر بلکہ ایک ہاتھ آگے بڑھ کر سیاسی علماء کیخلاف تبصرہ کر کے سمجھتے ہیں کہ وہ بندہ وصول کر لیں گے۔ ہو سکتا ہے بندہ وصول ہو جائے مگر خدا کی رضا وصول ہونا زیادہ اہم ہے۔ کاش یہ ہدف مد نظر رہے۔



میں آپ کو ایک ذاتی واقعہ سنا تا ہوں جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اندیشہ غم زیب داستان کے لئے کیا کچھ بڑھ چکا ہے:

”ہمارے ایک عزیز نے جو باہر ملک میں وقت لگا آئے تھے، راقم کیلئے اپنے گھر میں ضیافت کا بندوبست کیا۔ حاضرین محفل نے سیاست اور پھر دبے لفظوں مولانا فضل الرحمن بارے لب کشائی شروع کر دی۔ میزبان نے فرمایا کہ میرا بیٹا ہائی سکول نمبر ایک ڈیرہ میں بطور پرائیوٹ امیڈارڈ ہم (10th) کے بورڈ کا امتحان دے رہا ہے جبکہ مولانا کا بیٹا احمد محمود بھی وہیں امتحان دے رہا ہے۔ باقی بچے زمین پہ بیٹھ کر پرے چل کر رہے ہیں جبکہ مولانا کے بیٹے کیلئے کارپٹ لایا جاتا ہے۔ چونکہ یہ ایک ثقہ گواہی تھی، پس میں نے کھانے سے ہاتھ روک دیئے اور کہا کہ بچے کو ابھی حاضر کیا جائے۔ پہلے تو طرح دینے کی کوشش کی لیکن میرے اصرار پر اس کو بلایا گیا جو کہ خود مولانا طارق جمیل کے مدرسے کا طالب علم تھا اور وہ ہم کا امتحان دینے ڈیرہ آیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ سکول میں فرنیچر کم ہے جس پر ریگولر سٹوڈنٹس بیٹھ کر امتحان دیتے ہیں۔ پرائیوٹ امیڈارڈ بچے لان پہ بیٹھا کرتے ہیں۔ پہلے دن ہم سب یعنی احمد محمود سمیت نیچے لان پہ ہی بیٹھے۔ دوسرے دن سے احمد محمود اپنے ساتھ جائے نماز لاتا ہے، جس پر بیٹھ کر پڑھتا ہے۔ اس جائے نماز کو ہمارے ”بزرگوں“ نے قالین بنا کر پیش کر دیا۔ وہ بیان میں رہے، تو میز کے لیڈر کے بیٹے کے پرچے اس کی بیٹھک میں جا کر بھی چل گئے جاتے تو انہوں نے نہ ہوتی۔

یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر

سوباتوں کی ایک بات یہ کہ اہل حق کو ملامت کا سامنا کرنا ہی ہوگا، اس لئے کہ آمرون بالمعروف کی دعاء میں لوم لائم کے الفاظ درج ہیں۔ اگر خلفاء راشدین کو 15 سو سال بعد بھی نہیں بخشا گیا تو مولانا فضل الرحمن کس کمیت کی مولیٰ ہے؟ البتہ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اہل حق کے دفاع میں آگے آتے ہیں یہ کسی اور پہ نہیں بلکہ خود پہ احسان ہے، جو آدی کسی مسلمان کی آبرو کی حفاظت ایسے وقت کرتا ہے جب وہ خود نہیں کر سکتا تو خدا بھی اس کی آبرو کی حفاظت، ایسے ہی کڑے وقت میں کیا کرتا ہے۔ تحدیث بالعمۃ اور ساتھیوں کے استفادے کیلئے عرض کرتا ہوں۔ حاجی عبدالرشید دھپ صاحب میرے محترم دوست ہیں اور مولانا کے بہت قریبی اور بنیادی ساتھی ہیں۔ انہوں نے ایک بار راقم سے اصرار کیا کہ ہر جگہ مولانا کی پر جوش و کالت کرنے پر آپ کی ہم مولانا سے خصوصی ملاقات کا اہتمام کریں گے۔ عرض کیا کہ میں مولانا کی وکالت اسلئے کیا کرتا ہوں کہ اس کے کام کو حق اور دین کا کام سمجھتا ہوں، پس میں صدق



دل سے سمجھتا ہوں کہ مولانا ایک بڑے محاذ پہ معروف ہیں طبیب اور میں مولانا سے ملاقات کر کے اسکے قیمتی وقت کے چند منٹ ضائع نہیں کرنا چاہتا، اور خدا نخواستہ اگر میرا گمان صحیح نہیں تو پھر میں اپنے چند لمحات کا ضیاع نہیں چاہتا۔

جہاں تک جمعیت علماء اسلام کا تعلق ہے یہ ہمارے بزرگوں کا ورثہ ہے جس سے نسبت سعادت کی علامت ہے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد عبداللہ صاحب (بھکر) کے شاگرد خاص مولانا فرید صاحب (ڈیرہ اسماعیل خان) راوی ہیں کہ حضرت کو غسل دیتے وقت ان کی وصیت کے مطابق جمعیت کا رکیت فارم ان کے کفن اور بدن کے درمیان رکھ دیا۔ میان عاشق و معشوق رمزیت جمعیت کے کارکنان سے آخری گزارش یہ کروں گا کہ بعض اوقات بڑوں کے فیصلے بالخصوص مولانا شیرانی کا موقف سمجھ میں نہیں آتا۔ اس سلسلے میں تین باتیں عرض کرنا ہیں:

1: جو دوست دعوت و تبلیغ سے پرانے وابستہ ہیں وہ مولانا محمد احمد صاحب بہاولپوری مدظلہ سے ضرور واقف ہوں گے، 1993ء کے آس پاس تقریباً "پانچ سال کا عرصہ راقم پر ایسا گذرا کہ مولانا کا ذاتی بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ ان کا بیان شروع ہوتا اور میں چنڈال سے نکل جاتا تھا۔ میں اس کے بیان کو خود دعوت کے کام کیلئے بھی معزز سمجھتا تھا۔ لیکن خدا کے فضل سے یہ بات ذہن میں مستقیم تھی کہ میرا اس کام سے تعلق، کسی شخصیت کی بنیاد پہ نہیں، دین کے کام میں اصلاً تو خدا ہی کے ساتھ کاروبار ہے۔ ہمیں اس سے کیا کہ پرانے سال کا 2002ء ہونے بزرگوں کے معاملات ٹھیک نہیں، یا نئے زمیندار اور امیر لوگ جو آج تبلیغ میں لگے ان کو عورتی میں شامل کر لیا گیا یا جماعت میں ایک عالم دین کے ہوتے ہوئے بھی ان پڑھ کو امیر بنادیا گیا۔ میرے دوستو، جمعیت علماء کے ساتھ آپ کا تعلق مولانا شیرانی یا کسی اور شخصیت کی بنیاد پہ نہیں۔ راقم کو جب بار بار رائے و نڈ مرکز سے جماعتوں کا ذمہ دار بنایا گیا تو خود بخود مولانا احمد کا بیان بھی سمجھ میں آ گیا۔ آپ کو بھی جمعیت میں ذمہ داری سے واسطہ پڑے گا تو کئی باتیں سمجھ آ جائیں گی۔

2: عرض یہ کرنا ہے کہ دین کے کسی کام میں بھی اگر میں نام و نمود، عہدہ یا دنیاوی مفاد کیلئے شامل ہوں تو یقین رکھیں، نہ صرف اپنا وقت ایک سراب کے تعاقب میں برباد کر رہا ہوں بلکہ آخرت بھی برباد کر رہا ہوں تبلیغ میں نیا نیا لگا تھا تو ایک بزرگ نے نصیحت کی تھی کہ خدا سے قریب ہونا چاہتے ہو تو بزرگوں سے دور رہو اور کام میں لگے رہو۔ یہی بات ہر دینی تحریک کے لئے ہے۔ لیڈروں سے دور رہو اور کام پہ توجہ دو۔ ان شاء اللہ اس کی ابدی قیمت لگے گی۔



3: تبلیغ اور جمعیت کے طرز میں ایک بڑا فرق ہے۔ تبلیغ میں اپنے اندر کا نظام بدلنا ہے تو بزرگوں کے طے شدہ مشورے پر تنہائی میں بھی تنقید نہیں کرنی۔ یہاں باہر کا نظام بدلنا ہے تو جمعیت کے فیصلوں سے ہانگ دہل اختلاف کریں، چاہے مولانا فضل الرحمن کے گھر پہ دھرنادے آئیں۔ مگر کیفیت اس صحابی والی ہو جس نے حضرت عمر فاروق کو خالد بن ولید سمجھ کر کہا تھا کہ عمر نے خالد کی معزوری کا فیصلہ غلط کیا ہے اور جب عمر نے آواز بدل کر پوچھا کہ پھر کیا کرنا چاہئے؟ تو اس نے کہا: "کریں گے تو وہی جو امیر کہے گا"۔  
پس شخصیات آتی جاتی رہیں مگر دین کا کام تا قیامت جاری رہے گا: ہزار شیخ بکشتہ و انجمن باقیست دعا کرنی چاہئے کہ خدا ہم کو احقاق حق کیلئے قبول فرمائے۔

اے اللہ! آپ دلوں کے حال بہتر جانتے ہیں اور یہ کہ رحمت حق بہانہ می جوید، بہانہ می جوید۔ پس اس کتاب کو دینی خدمت کے طور پر قبول فرما کر راقم اور اس کے اسلاف و اخلاف کی مغفرت کا ذریعہ بنا دے۔  
شاہان چہ عجب گر بنوا زندگدارا

Rights of e-Publications reserved  
by  
Team OFFICIALJAMIAT

📞📧📱 / Official Jamiat

📞 / JUIAnswerBack



خلقت شہر یونہی خوش ہے تو پھر یونہی سہی  
ان کو پتھر دے، مجھے ظرفِ پذیرائی دے



# میر تقی میر

شخصیت و سیاست

سید حبیب

فاطمہ پبلشرز ڈیرہ اسماعیل خان





نکرائے ہیں ( بلکہ صرف وہی نکرائے ہیں )

مصنف سمجھتا ہے کہ ملک دیوبند کی سیاسی جدوجہد کی اساس اس مجبور انسانیت کو پر امن طور پر معاشی افزودگی عطاء کرنا ہے جو جابر، بالادست طبقات کے ہاتھوں پسپی ہوئی ہے اور اسی کا زکی خاطر وہ ہر زمانے کے سامراج سے

بالادست طبقات کے زیر اثر میڈیانہ صرف علمائے دیوبند کی خدمات کو سامنے نہیں آنے دیا کرتا بلکہ ان کی کردار کشی میں ہراول دستے کا کردار ادا کرتا رہتا ہے۔ علماء دیوبند کی اسی کردار کشی کو ہدف بنا کر جمعیت علماء اسلام کے موجودہ امیر مولانا فضل الرحمن کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا ہے۔

چاہئے تھا کہ قوم میں شخصیات کی بجائے نظریات پہ بحث ہوا کرتی، سیاسی منشور اور اہداف پہ بات ہو کر کرتی۔ لیکن پاکستانی جمہوریت چونکہ ابھی پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہی ہے اور سیاسی جماعتیں اپنے لیڈروں کے شخصی کردار سے مستغنی نہیں ہو سکتیں، پس فی الوقت جمعیت علماء اسلام بھی گویا مولانا فضل الرحمن کا نام ہے۔

مولانا کی کردار کشی جمعیت علماء کی کردار کشی ہے اور مولانا کا دفاع جمعیت علماء کا دفاع ہے۔

مصنف سمجھتا ہے کہ جمعیت علماء اسلام مولانا فضل الرحمن کی ذاتی سیاسی جماعت نہیں ہے، بلکہ علمائے دیوبند کا صد سالہ سیاسی ورثہ ہے، جس سے جمیع علمائے دیوبند کی عزت وابستہ ہے۔ پس مولانا کی کردار کشی مہم کی آخری منزل جمیع علمائے دیوبند کو کرپٹ ثابت کرنا اور پھر اس کی آڑ میں دین اسلام کی اصل اور اساس پہ حملہ کرنا ہے۔

بایں وجہ مصنف، مولانا فضل الرحمن کا دفاع کرنا، ان کی شخصیت کے واسطے نہیں بلکہ جمیع علمائے دیوبند کی عزت کے واسطے ضروری سمجھتا ہے۔

علاوہ ازیں مصنف سمجھتا ہے کہ پاکستان جیسے ملک کیلئے سیکولرزم، یعنی ”جیو اور جینے دو“ کی پالیسی ہی بہترین ہے۔ جمعیت علماء اسلام وہ سیاسی پارٹی ہے جو اپنا موقف پارلیمنٹ کے سامنے رکھ کر دلیل سے بات منوانا چاہتی ہے اور بزور طاقت اپنی بات نہیں منوانا چاہتی۔ پس ایک مانیڈیٹ اپ، مولانا فضل الرحمن کا ہے اور دوسرا، ملا فضل اللہ کا۔ اس کتاب کے لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ مولانا فضل الرحمن کو ڈی گریڈ کر کے، ان کو دیوار سے لگانے کا بالواسطہ مطلب پاکستان کو شدت پسند ذہنیت کے ہاتھوں پر غلام بنانا ہے۔

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

